رموزِ بیخودی

(علامہ اقبال)

مع شرح

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

"ناشر"

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس ۱۷۹۱ گلی کتھانہ سوئیوالان

دہلی ۱۱۰۰۰۶

بار اوّل :- فروری ۱۹۷۵ء

تعداد :- پانچ سو

باہتمام :- اعتقاد حسین صدیقی

طباعت :- کوہ نور پریس دہلی ۶

قیمت :- پندرہ روپے Rs. 15/-

مقدّمہ

مثنوی رموزِ بیخودی جب ۱۹۱۸ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی۔ تو اس کے ساتھ حضرت علامہ نے ایک مختصر سا دیباچہ بھی شامل کر دیا تھا۔ جسے دوسرے ایڈیشن میں حذف کر دیا تھا۔ چونکہ اس میں علامہ نے اس مثنوی کے مقاصد کی تشریح کی ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اسی کو درج کرتا ہوں:۔

"یہ مثنوی، کسی طویل الذیل دیباچہ کی محتاج نہیں ہے، تاہم اس کے مقاصد کی ایک مختصر تشریح ضروری ہے۔ واضح ہو کہ جس طرح حیاتِ افراد میں جلبِ منفعت، دفعِ مضرت، یقینِ عمل اور ذوقِ حقائقِ عالیہ، یہ سب باتیں، احساسِ نفس کے تدریجی نشو و نما، اس کے تسلسل اور اس کے استحکام سے وابستہ ہیں، اسی طرح اقوام و ملل کی زندگی کا راز، اسی احساس، یا بالفاظِ دگر "قومی انا" کی حفاظت، تربیت اور استحکام میں پوشیدہ ہے۔

حیاتِ ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ قوم کے افراد کسی آئینِ مسلم کی

پابندی سے اپنے ذاتی جذبات اور میلانات کے حدود مقرر کریں، تاکہ انفرادی اعمال کا تباین و تناقض مٹ کر تمام قوم کے لئے ایک قلبِ مشترک پیدا ہو جائے۔[1]

افراد کی صورت میں احساسِ نفس کا تسلسل، قوتِ حافظہ پر موقوف ہے، لیکن اقوام کے حق میں اس کا تسلسل اور استحکام، قومی تاریخ کی حفاظت میں مضمر ہے۔ یعنی قومی تاریخ، حیاتِ ملّیہ کے لئے بمنزلۂ قوتِ حافظہ ہے، جو اس کے مختلف مراحل کے احساسات اور اعمال کو مربوط کر کے "قومی خودی" کا زمانی تسلسل قائم اور محفوظ رکھتی ہے۔

علم الحیات اور عمرانیات کے اسی نکتہ کو ملحوظ رکھ کر ہیں سنے ملّتِ اسلامیہ کی ہیئتِ ترکیبی اور اس کے مختلف اجزاء و عناصر پر نظر

---

[1] تباین اور تناقض دونوں منطقی اصطلاحیں ہیں۔ ان کو مثالوں سے بآسانی سمجھ سکتے ہیں:۔

(ا) انسان اور درخت میں تباین کی نسبت اور

(ب) انسان اور لاانسان میں تناقض کی نسبت پائی جاتی ہے۔

اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ حدود کے مقرر ہو جانے سے افراد کے اعمال میں بڑی حد تک یگانگت اور یکسانیت کا رنگ پیدا ہو جائے گا۔ کیونکہ جن افراد کی منزلِ مقصود ایک ہوتی ہے ان میں وحدتِ کردار کا پایا جانا یقینی ہوتا ہے ۱۲۔

ڈالی ہے اور مجھے یقین ہے کہ امتِ مسلمہ کی حیات کا صحیح ادراک اسی نکتۂ نگاہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ البتہ اس ضمن میں ایک ضروری سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایسی مختص الہئیت[1] جماعت کا انحطاط زائل کرنے اور اس کی زندگی کو مستحکم کرنے کے عملی اصول کیا ہیں؟ اس سوال کا مجمل جواب مثنوی کے دونوں حصوں میں آچکا ہے، مگر مفصل جواب کے لئے ناظرین کو انتظار کرنا چاہیے۔ اگر وقت نے مساعدت کی تو اس مثنوی کا تیسرا حصہ[2] اسی سوال کا تفصیلی جواب ہوگا۔"

---

[1] اس لفظ سے علامہ کی مراد یہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے اجتماعی زندگی کے لئے جو دستور العمل عطا فرمایا ہے، اس کی نظیر اقوامِ عالم میں کہیں نہیں مل سکتی۔ مثلاً دنیا کی تمام قوموں نے اپنی قومیت کی بنیاد، "وطن" نسب"، رنگ یا نسل پر رکھی ہے۔ لیکن قرآنِ حکیم نے عقیدۂ توحید کو ملتِ اسلامیہ کی قومیت کی بنیاد قرار دیا ہے اور اسی نکتہ کو علامہ نے یوں بیان کیا ہے:-

اپنی ملت کو قیاس اقوامِ مغرب پر نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
انکی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری (بانگِ درا)

[2] علامہ نے اِس مثنوی کا تیسرا حصہ تو نہیں لکھا لیکن اس سوال کا تفصیلی جواب جاوید نامہ اور ضربِ کلیم میں ہدیۂ ناظرین کر دیا ہے۔ ۱۲

مثنوی کے مباحث پر ایک نظر

اس مثنوی کا مقصد تو علامہ کے ارشادات سے بالکل واضح ہو گیا، چنانچہ اس پر مزید حاشیہ آرائی کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اس کے مباحث پر اجمالی تبصرہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

اس مثنوی کے مباحثِ عالیہ پر مجموعی نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ علامہ نے اس میں اسلام کے دستور العمل کی وضاحت کر دی ہے۔ یعنی اس کے مطالعہ سے ہر شخص اسلام کے بنیادی افکار، اصول اور ارکان سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ اور جو نقش اس کے مطالعہ سے دماغ میں قائم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دینِ اسلام بلا شبہ ایک مخصوص ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا نام ہے، اس لئے وہ دنیا کے کسی نظامِ حیات یا دستور العمل سے کسی قسم کی مفاہمت نہیں کر سکتا۔ اسلامی دستور العمل ایک عضوی کل کا حکم رکھتا ہے یعنی یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص اس کے کسی قانون کی خلاف ورزی کر کے ملتِ اسلامیہ میں شامل رہ سکے۔ اس دستور العمل کے اصول اس طرح، باہم مربوط ہیں کہ اگر ایک اصل کو اس کی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا جس طرح مشین کا ایک پرزہ اگر اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو پوری مشین بیکار ہو جائے گی۔ مثلاً

(۱) اگر آپ ختم نبوت کے عقیدہ سے دستبردار ہو جائیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ کہ میں آخری کتاب ہوں باطل ہو جائے گا۔

(۲) اگر آپ مساوات کے عقیدہ کا انکار کر دیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ نے اسود اور احمر، سرمایہ دار اور مزدور کے امتیاز کو اسلامی نظام میں داخل کر دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ" کی تعلیم باطل ہو جائے گی۔

(۳) اگر آپ سود کو جائز کر دیں تو قرآن کا تمام معاشی نظام زیر و زبر ہو جائے گا۔

(۴) اگر آپ ملوکیت کو تسلیم کر لیں، تو توحید الٰہی کا عقیدہ باطل ہو جائے گا۔

(۵) اگر آپ یہ تسلیم کر لیں کہ صداقت، قرآنِ حکیم سے باہر بھی پائی جاتی ہے یا پائی جا سکتی ہے تو تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا فریضہ ساقط ہو جائے گا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کی حیات کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

(۶) اگر آپ سیاست کو دین سے جدا کر دیں تو دین کی حیثیت سے اسلام بالکل ختم ہو جائے گا، محض پوجا پاٹ کا نام رہ جائے گا۔

(۷) اگر آپ زندگی کے کسی ایک شعبہ میں بھی دنیا کے کسی آدمی کو اپنا رہنما تسلیم کر لیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ ہونے کا عقیدہ باطل ہو جائے گا۔

میرا خیال ہے کہ ان چند مثالوں سے میرا مطلب ناظرین پر بخوبی واضح ہو گیا ہوگا کہ اسلام ایک کامل اور مکمل ضابطۂ حیات ہے اور اس کا یہ دعویٰ ہے کہ میرے علاوہ تمام نظام باطل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں یہ اعلان فرما دیا ہے :-

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (۹ : ۳۳)

وہ اللہ ہی تو ہے جس نے بھیجا اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ تاکہ وہ اس کو تمام ادیانِ عالم پر غالب کر دے، اگرچہ یہ فعل مشرکوں کو تو ضرور ناگوار گذرے گا۔

اِس آیت سے، جو اپنے مفہوم کی وضاحت کے لئے کسی تفسیر کی محتاج نہیں ہے، یہ بات بالکل روشن ہے کہ دینِ اسلام ساری دنیا کے خلاف چیلنج یا الٹی میٹم ہے۔ اس لئے ہر مسلمان کا فرضِ منصبی یہ ہے کہ وہ اس دین (دستور العمل) کو دنیا کے تمام ادیان پر غالب کرے اور چونکہ یہ کام صرف اسی صورت سے وقوع پذیر ہو سکتا ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان مل کر اظہارِ دین کے لئے جدوجہد کریں۔ اس لئے ہر مسلمان کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اجتماعی زندگی بسر کرنا سیکھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ فاروقِ اعظمؓ نے مسلمانوں کو یہ نصیحت فرمائی کہ "لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَۃِ" یعنی جماعت سے علیحدہ رہ کر کوئی شخص مسلمان نہیں رہ سکتا۔

فاروقِ اعظمؓ اور اقبال دونوں کی یہ تعلیم قرآنِ حکیم کی اِس آیت سے مقتبس ہے:-

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

اے مسلمانو! سب مل کر اللہ کی رسی (قرآنِ حکیم) کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو۔ اور اپنے آپ کو مختلف فرقوں میں تقسیم مت کرو۔

اس میں نکتہ یہ ہے کہ جب تک سارے مسلمان قرآنِ حکیم پر جمع نہیں ہوں گے وہ اس کی نشر و اشاعت کے لئے کوئی متحدہ کوشش نہیں کر سکتے اور جب متحدہ کوشش نہیں ہوگی تو قرآنِ حکیم، ادیانِ عالم پر غالب کیسے آسکتا ہے؟ چونکہ آج

ہم مسلمان مختلف فرقوں میں منقسم ہو چکے ہیں ، اس لئے قرآنِ حکیم کو دنیا میں شائع کرنے کے لئے نہ کوئی جماعت کوشش کر رہی ہے ، نہ کوئی حکومت ، نہ کوئی مملکت ۔ کیا یہ انتہائی افسوس کا مقام نہیں ہے کہ سعودی حکومت نے بھی قرآنِ حکیم کی تبلیغ و اشاعت کے لئے ابھی تک کوئی کوشش نہیں کی ۔

ع چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی!

خلاصہ کلام یہ ہے کہ رموزِ بیخودی میں اقبال نے قرآنِ حکیم کی اس آیت شریفہ کی تفسیر کی ہے کہ

(۱) اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے ۔

(۲) آپ کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ آپؐ (اور آپ کے متبعین) اس دین (دستور العمل) کو تمام ادیانِ عالم پر غالب کر دیں ۔ یعنی تمام باطل ادیان کو دنیا سے مٹا دیں ۔ تاکہ ساری دنیا دینِ حقہ (اسلام) کی پیرو (مطیع) بن جائے اور ساری دنیا میں ایک ہی دستور العمل نافذ ہو جائے جس کا نام اسلام ہے ، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ :۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ

یعنی اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں صرف اسلام ہی سچا دین (دستورِ حیات) ہے ۔

اس لئے اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے یہ چاہتا ہے کہ وہ اس کے پسندیدہ دین (دستور العمل) کو دنیا میں نافذ کر دیں ۔

(۲) یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب دوسرے ادیان مٹ جائیں ۔

(ب) اور یہ اسی صورت سے ممکن ہے کہ سارے مسلمان مل کر دین اسلام کے غلبہ کے لئے جدوجہد کریں۔

(ج) اور متحدہ کوشش اسی وقت ہو سکتی ہے جب سارے مسلمان قرآنِ حکیم کو مضبوطی کے ساتھ تھام لیں۔ یعنی قرآنِ حکیم پر جمع ہو جائیں۔

اس تصریح کے بعد اب ہم مثنوی کے مطالب کا خلاصہ بیان کرتے ہیں:۔

علامہ نے اس مثنوی کو کسی شخص سے منسوب کرنے کے بجائے ملتِ اسلامیہ کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ موجودہ صدی میں کسی مسلمان نے اس سے بہتر ہدیہ اپنی قوم کی خدمت میں پیش نہیں کیا۔

تمہید میں علامہ مرحوم نے فرد و ملت کے ربطِ باہمی کو واضح کیا ہے۔

تمہید کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ پہلے باب میں انہوں نے یہ بیان کیا ہے کہ ملت (قوم) افراد کے اختلاط سے پیدا ہوتی ہے۔

دوسرے باب میں انہوں نے ملتِ اسلامیہ کے بنیادی ارکان میں سے پہلے رکن "توحید" کا بیان کیا ہے۔

تیسرے باب میں یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ عقیدۂ توحید، یاس و حزن و خوف اور دوسرے روحانی امراض کا ازالہ کر سکتا ہے۔ اور اس نکتہ کو تیر و شمشیر اور حضرتِ عالمگیرؒ کی حکایت سے واضح کیا ہے۔

چوتھے باب میں اسلام کے دوسرے بنیادی رکن "رسالت" کی توضیح کی ہے۔

پانچویں باب میں یہ بتایا ہے کہ رسالتِ محمدیہؐ کی غایت یہ ہے کہ بنی آدم

کو حریت، اخوت اور مساوات (اصولِ سہ گانہ) کی دولت نصیب ہو جائے۔ اور ان اصولِ سہ گانہ کا مفہوم تین تاریخی حکایات کی روشنی میں واضح کیا ہے۔

چھٹے باب میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ ملتِ محمدیہ چونکہ توحید اور رسالت پر مبنی ہے۔ اس لئے کسی خاص ملک سے وابستہ نہیں ہے۔ اس نکتہ کو انہوں نے جداگانہ باب میں واضح کیا ہے۔ یعنی مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد وطن نہیں ہے بلکہ توحید ہے۔

ساتویں باب میں اس نکتہ کی وضاحت کی ہے کہ جس طرح امتِ محمدیہ مختص بالمکان نہیں ہے۔ اسی طرح مختص بالزمان بھی نہیں ہے۔ یعنی یہ ملتِ شریفہ قیامت تک باقی رہے گی۔

آٹھویں باب میں یہ بیان کیا ہے کہ قانون کے بغیر کسی قوم کا نظام صورت پذیر نہیں ہو سکتا، اور ملتِ محمدیہ کا قانون (ضابطۂ حیات) قرآن ہے۔

نویں باب میں یہ بتایا ہے کہ جب قوم کے اندر ذہنی اور عقلی اعتبار سے انحطاط رونما ہو جائے تو اجتہاد کے بجائے تقلید زیادہ مناسبِ حال ہوتی ہے۔

دسویں باب میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ قومی سیرت کی پختگی صرف شریعتِ الٰہیہ کی پابندی سے ہو سکتی ہے۔

گیارہویں باب میں اس راز کو فاش کیا ہے کہ قومی سیرت میں دلکشی محض اتباعِ رسول ؐ سے پیدا ہو سکتی ہے۔

بارہویں باب میں یہ بات بیان کی ہے کہ قومی زندگی بسر کرنے کے لئے

ایک مرکز محسوس کرنے کی ضرورت ہے اور وہ مرکز بیت الحرام ہے۔

تیرہواں باب اس ساری کتاب کی جان ہے اور اس میں اقبالؔ نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ حقیقی جمعیت اس وقت پیدا ہو سکتی ہے کہ قوم کا ہر فرد ملی نصب العین کے حصول میں منہمک ہو جائے اور اُمتِ محمدیہ کا نصب العین توحید الٰہی کی حفاظت اور اشاعت ہے۔

چودھویں باب میں یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ اگر کوئی قوم، نظامِ عالم کی قوتوں کو مسخر کر لے تو اُس کی قومی زندگی میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

پندرھویں باب میں اس نکتہ کی صراحت کی ہے کہ حیاتِ ملی کا کمال یہ ہے کہ فرد کی طرح ملت میں بھی خودی کا احساس پیدا ہو جائے اور یہ احساس، ملی روایات کی حفاظت اور ان پر عامل ہونے سے پیدا ہو سکتا ہے۔

سولھویں باب میں یہ بات بیان کی ہے کہ نوعِ انسانی کی بقا عورت کی ماں ہونے کی حیثیت پر موقوف ہے۔ لہٰذا عورتوں اور خاص طور سے ماؤں کا احترام اسلام کی بنیاد ہے۔

سترھویں باب میں انھوں نے یہ بتایا ہے کہ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراؓ مسلمان عورتوں کے لیے بہترین نمونہ ہیں۔

اٹھارویں باب میں اقبالؔ نے مسلمان عورتوں سے خطاب کیا ہے۔ اور ان کو اسوۂ بتولؓ پر عامل ہونے کی تلقین کی ہے۔

اس کے بعد انھوں نے مثنوی کے مطالب کو سورۂ اخلاص کی تفسیر کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس باب میں انھوں نے

بہت ندرتِ فکر کا ثبوت دیا ہے۔ یعنی آیتوں کا مطلب بیان کرنے کے بعد مسلمانوں کو تلقین کی ہے کہ یہی رنگ اپنے اندر پیدا کرو۔

آخر میں انہوں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہلے اپنا حالِ دل بیان کیا ہے۔ اس کے بعد یہ درخواست کی ہے:۔

ہست شانِ رحمتت گیتی نواز
آرزو دارم کہ میرم در حجاز

تبصرہ

رموزِ بیخودی میں علامہ اقبالؔ نے دنیا کو اس دستورِ حیات کے بنیادی اصول سے آگاہ کیا ہے جسے قرآنِ کریم نے دینِ اسلام سے تعبیر کیا ہے۔ یہ دین بلا شبہ ادیانِ عالم میں عدیم المثال اور فقید النظیر ہے، لیکن اس دین کے پیرو بارہ سو سال سے اس کے پیش کردہ آئین سے کلی منحرف ہو چکے ہیں اور گذشتہ تین چار سو سال سے تو یہ حالت ہے کہ اسلام وہ اسم ہے۔ جس کا مسمّیٰ خارج میں کہیں موجود نہیں ہے[1]۔ اس لئے اس کی بنیادی خصوصیات ایک ایک کر کے پردہ

---

[1] حضرتِ اقدس مجدد الفِ ثانیؒ المتوفی سنہ ۱۰۳۴ھ نے اپنے مکتوبات میں کئی جگہ اس تلخ حقیقت کا اظہار فرمایا ہے کہ "اکنوں از اسلام بجز اسمے ہیچ تشے باقی نماندہ است" بقیہ صفحہ ۱۳ پر:۔

خفا میں مستور ہوچکی ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی آئین کی خوبی صرف اِس آئین پر عمل کرنے ہی کی بدولت اہل عالم پہ آشکارا ہوسکتی ہے۔

دراصل دینِ اسلام جملہ ادیان و مذاہبِ عالم اور انسانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کے تمام ضابطوں کے خلاف ایک زبردست چیلنج ہے، یعنی دعوتِ مبارزت ہے۔

چنانچہ قرآنِ حکیم کی آیت میرے دعویٰ پر شاہد ہے:۔

وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا

اور آپ اعلان کر دیجئے کہ "الحق" آگیا (اس کے آنے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ باطل مٹ جائے گا۔ یالفاظِ دگر باطل کا مٹ جانا یقینی ہے۔ اس لئے قرآنِ حکیم نے ماضی کا صیغہ استعمال فرمایا) اور مٹ گیا۔ "الباطل" بلاشک باطل کی ذات میں یہ بات داخل ہے کہ وہ مٹ جانے والا ہے۔ یعنی حق کے مقابلہ میں اُسے کبھی ثبات و دوام حاصل نہیں ہوسکتا۔ یہ تو اس کے اقتضائے ذات

بقیہ صفحہ ۱۳ سے:۔ نیز حضرت مجدد دہلویؒ المتوفی ۱۱۷۶ھ نے ایک جگہ بایں الفاظ اپنے تاثرات بیان فرمائے ہیں کہ "مسلماناں در گور، مسلمانی در کتاب"

واضح ہو کہ ہندوستان میں دینِ اسلام سے مسلمانوں کی برگشتگی کا سب سے بڑا سبب اکبر مرتد کا پیدا کردہ وہ فتنہ تھا جسے تاریخ میں "دینِ الٰہی" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ جبھی تو اقبالؔ نے یہ لکھا ہے:۔

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

کے خلاف ہے۔ میں نے یہ مفہوم عارف علوم ربانی دانائے حقائق قرآنی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مجدد دہلویؒ کے ترجمہ سے اخذ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

" و بگو بیامد دینِ حق و نابود شد دینِ باطل۔ ہر آئینہ باطل است نابود شوندہ "

حضرت شاہ صاحبؒ نے الحق کا ترجمہ دینِ حق کیا ہے اور دینِ حق صرف قرآنِ حکیم کے اندر محصور ہے۔ اس کے باہر کہیں دینِ حق نہیں ہے۔ اور الباطل کا ترجمہ دینِ باطل کیا ہے۔ یعنی دنیا کے تمام ادیانِ باطلہ۔

الحق کا مطلب یہ ہے کہ صرف قرآن ہی حق ہے، اس کے علاوہ جو کچھ ہے سب باطل ہے[1]۔

اس آیت شریفہ سے ثابت ہو گیا کہ اسلام کا دعویٰ یہ ہے کہ صداقت، ہدایت اور حق قرآنِ حکیم کے علاوہ اور کسی کتاب میں موجود نہیں ہے۔ بالفاظ دگر دینِ اسلام کے علاوہ اور تمام ادیان و مذاہب عالم باطل ہیں۔ اور یہی مطلب ہے قرآنِ حکیم کی ان آیتوں کا۔

---

[1] افسوس کہ اغیار کو خوش کرنے کے لئے صاحبِ ترجمان القرآن نے قرآنِ عزیز کی اس بنیادی تعلیم کو مداہنت کے غلاف میں پوشیدہ کر دیا۔ اور حق و باطل کو مخلوط کر کے ایک ایسے اسلام کی ترجمانی کی ہے جسے نہ کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کے سامنے پیش کر سکتا ہے اور نہ کوئی غیر مسلم اُسے قبول کرنے کی طرف راغب ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جب عالمگیر صداقتیں تمام مذاہب میں موجود ہیں۔ تو کسی کو کیا پڑی ہے کہ اپنا مذہب چھوڑ کر بدیشی مذہب اختیار کرے؟۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (۳ : ۱۹)

بلا شبہ خدا کے نزدیک دینِ معتبر صرف اسلام ہی ہے۔

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ؀ (۳ : ۸۵)

اور جو شخص اسلام کے علاوہ اور دین کی طلب کرے گا۔ وہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ اُس سے اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔

ان آیتوں سے ثابت ہوا کہ اسلام کے علاوہ اور کوئی دین اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ عالیہ میں مقبول نہیں ہو سکتا۔ اور چونکہ دین اسلام اس وقت قرآنِ عزیز کے علاوہ اور کسی کتاب میں محفوظ نہیں ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کتابِ مقدس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے:۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵ : ۹)

بیشک ہم ہی نے قرآن کو نازل کیا ہے اور بلا شبہ ہم ہی اِس کے محافظ ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ دینِ اسلام صاف اور صریح لفظوں میں یہ اعلان کرتا ہے کہ صداقت اور ہدایت اس وقت قرآن کے علاوہ اور کہیں موجود نہیں ہے۔ کسی مذہب میں نہیں ہے۔ کسی نظامِ اخلاق میں نہیں ہے۔ اور کسی ہیئتِ اجتماعیہ میں نہیں ہے۔ اب ناظرین خود فیصلہ کر لیں۔ کہ کیا دوسرے لفظوں میں یہ دُنیا کو چیلنج نہیں ہے ؟۔

دینِ اسلام کی تمام خصوصیات کی تفصیل تو اس تمہید میں ناممکن ہے اس لئے صرف ایک خصوصیت کے بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ دنیا میں جس قدر

مذاہب ہیں وہ سب انسان کی اخروی نجات کا بندوبست کرنے کے متمنی ہیں۔ دنیاوی زندگی کے لئے کوئی ضابطہ یا دستور العمل پیش نہیں کرتے۔ لیکن دینِ اسلام مکمل ایک دستورِ حیات ہے یعنی وہ ایک اخلاقی نصب العین بھی ہے اور ایک نظامِ سیاست و معاشرت بھی ہے چنانچہ فرد اور جماعت کی زندگی کا کوئی شعبہ اس کی گرفت سے آزاد نہیں ہے اور جہاں تک بنیادی اصول کا تعلق ہے، اسلام کسی نظام سے مفاہمت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تمام مذہبوں اور اخلاقی نظاموں کو مٹا کر اپنا قانون نافذ کرنا چاہتا ہے۔ یعنی ایک مسلمان زندگی کے کسی شعبہ میں بھی کسی دوسرے شخص کی رہنمائی قبول نہیں کر سکتا۔ اس کی وفاداری کا آخری مرجع صرف قرآنِ حکیم اور سنّتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔

چونکہ دینِ اسلام زندگی کا ایک مکمل ضابطہ ہے اس لئے وہ یہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا کے انسان ایک مسلک میں منسلک ہو جائیں اس مقصد کے لئے اس نے ایسا حیرت انگیز ضابطہ نافذ کیا ہے کہ دنیا کے کسی قدیم یا جدید مذہب یا نظامِ فکر میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ یعنی اس نے ساری دنیا کے انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

(۲) جو لوگ سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی اختیار کر لیں وہ ملّتِ اسلامیہ میں شامل ہیں۔ خواہ وہ کالے ہوں یا گورے، اور چینی ہوں یا جاپانی۔

(ب) جو لوگ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی سے انکار کر دیں وہ سب ملّتِ کفر کے افراد قرار دیئے جائیں گے۔ اَلْکُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ یعنی دینِ اسلام

کی رُو سے مسلمانانِ عالم کی بنیاد، نہ وطن ہے نہ رنگ نہ نسب ہے نہ زبان بلکہ عقیدۂ توحید ہے۔ چونکہ یہ تعلیم دینِ اسلام کو تمام مذاہبِ عالم سے متمیّز کردیتی ہے۔ اور نظریۂ قومیت و وطنیت اسلام کے بنیادی اصول کی بیخ کنی کردیتا ہے۔ اِس لئے علّامہ اقبالؔ نے ۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک یعنی ساری عمر اس غیر اسلامی نظریہ کے خلاف جہاد کیا۔ چنانچہ ارمغان میں لکھتے ہیں:۔

ازدم آموختم اسرارِ جاں من | چو رومی در حرم دادم اذاں من
بدورِ فتنۂ عصرِ رواں من | بدورِ فتنۂ عصرِ کہن او

رموزِ بیخودی کا خلاصہ یہ ہے کہ دینِ اسلام، دیگر مذاہب کی طرح محض پُوجاپاٹ کا نام نہیں ہے، یا فردِ کا پرائیویٹ معاملہ نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا نام ہے۔ اِس لئے کوئی مسلمان ملّت سے جُدا ہوکر اسلامی زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ اور جب یہ ممکن نہیں تو وہ اپنی خودی کو بھی مرتبۂ کمال تک نہیں پہنچا سکتا۔

اب میں خود علّامہ کی تحریروں سے اس نکتہ کو واضح کرتا ہوں، تاکہ ناظرین کے دلوں پر اس کی اہمیت نقش ہوجائے۔

"جس طرح نوعِ انسان کی مجموعی ترقی کے لئے مختلف اقوام کا نیست و نابود ہوجانا ضروری ہے، اسی طرح یہ بھی لازمی ہے کہ کسی قوم کے ارتقا کے لئے کئی افراد ندرِ اجل ہو جائیں یا قوم کے نشوونما کی خاطر ان کے ذاتی حقوق کی پرواہ نہ کی جائے۔ لیکن یہاں ایک عجیب اور مشکل سوال پیدا ہوتا ہے

اور وہ یہ ہے کہ جس صورت میں کسی خاص فرد کو قوم کی آئندہ نسلوں کی بہبودی ان کی عظمت و جلال، ان کی عقلی اور تمدنی ترقی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تو کیوں اس کے ذاتی حقوق پر قومی ارتقار کو ترجیح دی جائے؟ کیا میں آج سے سو سال کے بعد زندہ رہوں گا؟ اگر نہیں تو پھر مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں اپنے آپ کو قوم کے لئے قربان کردوں؟ اور اپنی نیند حرام کرکے قوم کی آئندہ بہبودی کے لئے بے خواب راتیں بسر کردوں؟ اگرچہ اس سوال کا کوئی عقلی جواب ہمارے پاس نہیں ہے لیکن اس خطرناک شبہ کے وقت مذہب ہماری دستگیری کرتا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ ایثار یعنی اوروں کے نفع کو اپنے ذاتی نفع پر مقدم رکھنے کی بنار پر عقلی نہیں ہے۔ بلکہ یہ نیکی جو ارتقار نوعِ انسانی وقومی کے لئے بہت ضروری ہے، ایک فوق العادت اصول پر مبنی ہے۔ آوازِ نبوت کا اصلی زور اور اس کی حقیقی وقعت عقلی دلائل اور براہین پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا دارومدار اس روحانی مشاہدہ پر ہے جو نبی کی غیر معمولی قوتوں کو حاصل ہوتا ہے۔ جس کی بناء پر اس کی آواز میں وہ ربانی سطوت اور جبروت پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کے سامنے انسانی شوکت محض ہیچ ہے۔"

(ماخوذ از رسالہ مخزن بابت اکتوبر ۱۹۰۴ء)

"مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے، کہ قومیت کا اسلامی تصوّر دوسری اقوام کے تصوّر سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصلی اصول نہ اشتراکِ زبان ہے، نہ اشتراکِ وطن اور نہ اشتراکِ

اغراضِ اقتصادی، بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو جنابِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی، اس لئے شریک ہیں کہ مظاہرِ کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے۔ اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں، وہ بھی ہم سب کے لئے یکساں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے۔ اور اس کی قومیت کا دارومدار ایک خاص تنزیہی تصور پر ہے، جس کی تجسیمی شکل وہ جماعتِ اشخاص ہے، جس میں بڑھتے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعاً موجود ہے۔ غرض اسلام زمان و مکان کی قیود سے مبرّا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قومِ عرب نے جس کے بطن سے اسلام پیدا ہوا اس کی پولیٹکل نشوونما میں بہت بڑا حصّہ لیا۔ لیکن اسلامی علوم وفنون اور فلسفہ وحکمت کے انمول موتیوں کے رولنے کا کام زیادہ تر غیر عرب اقوام ہی نے سرانجام دیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اسلام کا ظہور قومِ عرب کی زندگی کی تاریخ میں یزداں طلبی کی آنی وعارضی جھلک ہونے کے لحاظ سے گویا برق کی چشمک تھی یا شرار کا تبسم تھا لیکن اسلام کی دماغی توانائیوں کی جولانگاہ عرب نہ تھا بلکہ عجم تھا۔ پس چونکہ اسلام کا جوہرِ ذاتی بلا کسی آمیزش کے خاص طور پر ذہنی یا تخیلی ہے۔ لہذا کیونکر ممکن تھا کہ وہ قومیت کو کسی خارجی یا حسّی اصول مثلاً وطن پر مبنی قرار دینا جائز تصور کرے؟"

(ماخوذ از ملّتِ بیضا پر عمرانی نظر)

" اسلام کی حقیقت ہمارے لئے یہی نہیں کہ وہ ایک مذہب ہے۔

بلکہ اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ اسلام میں قومیت کا مفہوم خصوصیت کے ساتھ چھپا ہوا ہے اور ہماری قومی زندگی کا تصور اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آسکتا جب تک ہم اصولِ اسلام سے پوری طرح باخبر نہ ہوں۔ بالفاظِ دیگر اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی وطن ہے، جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو نسبت انگلستان کو انگریزوں اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے، وہی نسبت اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے۔ جہاں اسلامی اصول یا ہماری مقدس روایات کی اصطلاح میں "خدا کی رسی" ہمارے ہاتھ سے چھوٹی اور ہماری جماعت کا شیرازہ بکھرا۔"

ہم نے اپنی تعلیمی جدوجہد میں اس حقیقت پر نظر نہیں ڈالی کہ اغیار کے تمدن کو بلا مشارکتِ احدے اپنا ہر وقت کا رفیق بنائے رکھنا گویا اپنے تئیں اس تمدن کا حلقہ بگوش بنا لینا ہے۔ اور یہ وہ حلقہ بگوشی ہے جس کے نتائج کسی دوسرے مذہب کے دائرے میں داخل ہونے سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ کسی اسلامی مصنف نے اس حقیقت کو مولانا اکبر الہ آبادی سے زیادہ واضح طور پر نہیں بیان کیا۔ چنانچہ وہ نئی نسل کے مسلمانوں کی عقلی زندگی پر ایک نظرِ غائر ڈالنے کے بعد حسرت آفریں لہجے میں پکار اٹھتے ہیں:۔

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

شیخ مرحوم کنایہ ہے ٹھیٹھ اسلامی تہذیب کے حریت پسند نقاد اور نام لیوا سے جو مغربی تہذیب و تعلیم کے بارے میں سر سید احمد خاں مرحوم کے ساتھ

مدت العمر پڑا جھگڑا کیا۔ آج ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بیچارے شیخ کا خوف بے بنیاد نہ تھا۔ کیا اب بھی کسی کو اس میں کلام ہے کہ "شیخ مرحوم" کے قول میں جو صداقت مضمر ہے، اس پر ہماری تعلیم کا ماحصل زندہ گواہ ہے۔ مجھے رہ رہ کر یہ رنجدہ تجربہ ہوا ہے کہ مسلمان طالب العلم جو اپنی قوم کے عمرانی، اخلاقی اور سیاسی تصوّرات سے نابلد ہے۔ روحانی طور پر بمنزلہ ایک بے جان لاش کے ہے۔ اور اگر موجودہ صورتِ حالات اور بیس سال تک[1] قائم رہی تو وہ اسلامی رُوح جو قدیم اسلامی تہذیب کے چند علم برداروں کے فرسودہ قالب میں ابھی تک زندہ ہے۔ ہماری جماعت کے جسم سے بالکل نکل جائے گی۔ وہ لوگ جنہوں نے تعلیم کا یہ اصل اصول قائم کیا تھا کہ ہر مسلمان بچّہ کی تعلیم کا آغاز کلام مجید کی تعلیم سے ہونا چاہیئے۔ ہمارے مقابلہ میں، ہماری قوم کی ماہیّت اور نوعیت سے بہت زیادہ باخبر تھے۔

---

[1] علامہ مرحوم نے یہ اندیشہ ۱۹۱۲ء میں ظاہر کیا تھا، اور وہ صورتِ حالات چالیس سال سے بعینہٖ قائم ہے، لہٰذا ناظرین خود فیصلہ کرلیں کہ اس وقت ۱۹۵۲ء میں وہ "اسلامی رُوح" جس کی بقاء کے لئے مرحوم نے ساری عمر جدّ و جہد کی، "ہماری جماعت" میں کس حد تک باقی رہ گئی ہوگی۔ میرے خیال میں اسی صورتِ حالات کو دیکھ کر اکبر الہ آبادی نے یہ شعر لکھا تھا۔

دین سے ملّت سے یا اللہ سے الفت ہوتی کیوں
دُودھ تھا ڈبہ کا اور تعلیم تھی سرکار کی

خودی اور بیخودی میں نسبت باہمی

بعض لوگ قلّتِ تدبر کی بناء پر یہ سمجھتے ہیں کہ خودی اور بیخودی میں تباین یا تضاد کی نسبت ہے۔ اس غلطی کا مبنیٰ یہ ہے کہ فارسی زبان میں لفظ "بے" سے نفی مراد ہوتی ہے۔ مثلاً ہوشیار سے ہوش کی نفی کرنے کے لئے بے ہوش اور زر دار سے زر کی نفی کے لیے بے زر کی ترکیب مستعمل ہے۔ لیکن یہاں بیخودی سے خودی کی نفی مراد نہیں ہے۔ اس لئے ان لفظوں میں تباین یا تضاد کی نسبت نہیں ہے۔ یعنی بے خودی، خودی کی ضد نہیں ہے۔ بلکہ ان دو لفظوں میں عدم وملکہ کی نسبت ہے، جس کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) دو چیزوں میں جو نسبتیں قائم کی جاتی ہیں وہ دو اعتبار سے کی جاتی ہیں۔

(۲) یا تو صدق وحمل کے اعتبار مثلاً نسبتِ تباین یا تساوی یا عموم وخصوص۔

(ب) یا وجود کے اعتبار سے مثلاً تضاد یا تضایف یا عدم وملکہ۔

نوٹ:- جن چیزوں میں تساوی یا عموم وخصوص کی نسبت ہوتی ہے۔ ان میں تضاد یا تضایف کی نسبت قائم نہیں ہو سکتی، بلکہ اُن میں اتحاد کلی یا اتحاد جزئی کی نسبت ہوتی ہے۔

(۲) جب دو مفہوم ایسے ہوں کہ اُن دونوں کا ایک ہی حیثیت سے ایک زمانہ میں اور ایک محل میں اجتماع نہ ہو سکے، اور ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کے عمل پر مشتمل ہو، لفظاً یا معناً، تو ان میں ایجاب وسلب یا عدم وملکہ

کی نسبت ہی متصوّر ہو سکتی ہے۔

جو ذات اس عدمی وصف کے ساتھ موصوف ہو اگر اس میں وصفِ وجودی کے ساتھ موصوف ہونے کی صلاحیت ہے تو عدم و ملکہ کی نسبت ہے۔ اور اگر یہ صلاحیت نہ ہو تو ایجاب و سلب کی نسبت ہے۔

(۳) خودی ایک مفہوم وجودی ہے اور بیخودی اسی خودی کے عدم پر مشتمل ہے، اور جو ذات، بیخودی کے وصف کے ساتھ موصوف مانی جائے وہ وہی ہو سکتی ہے جس میں خودی کے ساتھ متصف ہونے کی صلاحیت موجود ہو۔ کیونکہ جو خودی کا موصوف نہیں بن سکتا، اس کو ہم بے خود بھی نہیں کہہ سکتے۔

(۴) اس سے ظاہر ہوا کہ خودی اور بیخودی میں عدم و ملکہ کا تقابل پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ وہ ذات جو خودی کے ساتھ موصوف ہو۔ وہ کسی دوسری حیثیت سے بیخودی کا محل بن جائے۔ اسی طرح وہ ذات جو کسی اعتبار سے بیخودی کے ساتھ متصف ہے وہ دوسرے اعتبار سے محلِ خودی ہو جائے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حالات و ازمنہ کے تغیّر سے ایک ہی محل میں خودی اور بیخودی دونوں کیفیتیں یکے بادیگرے متوارد ہوتی رہیں، کیونکہ متقابلین کے لئے دو جہتوں سے مجتمع ہو جانا یا مختلف حالات و ازمنہ میں انکا متوارد ہو جانا عقلاً ناجائز نہیں ہے مثلاً محبت اور عداوت اگرچہ صفات متقابلہ ہیں۔ لیکن ایک ہی شخص میں ایک ہی وقت میں پائی جاسکتی ہیں۔ مثلاً زید ایک ہی وقت میں رام سے محبت کر سکتا ہے اور شام سے نفرت کر سکتا ہے۔

(۵) اسی طرح خودی اور بیخودی میں یہ دونوں صفات ایک ہی شخص میں ایک ہی

وقت میں پائی جا سکتی ہیں۔ پس ثابت ہو گیا کہ خودی اور بیخودی میں تباین یا تضاد کی نسبت نہیں ہے۔ بلکہ عدم و ملکہ کی نسبت ہے یعنی ایک شخص خودی کی منزل میں رہتے ہوئے بیخودی کی منزل میں بھی آسکتا ہے۔

شرحِ عنوانِ کتاب

علامہ نے مرشد رومیؒ کے اس شعر کو اپنی کتاب کا عنوان بنایا ہے:۔

جہد کُن در بیخودی، خود را بیاب
زُود تر، وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب

اس شعر کے پہلے مصرع میں دو لفظ اقبالؒ کو اپنے مطلب کے نظر آئے۔ اس لئے حسبِ عادت انہوں نے اس کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کا ذریعہ بنا لیا۔ وہ دو لفظ یہ ہیں (۱) جہد (۲) بیخودی۔

مرشد رومیؒ نے یہ شعر ایک شہزادے کی حکایت کے سلسلے میں لکھا ہے جو دفتر چہارم میں مذکور ہے۔

قصہ یہ ہے کہ ایک جادوگرنی ایک شہزادے پر عاشق ہو گئی۔ اور اپنے جادو کے زور سے شاہزادہ کو ایسا مسحور کیا کہ وہ اپنی دُلہن کی طرف سے بالکل غافل ہو گیا۔ اور اُس بدصورت جادوگرنی کے دم کا دیوانہ ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد حسنِ اتفاق سے ایک ساحر کا اُس شہر میں گزر ہوا۔ بادشاہ نے اس سے امداد کی درخواست کی۔ چنانچہ اس نے اُس شہزادہ کو اُس جادوگرنی کے تصرف سے رہائی عطا کی۔

یہ حکایت بیان کرنے کے بعد مولینا کہتے ہیں کہ شہزادہ سے مراد انسان ہے، جو خلیفۃ اللہ اور مسجودِ ملائکہ ہے۔ اور جادوگرنی سے مراد یہ دنیا ہے۔ جس کی محبت میں گرفتار ہو کر انسان اپنے محبوبِ حقیقی سے غافل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد یوں فرماتے ہیں:۔

گر ببینی یک نفس حسنِ ودود　　اندر آتش افگنی جان و وجود
جیفہ بینی بعد ازاں ایں شرب را　　چوں ببینی کرّ و فرِّ قرب را
ہمچو شہزادہ رسی در یارِ خویش　　پس بروں آری ز پا تو خارِ خویش

جہد کن در بیخودی خود را بیاب
زود تر واللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب　　(دفتر چہارم)

مولینا فرماتے ہیں کہ اے مخاطب! اگر تو محبوبِ حقیقی کے جمال کی ایک جھلک دیکھ لے تو تجھ پر دیوانگی کا عالم طاری ہو جائے گا۔

اگر تجھے قربِ خداوندی کی عظمت اور شان و شوکت کا علم حاصل ہو جائے، تو بلاشبہ یہ دنیا اپنی دلفریبیوں کے باوجود تجھے ناپاک اور مُردار نظر آئے گی۔

(اور) تو اس شہزادہ کی طرح اپنے محبوب کو حاصل کر لے گا، اور تیری تمام پریشانیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

پس تو مقام بیخودی حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کر، تاکہ تو اپنا مقصدِ حیات حاصل کر سکے۔ یعنی اپنی خودی سے آگاہ ہو سکے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اس کام میں تاخیر مت کر۔ میں نے اپنے علم کے مطابق تجھے صحیح مشورہ دیا ہے۔

اور حقیقی علم تو اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔

واضح ہو کہ مولینا کے یہاں "بیخودی" سے مقامِ فنا یا وصال مراد ہے۔ یعنی جس طرح لوہا آگ میں پڑ کر اپنی ہستی کو فنا کر دیتا ہے۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں آگ کے خواص پیدا ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح سالک کو لازم ہے کہ اپنی تمام نفسانی خواہشات کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کی آگ میں فنا کر دے۔ تاکہ اس میں ایزدی صفات پیدا ہو جائیں۔

یہ فنا وہ نہیں ہے، جس کی تعلیم غیر مسلم حکما، اور جوگیوں اور بودھ دھرم کے پیرووں نے دی ہے۔ غیر اسلامی تصوف میں فنا، سے فنائے ذات مراد ہے۔ اور جب یہ مقام حاصل ہو جاتا ہے، تو سالک کو ایک نئی زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔ جسے قرآنِ حکیم نے نفسِ مطمئنہ سے تعبیر کیا ہے۔ اور میری رائے میں مسلمان کی زندگی کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ اپنے نفسِ امارہ کو نفسِ مطمئنہ میں تبدیل کر دے۔

جب سالک زندگی کے ہر شعبہ میں نفسِ امارہ کے بجائے اللہ کی مرضی (شریعتِ اسلامیہ) پر عمل کرتا ہے، تو کچھ عرصہ کے بعد بیچارہ نفسِ امارہ خود بخود فنا ہو جاتا ہے۔ بس یہی مقام فنا ہے اور اسی کو مُرشد رُومیؒ نے اپنی اصطلاح میں "بیخودی" سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی اگر تم اپنی جد و جہد سے مقامِ بیخودی حاصل کر لو تو اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جاؤ گے۔ بالفاظِ دگر خدائے تعالیٰ کی معرفت حاصل کر لو گے۔ کیونکہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ ۱۲

اقبالؔ کے یہاں بیخودی سے مقامِ فنا مراد نہیں ہے بلکہ بیخودی سے ان کی

مراد ہے۔ انسان کا انفرادیت کی منزل سے نکل کر اجتماعیت کی منزل میں آنا۔ یعنی اقبالؔ نے اس شعر سے یہ مطلب نکالا ہے کہ جب تک انسان انفرادیت کے دائرہ میں محصور ہے وہ اپنی خودی کی مخفی صلاحیتوں سے آگاہ نہیں ہو سکتا، اور نہ اُن کو نقطۂ کمال تک پہنچا سکتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اقبالؔ کو مثنوی میں اپنے مطلب کا ایک ہیرا ترشا ترشایا ہوا مل گیا۔ اُنھوں نے بڑے اشتیاق کے ساتھ اُسے اُٹھا کر اپنی کُلاہ میں لگا لیا۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس ہیرے سے اُن کی کُلاہ کا گوشہ آفتاب تک پہنچ گیا۔

نوٹ:۔ مرشدِ رومیؒ نے اِس شعر میں لفظِ بیخودی کو جس معنیٰ میں استعمال کیا ہے، وہ معنیٰ اکبر الہ آبادی کے اس شعر سے بخوبی واضح ہو سکتا ہے:۔

این سخن مقبولِ اہلِ دل بود ہر آئینہ
بیخودی در سجدہ جا خواہد، خودی در آئینہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش کش بحضورِ ملّتِ اسلامیہ

منکر نتواں گشت اگر دم زنم از عشق
ایں نشۂ بمن نیست اگر با دگرے ہست
(عرفی)

اے ترا حق خاتمِ اقوام کرد — بر تو ہر آغاز را انجام کرد
اے مثالِ انبیا پاکانِ تو — ہمگرِ دلہا جگر چاکانِ تو
اے نظر بر حسنِ ترسا زادۂ — اے ز راہِ کعبہ دور افتادۂ
اے فلک مشتِ غبارِ کوئے تو — "اے تماشا گاہِ عالم روئے تو"
ہمچو موج آتش تہِ پا میروی — "تو کجا بہرِ تماشا میروی"
رمزِ سوز آموز از پروانۂ — در شرر تعمیر کن کاشانۂ
طرحِ عشق انداز اندر جانِ خویش — تازہ کن با مصطفٰے پیمانِ خویش
خاطرم از صحبتِ ترسا گرفت — تا نقابِ روئے تو بالا گرفت
ہم نوا از جلوۂ اغیار گفت — داستانِ گیسو و رخسار گفت
بر درِ ساقی جبیں فرسود او — قصۂ مغ زادگاں پیمود او
من شہیدِ تیغِ ابروئے تو ام — خاکم و آسودۂ کوئے تو ام
از ستایش گستری بالاترم — پیشِ ہر دیواں فرو ناید سرم

از سخن آئینہ سازم کردہ اند　　وز سکندر بے نیازم کردہ اند
بارِ احساں بر نتابد گردنم　　در گلستاں غنچہ گردد دامنم
سخت کوشم مثلِ خنجر در جہاں　　آبِ خود می گیرم از سنگِ گراں
گرچہ بحرم موجِ من بیتاب نیست　　بر کفِ من کاسۂ گرداب نیست
پردۂ رنگم شمیمے نیستم　　صیدِ ہر موجِ نسیمے نیستم
در شرار آبادِ ہستی اخگرم　　خلعتے بخشد مرا خاکسترم
بر درت جانم نیاز آوردہ است　　ہدیۂ سوز و گداز آوردہ است
ز آسمانِ آبگوں یم می چکد　　بر دلِ گرمم دمادم می چکد
من ز جو باریکتر می سازمش　　تا بہ صحنِ گلشنت اندازمش
زانکہ تو محبوبِ یارِ ماستی　　ہمچو دل اندر کنارِ ماستی
عشق تا طرحِ فغاں در سینہ ریخت　　آتشِ او از دلم آئینہ ریخت
مثلِ گُل از ہم شگافم سینہ را　　پیشِ تو آویزم ایں آئینہ را
تا نگاہِ افگنی بر روئے خویش　　می شوی زنجیریِ گیسوئے خویش

باز خوانم قصۂ پارینہ ات
تازہ سازم داغہائے سینہ ات

از پئے قومِ ز خود نا محرمے　　خواستم از حق حیاتِ محکمے
در سکوتِ نیم شب نالاں بدم　　عالم اندر خواب و من گریاں بدم
جانم از صبر و سکوں محروم بود　　وِردِ من یا حیُّ یا قیُّوم بود
آرزوئے داشتم خوں کردمش　　تا ز راہِ دیدہ بیروں کردمش

سوختن چوں لالہ پیہم تا کجا — از سحر دریوزۂ شبنم تا کجا

اشکِ خود بر خویش میریزم چو شمع — با شبِ یلدا در آویزم چو شمع

جلوہ را افزودم و خود کاستم — دیگراں را محفلے آراستم

یک نفس فرصت ز سوزِ سینہ نیست — ہفتہ ام شرمندۂ آدینہ نیست

جانم اندر پیکرِ فرسودہ — جلوہ آہے است گرد آلودہ

چوں مرا صبحِ ازل حق آفرید — نالہ در ابریشمِ عودم تپید

نالۂ افشاگرِ اسرارِ عشق — خونبہائے حسرتِ گفتارِ عشق

فطرتِ آتش دہد خاشاک را — شوخیِ پروانہ بخشد خاک را

عشق را داغِ مثالِ لالہ بس — در گریبانش گلِ یک نالہ بس

من ہمیں یک گل بدستارت زنم — محشرے بر خوابِ سرشارت زنم

تا ز خاکت لالہ زار آید پدید
از دمت بادِ بہار آید پدید

اقبال نے عرفی کے اس شعر کو اپنی اس پیش کش کا عنوان بنایا ہے۔ عرفی کہتا ہے:-

منکر نتواں گشت اگر دم زنم از عشق
ایں نشہ بمن نیست اگر با دگرے ہست

عرفی کہتا ہے کہ عشق سے انکار کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگر میں واردات عشق بیان کرتا ہوں۔ تو ان کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ عشق ایک عالمگیر جذبہ ہے۔

اگر بفرضِ محال، مجھ میں موجود نہیں ہے تو دوسروں میں تو ہے۔

اقبالؔ کی مراد یہ ہے کہ اگر میں قوم کو مسلکِ عشق اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہوں، تو کسی کو اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہو سکتی، کیونکہ اگر بفرضِ محال مجھ میں یہ جذبہ نہیں ہے، تو دوسروں میں تو ہے۔

اقبالؔ نے اس شعر کو زیبِ عنوان اس لئے بنایا کہ کتاب کی روح اس پیش کش میں پوشیدہ ہے، اور پیش کش کا خلاصہ اس ایک شعر میں مندرج ہے۔ اقبالؔ نے جیسا کہ اس کتاب کے پڑھنے والوں پر آگے چل کر خود واضح ہو جائے گا، قوم کو عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔ چنانچہ اسی صفحہ میں یہ شعر اس بات پر شاہد ہے:۔

طرحِ عشق انداز اندر جانِ خویش
تازہ کُن با مصطفےٰؐ پیمانِ خویش

اور یہ ساری کتاب اسی ایک شعر کی تشریح و توضیح ہے۔

اس پیش کش میں اقبالؔ نے جس قدر اشعار لکھے ہیں، ان میں کم و بیش رمزیہ انداز پایا جاتا ہے۔ جس کی بناء پر ان اشعار میں بلا کی دلکشی اور ادبی لطافت پیدا ہو گئی ہے۔ مثلاً دو تین شعر ذیل میں درج کرتا ہوں:۔

از سخن آئینہ سازم کردہ اند
وز سکندر بے نیازم کردہ اند

سخت کوشم مثلِ خنجر در جہاں
آب خود می گیرم از سنگِ گراں

مثلِ گل از ہم شگافم سینہ را
پیشِ تو آویزم ایں آئینہ را

نالۂ افشاگرِ اسرارِ عشق
خونبہائے حسرتِ گفتارِ عشق

ان اشعار سے اقبالؔ کی قادر الکلامی بھی بخوبی واضح ہو سکتی ہے۔

پیش کش کا تجزیہ:۔ اس نظم میں دو بند ہیں۔ پہلے بند میں ۲۶ اشعار ہیں۔

(۱) پہلے سات شعروں میں قوم سے خطاب کیا ہے۔

(۲) آٹھویں شعر سے گیارہویں شعر تک یہ بات کہی ہے کہ میں اپنی قوم پر عاشق ہوں۔

(۳) بارہویں شعر سے اٹھارویں شعر تک اپنی شانِ بے نیازی کا اظہار کیا ہے

(۴) انیسویں شعر میں یہ بتایا ہے کہ میں اپنی قوم کی خدمت میں ایک ہدیہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

(۵) بیسویں شعر سے چوبیسویں شعر تک اُس ہدیہ کی وضاحت کی ہے۔

(۶) آخری دو شعروں میں اس پیش کش کی غرض وغایت بیان کی ہے۔

دوسرے بند میں پندرہ شعر ہیں۔ پہلے ۱۳ اشعار میں اپنی قلبی کیفیات بیان کی ہیں۔ آخری دو شعروں میں اس بات کا بیان کیا ہے کہ جو کچھ میرے دل میں تھا، وہ سب میں نے اپنی قوم کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ بالفاظِ دگر اسے عشق رسولؐ کا پیغام دیا ہے۔

پہلے سات شعروں کا مطلب :- ملتِ اسلامیہ سے خطاب کرتے ہیں کہ اے میری قوم! تو خاتم اقوامِ عالم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ مبارکہ سے پہلے دنیا میں جو نبی آیا، اس نے ایک قوم بنائی۔ بایں طور کہ اس کے متبعین ایک قوم قرار پائے۔ اور منکرین دوسری قوم۔ جب حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، تو حسبِ دستور سابق، جو لوگ آپ پر ایمان لائے۔ وہ ملتِ اسلامیہ میں داخل ہو گئے۔ اور جنہوں نے آپؐ کا انکار کیا، وہ ملتِ کفر میں شامل ہو گئے۔ چونکہ حضورِ انورؐ خاتم الانبیاءؐ ہیں۔ یعنی آپؐ کے بعد قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اس لئے اب کوئی نئی قوم بھی دنیا میں پیدا نہیں ہو گی۔ لہٰذا ملتِ اسلامیہ خاتمِ اقوامِ عالم ہے۔

(۲) تیری دوسری خصوصیت یہ ہے کہ تجھ میں جو لوگ دین کے عالم ہیں، وہ انبیاءؑ کی مانند ہیں۔ اس مصرع میں تلمیح اس حدیث کی طرف ہے۔ "عُلَمَاءُ اُمَّتِی کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْل"

یعنی میری امت کے علماء بنی اسرائیل کی مانند ہیں۔

(۳) لیکن افسوس ہے کہ تو غیر اسلامی اصولوں کی طرف مائل ہو گئی ہے۔ اور

اس طرزِ عمل کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے گی۔

چوتھے اور پانچویں شعر میں اقبالؒ نے سعدیؒ کے اس مشہور شعر کے دونوں مصرعوں پر تضمین کر دی ہے:

اے تماشاگاہِ عالم روئے تو
تو کجا بہرِ تماشا میروی

یہ شعر اقبالؒ کے مافی الضمیر کو بہت عمدگی کے ساتھ ادا کر سکتا ہے۔ اس لئے انہوں نے اس کے مصرعوں پر تضمین کر دی۔ مطلب یہ ہے کہ اے قوم! اللہ تعالیٰ نے ساری دنیا کی خوبیاں خود تیری ذات میں جمع کر دی ہیں، تو دوسروں کی طرف کیوں مائل ہے؟ اور دوسری اقوام سے اکتسابِ فیض کی کیوں آرزو مند ہے؟

(۴) اے قوم! تجھے اللہ تعالیٰ نے عشقِ رسولؐ کا سبق پڑھایا تھا۔ لیکن تو اپنے مسلک سے بیگانہ ہو گئی اس لئے میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ پروانوں سے (عاشقانِ رسولؐ کی صحبت میں رہ کر) عاشقی کا طریقہ سیکھ لے۔

(۵) یہ شعر حاصلِ پیش کش ہے بلکہ حاصلِ کتاب ہے۔ اگر مسلمان سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیمانِ محبت کی تجدید کر لیں تو دوبارہ اس دنیا میں سربلندی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس عشقِ رسولؐ ہی نے حضرت خالدؓ میں یہ طاقت پیدا کر دی تھی کہ غزوۂ موتہ میں آٹھ تلواریں ان کے ہاتھ میں ٹوٹ گئی تھیں۔ اور بارگاہِ رسالت سے ان کو "سَیْفٌ مِّنْ سُیُوْفِ اللّٰہِ" کا غیر فانی اور لاثانی لقب عطا ہوا تھا۔

اشعار ۸ تا ۱۱ :۔ کہتے ہیں کہ اے قوم! جب سے میں نے تیرا جمال دیکھا ہے اب دنیا کا کوئی حسین میری آنکھوں میں نہیں جچتا۔ اگرچہ دوسرے شعراء غیروں کی مدح سرائی اور فانی معشوقوں کے دروازوں پر جبہ سائی کر رہے ہیں لیکن

ع
من شہیدم تیغِ ابروئے توام

اے قوم میں تو تجھ سے محبت کرتا ہوں۔

اشعار ۱۲ تا ۱۸ :۔ بادشاہوں اور دولتمندوں کی مدح سرائی کرنا میرا شیوہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے شاعری کی دولت عطا فرمائی ہے اس لئے میں بادشاہوں سے قطعاً بے نیاز ہوں۔ اپنی قوتِ بازو سے اپنی روزی مہیا کرتا ہوں۔ کسی کا احسان نہیں اُٹھاتا۔ مجھے کوئی ہستی مرعوب نہیں کر سکتی۔ میں کسی کی خوشامد نہیں کر سکتا۔ اور نہ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہوں۔ اور نہ کسی سے کوئی توقع رکھتا ہوں۔

اشعار ۱۹ تا ۲۴ :۔ لیکن اے قوم! میں تیری خدمت میں اپنے دل کے سوز و گداز کا ہدیہ پیش کرتا ہوں۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ فیضانِ سماوی میرے دل پر ہر وقت نازل ہوتا رہتا ہے میں اس کو تیری بہبود کے لئے استعمال کرتا ہوں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے ملکۂ شاعری عطا فرمایا ہے لیکن میں اس ملکہ سے دنیاوی فوائد حاصل کرنے کے بجائے قوم کو ابھارنے کا کام لیتا ہوں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اے قوم! تو میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب ہے۔ اس مصرع میں اشارہ اس آیت کی طرف ہے :۔

وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ الرَّحِیْمٌ

اور آپؐ مومنوں پر نہایت شفیق اور بہت مہربان ہیں۔

پس میں نے اس کتاب میں اپنا مافی الضمیر واضح طور پر بیان کر دیا ہے۔

اشعار ۲۵ و ۲۶ :۔ تاکہ تو اپنی حقیقت سے آگاہ ہو سکے اور آگاہی حاصل کرنے کے بعد اس مقام کو حاصل کرنے کے لئے جد و جہد شروع کرے۔ میں تجھے تیری داستانِ پارینہ سنانا چاہتا ہوں تاکہ تیرے اندر اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے کا جذبہ پیدا ہو جائے۔

دوسرا بند۔ اشعار ۱ تا ۴ :۔ کہتے ہیں کہ میں نے اس قوم کے لئے جو اپنی اصلیت سے بیگانہ ہو چکی ہے، خدائے تعالیٰ سے حیاتِ محکم کی دعا کی۔ اور دعا کا یہ سلسلہ مدتوں تک جاری رہا۔ جب دنیا سوتی تھی، میں اس وقت بارگاہِ ایزدی میں رو رو کر قوم کی ترقی کے لئے دعائیں کرتا تھا۔ اور یاحیّ یا قیّومُ کا ورد کرتا تھا۔

نوٹ :۔ اقبال نے اسمائے حسنیٰ میں سے یہ دو اسم اس لئے منتخب کئے ہیں کہ ان کا تعلق حیات اور استحکامِ حیات سے ہے۔ حیّ بمعنی زندہ اور قیوم بمعنی خود بھی زندہ اور دوسروں کو زندہ رکھنے والا۔

اشعار ۵ تا ۱۲ :۔ میں نے یہ کتاب خونِ جگر سے لکھی ہے اور اس سے مقصد یہ ہے کہ قوم کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لا سکوں۔ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں قوم کی محبت کا جذبہ روزِ ازل ہی سے ودیعت فرما دیا تھا، اس لئے میں نے اپنی ساری عمر قوم سے عشق کرنے میں

بسر کردی۔ میری شاعری اسی جذبۂ عشق کا مظہر ہے۔ اور میں اپنے نالوں کا اظہار اشعار کی صورت میں کرتا رہتا ہوں۔

اس نالہ کی بدولت انسان کے اندر فوق الفطرت طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر خس و خاشاک (کمزور انسان) شیوۂ عشق اختیار کر لے تو اس میں آگ کی خاصیت (تسخیرِ کائنات کی طاقت) پیدا ہو جاتی ہے۔

آخری تین اشعار:۔ عاشق کو اپنے مقصد میں کامیابی کے لئے، نالہ کرنا بالکل کافی ہے اس لئے اے قوم! میں تجھے اس کتاب کے ذریعہ سے نالہ و فریاد (حضورِ انورؐ سے محبت کرنے کا فن) سکھانا چاہتا ہوں۔ تا کہ تو خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر سرگرمِ عمل ہو جائے اور دو بارہ دنیا میں سربلندی حاصل کر سکے۔

خلاصہ مطالبِ مثنوی

اقبالؔ نے فرد اور جماعت کے ربط باہمی پر رموزِ بیخودی کے علاوہ دوسری تصانیف میں بھی اظہارِ خیالات کیا ہے۔ اور اس ضمن میں جو کچھ لکھا ہے وہ سب قرآنِ حکیم سے ماخوذ ہے۔ اس کتابِ حکیم نے یہ تعلیم دی ہے کہ

(۱) اگرچہ ہر شخص پر اپنی انفرادی خودی کی تربیت فرض ہے۔

(۲) لیکن اسے جماعت کے ساتھ رہنا بھی ضروری ہے یعنی اجتماعی خودی بھی پیدا کرنا لازمی ہے کیونکہ اس کے بغیر اس کی انفرادی خودی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔

انفرادی خودی کی تربیت پر، شرح اسرارِ خودی میں بہت سی قرآنی آیات نقل کر دی گئی ہیں۔ اس جگہ دو تین آیات کافی ہوں گی۔

(۱) لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی

انسان کے لیے نہیں ہے مگر وہی جس کے لیے اُس نے کوشش کی۔

(۲) لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی

کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے شخص کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔

(۳) قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا

بلاشبہ کامیاب ہو گیا جس نے اپنے نفس کو پاک کر لیا۔

(۴) لَھَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْھَا مَا اکْتَسَبَتْ

اِس کو ثواب بھی اسی (عمل) کا ملے گا جو وہ اپنے ارادے سے کرے اور اس پر عذاب بھی اسی (عمل) کا ہوگا جو وہ اپنے ارادے سے کرے۔

لیکن ان آیات کے ساتھ ہمیں یہ آیات بھی ملتی ہیں:

(۱) وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۵

اے مسلمانو! تم سب مل کر اللہ کی رسّی مضبوطی سے تھام لو۔ اور اپنی جماعت میں تفرقہ پیدا مت کرو۔

(۲) فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖٓ اِخْوَانًا ۵

پس تم اللہ کی مہربانی سے بھائی بھائی ہو گئے یعنی ایک جماعت بن گئے۔

(۳) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ ۵

بلاشبہ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

(۴) وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ

اور جو لوگ کہ آپ کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر تو بہت سخت ہیں لیکن آپس میں ایک دوسرے پر بہت مہربان ہیں۔

(۵) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۝

اے ایمان والو! تم خود بھی صبر کرو اور ایک دوسرے کو بھی تھامو (حوصلہ بڑھاؤ) اور سب مقابلہ کے لئے مستعد رہو۔

سورۂ والعصر میں اللہ تعالیٰ نے چند الفاظ میں انفرادی اور اجتماعی خودی کی تربیت کا مکمل پروگرام عطا فرمادیا ہے۔ چنانچہ بعض اکابر سے منقول ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ صرف یہی ایک سورت نازل فرمادیتا تو بندوں کی ہدایت کے لئے کافی ہوتی۔

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

قسم ہے زمانہ کی کہ انسان بڑے خسارہ میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے اور ایک دوسرے کو حق پر قائم رہنے کی فہمائش کرتے رہے اور ایک دوسرے کو عمل کی پابندی کی فہمائش کرتے رہے۔

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی کا طریقہ بیان فرمایا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ

(۱) ایمان لائے۔

(۲) عملِ صالحہ بجالائے۔

(۳) دوسروں کو تاکید کرے کہ حق پر قائم رہو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے عقائد پر جمے رہو۔

(۴) دوسروں کو تاکید کرے کہ اعمالِ صالحہ بجا لاؤ۔

صبر کرو یعنی اسلامی زندگی بسر کرنے میں اگر دشواریاں لاحق ہوں تو ان کا مقابلہ کرو۔ یہ مقابلہ بہترین عمل ہے۔

ان چاروں باتوں میں سے پہلی دو باتوں سے انفرادی خودی کی تکمیل ہو سکتی ہے اور بقیہ دو سے اجتماعی خودی پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتی ہے۔ کیونکہ جب تک سب مسلمان آپس میں مل جل کر زندگی بسر نہیں کریں گے وہ ایک دوسرے کو حق اور اور صبر کی تلقین کیسے کر سکتے ہیں؟

دیکھ لیجئے! آج کوئی مسلمان کسی مسلمان کو حق اور صبر کی تلقین نہیں کرتا محض اس لئے کہ اجتماعی طرزِ زندگی کا تصور ہی دماغوں سے محو ہو چکا ہے[1]۔

اقبال نے قرآنِ حکیم کی اسی قبیل کی تمام آیات کو سامنے رکھ کر اپنا فلسفۂ تمدن مدون کیا ہے۔ رموزِ بیخودی کے علاوہ دوسری کتابوں میں جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

(۱) زندگی اگرچہ حقیقتِ واحدہ ہے لیکن اس کے دو پہلو ہیں۔

---

[1] اکبر الہ آبادی نے کیا خوب لکھا ہے:۔

جسے موقع ملا وہ جا بسا بستی سے ہٹ کے ہیں
مزہ دیتی ہے ٹھمری الفتِ قومی کے جھگڑے ہیں

(۱) انفرادی زندگی (۲) اجتماعی زندگی ۔

(۲) قرآنِ حکیم کا منشا یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرے کہ اس کی انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی دونوں پایۂ تکمیل کو پہنچ سکیں ۔

(۳) انسان کو زندگی کے ان دونوں پہلوؤں میں ربط اور ہم آہنگی پیدا کرنی چاہیئے۔ اور چونکہ قرآنِ حکیم نے انسانی فطرت کے تمام تقاضوں کو مدِ نظر رکھا ہے اور کسی معاملہ میں اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ اس لئے اسلام کے پیش کردہ نظامِ حیاتِ اجتماعی سے بہتر نظام دنیا میں کہیں نہیں مل سکتا ۔

اسلام نے ایک طرف فرد کو زندگی کا کافی بالذات مرکز قرار دیا ہے یعنی وہ اپنے وجود میں کسی کا محتاج نہیں ہے، اور اپنے افعال کا خود ذمہ دار ہے۔ دوسری طرف اُسے جماعتی زندگی بسر کرنے کی تلقین کی ہے۔ تاکہ وہ اجتماعیت کی برکتوں اور نعمتوں سے متمتع ہو سکے۔ اور دنیا میں حکومتِ الٰہیہ کے استحکام میں حصہ لے کر اپنے مقصدِ زندگی کو حاصل کر سکے۔ اسی لئے اقبالؔ نے اسلام کو ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ سے تعبیر کیا ہے ۔

(۴) افراد کو لازم ہے کہ اپنے آپ کو جماعت سے وابستہ و پیوستہ رکھیں اور یہ پیوستگی یا وابستگی صرف جماعتی ضابطۂ اخلاق کی پابندی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعتِ اسلامیہ نے ارکانِ اسلام کی بجا آوری میں بھی جماعتی رنگ پیدا کرنے کا حکم دیا ہے۔ مثلاً

(۱) نماز باجماعت کا حکم دیا اور شارع علیہ السّلام نے فرمایا کہ تنہا نماز پڑھنے کے بجائے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے سے ستائیس[۲۷] گنا زیادہ ثواب ملے گا۔

(ب) حج بیت اللہ دنیا میں اجتماعی زندگی کا سب سے بڑا مظہر ہے اور اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمانوں میں حریت، اخوت اور مساوات کا رنگ پیدا ہو، جو اجتماعی زندگی کے لئے بمنزلۂ سنگِ بنیاد ہے۔

(۵) اگرچہ خودی کی پرورش، تربیت اور لذتِ نمود، حاصلِ حیات ہے لیکن یہ مقصد اجتماعی زندگی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے قرآنِ حکیم نے رہبانیت کو مذموم اور ممنوع قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ

اور نصاریٰ نے رہبانیت کو خود ایجاد کر لیا۔ ہم نے اس کو اُن پر واجب نہیں کیا تھا۔

اسی لئے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے:۔

لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ

اسلام میں ترکِ دنیا جائز نہیں ہے۔ محض اس لئے کہ رہبانیت، جماعتی زندگی کی ضد ہے۔ اور اسلام جماعتی زندگی کو خودی کی تکمیل کے لئے لازمی قرار دیتا ہے۔

(۶) افراد فانی ہیں، پیدا ہوتے رہتے ہیں اور مرتے رہتے ہیں۔ لیکن ملتِ اسلامیہ غیر فانی ہے۔ پھول مرجھا جاتے ہیں۔ لیکن فصلِ بہار باقی رہتی ہے۔

ع فصلِ گل از نسترن باقی تر است

اس لئے فرد کو چاہیئے کہ اپنے آپ کو ملت پر نثار کر دے۔ اگر ملت کو اس کی جدوجہد سے استحکام نصیب ہو گیا، تو وہ بھی غیر فانی ہو جائے گا۔ مثلاً

جب تک دنیا قائم ہے، حیدر کرار رضؓ اور خالد جانبازؓ کا نام آفتاب اور ماہتاب کی طرح چمکتا رہے گا۔ اسی نکتہ کو اقبالؔ نے یوں بیان کیا ہے۔

وجود افراد کا مجازی ہے ہستیٔ قوم ہے حقیقی

فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زنِ طلسمِ مجاز ہو جا،

یہ شعر بظاہر بہت آسان ہے لیکن بڑی حقیقت کا حامل ہے نیز یہ شعر بہت مشہور ہے لیکن بہت کم لوگ اس کے مفہوم سے آشنا ہیں۔

(۷) یہ سچ ہے کہ فرد کو انفرادی مقاصد کے لئے جدوجہد کرنا لازمی ہے۔ لیکن جب تک وہ اپنے ذاتی مقاصد کو قوم کے وسیع تر مقاصد پر قربان نہیں کرے گا اس کی خودی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی، اور نہ وہ اپنے مقصدِ حیات میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ یعنی ہر فرد پر لازم ہے کہ وہ اپنے اندر ایثار اور قربانی یعنی خود فراموشی کا جذبہ پیدا کرے۔ تاکہ وہ اپنی ملت کے مقاصدِ عالیہ کے لئے اپنی جان قربان کر سکے۔ اور اسی میں زندگی کا کمال مضمر ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ :-

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝

جو لوگ ایمان لائے اور اللہ کے لئے انہوں نے ترکِ وطن کیا اور اللہ کی راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد کیا، وہ اللہ کے نزدیک درجہ کے لحاظ سے بہت بڑے ہیں، اور یہی لوگ حقیقی معنی میں کامیاب ہیں۔

اربابِ علم سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ یہاں اللہ کی راہ سے قوم کی خدمت مراد ہے۔ کیونکہ اللہ تو بے نیاز ہے۔ اُسے نہ کسی کی ہجرت کی ضرورت ہے نہ کسی کے

جہاد کی۔ ہجرت اور جہاد محض اس لئے پسندیدہ ہے کہ اسی سے اسلام اور مسلمانوں کو سربلندی حاصل ہوتی ہے۔

(۸) انسان، دراصل اس وقت انسان بنتا ہے جب وہ ایسے مقاصد کو اپنا نصب العین بنائے جو اس کی ذات سے بالاتر ہوں یا جن کا نفع اس کے بجائے دوسروں کو پہنچے۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم یہ ہے کہ راحت، مسرت اور طمانیت کا راز خود غرضی اور نفس پرستی کے بجائے، ایثار یعنی دوسروں کی خدمت کرنے میں مضمر ہے۔ چنانچہ شیخ سعدی فرماتے ہیں:۔

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست
بہ تسبیح و سجّادہ و دلق نیست

یعنی جماعتی زندگی کا مطلب یہ ہے کہ انسان دوسروں کو فائدہ پہنچائے غیروں کا بھلا چاہے۔ اور قرآنِ حکیم کی رُو سے تبلیغِ اسلام سب سے بڑی خدمت ہے۔ یعنی اس سے بڑھ کر دوسروں کو نفع پہنچانے کی اور کوئی صورت نہیں کہ انہیں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غلام بنا کر قیصر و کسریٰ پر حکمران بنا دیا جائے۔

نوٹ:۔ مسلمانوں کی ذلت اور خواری کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ وہ تبلیغِ اسلام یعنی مقصدِ حیات سے غافل ہو گئے ہیں۔ ۱۲

(۹) چونکہ زندگی انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی، اس لئے انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ ان دونوں میں ہم آہنگی پیدا کرے۔ زندگی کی ان دونوں شاخوں کو ہم درخت کی مثال سے واضح کر سکتے ہیں۔ یعنی انفرادی زندگی کو درخت کے تنے سے اور اجتماعی

زندگی کو اس کی جڑوں سے تشبیہہ دے سکتے ہیں۔ اگر جڑیں کمزور ہو جائیں تو درخت کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ بلکہ درخت کا وجود اور قیام اور استحکام یہ سب کچھ جڑوں ہی پر موقوف ہے۔

پیکرش از قوم و ہم جانش ز قوم
ظاہرش از قوم و پنہانش ز قوم

اسی لئے احادیث میں جماعت کے ساتھ رہنے کی تاکید آئی ہے۔

(۱۰) اسلام سے بڑھ کر دنیا میں کسی عمرانی یا فلسفیانہ نظام یا مذہب نے فرد اور جماعت کے تضاد کو رفع نہیں کیا۔ اسلام نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ فرد کی مادی اور روحانی زندگی میں جو عدیم المثال امتزاج پیدا کیا ہے، وہ اس بات کا ضامن ہے کہ ملتِ اسلامیہ کبھی فنا نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ہر انقلاب کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکتی ہے۔ جس کو شک ہو، وہ تاریخ کا مطالعہ کرے۔

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

اقبال نے اجتماعی زندگی پر اپنی تصانیف میں اس قدر لکھا ہے کہ اگر میں اس کو اس جگہ نقل کروں تو یہ شرح اپنی حدود سے متجاوز ہو کر "اقبال کے فلسفۂ تمدن" کی صورت اختیار کر لے گی۔ اس لئے صرف ایک شعر پر اس بحث کو ختم کئے دیتا ہوں:-

زندگی انجمن آرا و نگہدارِ خود است
اے کہ در قافلہ بے ہمہ شو با ہمہ رو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رموزِ بیخودی

تمہید

در معنیٔ ربطِ فرد و ملّت

فرد اور ملت میں ربط کے مفہوم کی وضاحت

فرد را ربطِ جماعت رحمت است — جوہرِ او را کمال از ملّت است
تا توانی با جماعت یار باش — رونقِ ہنگامۂ احرار باش
حرزِ جاں کُن گفتۂ خیر البشرؐ — ہست شیطاں از جماعت دُور تر
فرد و قوم آئینۂ یک دیگر اند — سلک و گوہر کہکشاں و اختر اند
فرد می گیرد ز ملّت احترام — ملّت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود — قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

مایه دارِ سیرتِ دیرینه او　　رفته و آینده را آئینه او
وصلِ استقبال و ماضی ذاتِ او　　چون ابد لا انتها اوقاتِ او
در دلش ذوقِ نمود از ملّت است　　احتسابِ کارِ او از ملّت است
پیکرش از قوم و هم جانش ز قوم　　ظاهرش از قوم و پنهانش ز قوم
در زبانِ قوم گویا می شود　　بر رهِ اسلاف پویا می شود
پخته تر از گرمیِ صحبت شود　　تا بمعنی فردِ هم ملّت شود
وحدتِ او مستقیم از کثرت است　　کثرت اندر وحدتِ او وحدت است
لفظ چون از بیتِ خود بیرون نشست　　گوهرِ مضموں بجیبِ خود شکست
برگِ سبزے کز نہالِ خویش ریخت　　از بہاراں تارِ امیدش گسیخت
ہر کہ آب از زمزمِ ملّت نخورد　　شعلہ ہائے نغمہ در عودش فسرد
فردِ تنہا از مقاصد غافل است　　قوتش آشفتگی را مائل است
قوم با ضبط آشنا گرداندش　　نرم رو مثلِ صبا گرداندش
پا بہ گِل مانندِ شمشادش کند　　دست و پا بندد کہ آزادش کند

چون اسیرِ حلقهٔ آئین شود
آہوئے رم خوئے او مشکیں شود

تو خودی از بیخودی نشناختی　　خویش را اندر گماں انداختی
جوہرِ نوری است اندر خاکِ تو　　یک شعاعش جلوهٔ ادراکِ تو
عیشت از عیشش غمِ تو از غمش　　زنده ای از انقلابِ ہر دمش
واحدست و بر نمی تابد دوئی　　من ز تابِ او من استم تو توئی

خویش دار و خویش باز و خویش ساز
ناز ہا می پرورد اندر نیاز

آتشے از سوزِ او گردد بلند
ایں شرر بر شعلہ اندازد کمند

فطرتش آزاد و ہم زنجیری است
جزو ِ او را قوّتِ کل گیری است

خوگرِ پیکار پیہم دیدمش
ہم خودی ہم زندگی نامیدمش

چوں ز خلوت خویش را بیروں دہد
پائے در ہنگامۂ جلوت نہد

نقش گیر اندر دلش "او" می شود
"من" ز ہم می ریزد و "تو" می شود

جبر قطعِ اختیارش می کند
از محبت مایہ دارش می کند

ناز تا ناز است کم خیزد نیاز
ناز ہا سازد بہم خیزد نیاز

در جماعت خود شکن گردد خودی
تا ز گلبرگے چمن گردد خودی

"نکتہ ہا چوں تیغ پولاد است تیز
گر نمی فہمی ز پیشِ ما گریز"

(فصلِ اوّل)

تمہید :- فلسفۂ اجتماع (شوشیالوجی) کے ماہرین میں اس سوال پر اختلاف آرا پایا جاتا ہے کہ فرد اور جماعت میں کیا رشتہ ہے؟ بعض حکمار کا یہ خیال ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اور اسی لئے ایک کی ترقی دوسرے کے تنزل کا باعث ہے۔ لیکن اقبال اس نظریہ کے مخالف ہیں۔ اُن کی رائے میں فرد اور جماعت دونوں آپس میں مربوط ہیں، اور ایک کی ترقی دوسرے کی ترقی پر موقوف ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تمہید میں اسی نظریہ کی وضاحت کی ہے۔

ان کی وضاحت کا خلاصہ یہ ہے کہ دونوں میں تضاد نہیں ہے بلکہ کامل ہم آہنگی اور توافق ہے۔ یعنی جماعت کی بہبود، افراد کی بہبود سے جداگانہ کوئی شئے نہیں ہے۔

بعض حکماء کا خیال یہ ہے کہ فرد اور جماعت میں تضاد تو نہیں ہے۔ لیکن جماعت کو فرد پر تفوق حاصل ہے۔ بعض اس کے برعکس، فرد کو جماعت پر فضیلت دیتے ہیں۔

لیکن اقبال کہتے ہیں کہ یہ دونوں نظریے غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فرد اور جماعت دونوں ہم پلہ ہیں اور ایک دوسرے کے لئے بمنزلہ آئینہ ہیں۔

یہ سچ ہے کہ بعض اوقات چند افراد اپنی جان قوم کی بقا کے لئے قربان کر دیتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ قوم اعلیٰ اور افضل ہے۔ کیونکہ بعض اوقات ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ پوری قوم ایک فرد کی عزت کے لئے سربکف ہو کر میدانِ جنگ میں کود پڑتی ہے۔

اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ ہر فرد کی ذات میں انفرادیت اور اجتماعیت کے عناصر اس طرح پیوستہ ہوتے ہیں کہ انہیں جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے ہر فرد میں شخصیت کے ان دونوں پہلوؤں کی طرف طبعی میلان پایا جاتا ہے، اور اس کی خودی کی تکمیل کے لئے ان دونوں کی آبیاری لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اسرارِ خودی کے بعد رموزِ بیخودی لکھی۔ اول الذکر میں فرد کی شخصیت کے ذاتی یا انفرادی پہلو کی، اور آخر الذکر میں اس کی شخصیت کے اجتماعی یا عمرانی پہلو کی تربیت کا پروگرام قرآن کی روشنی میں پیش کیا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اقبالؔ کی تعلیم یہ ہے کہ :۔

(۱) جماعت کے بغیر فرد اپنی شخصیت کی تکمیل نہیں کر سکتا۔

(۲) افراد کے بغیر جماعت کا وجود متحقق نہیں ہو سکتا۔

(۳) بڑا آدمی وہ نہیں جو جماعت سے الگ رہ کر زندگی بسر کرے۔ بلکہ بڑا آدمی وہ ہے جو اپنی جماعت کے ساتھ ایسی ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کر لے کہ

ع ظاہرش از قوم و پنہانش ز قوم

کا مصداق بن جائے۔

اسی لئے اقبالؔ نے خطبات میں اس موضوع پر فلسفیانہ رنگ میں اظہارِ خیالات کیا ہے۔ اور اس ضمن میں لکھا ہے کہ "جماعت کے ساتھ منسلک رہنے سے فرد میں مشاہدہ کی قوت اور جذبات کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور ارادہ میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔"

اقبالؔ، پروفیسر میک ڈوگل کے اس خیال سے بھی متفق ہیں کہ "سوسائٹی کے بغیر فرد میں آدمیت پیدا نہیں ہو سکتی" کیونکہ جماعت ہی اس کے اندر "ضبط" کا مادہ پیدا کرتی ہے، اور اس کو قانون کا احترام سکھاتی ہے"

لفظِ ملّت کا مفہوم :۔ اقبالؔ نے اس تمہید میں لفظِ ملّت کو قوم کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ ذیل میں اس لفظ کی مختصر تحقیق درج کرتا ہوں :۔

واضح ہو کہ ملّت عربی زبان کا قدیم لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں، مذہب یا شریعت دین۔ قرآن و حدیث اور لغتِ عرب میں یہ لفظ صرف اسی معنی میں مستعمل ہے۔ مثلاً مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ تمہارے باپ ابراہیمؑ کا دین۔

دوسری مثال :۔ علامہ شہرستانی کی کتاب کا نام "الملل والنحل" ہے اس میں ملل (جمع ملت) ادیان و مذاہبِ عالم پر بولا گیا ہے۔

تیسری مثال :۔ اردو میں بھی (آج سے سو سال پہلے) ملت کا لفظ مذہب کے معنی میں مستعمل تھا ؎

کس کی ملت میں گنوں آپکو بتلا اے شیخ
تو کہے گبر مجھے، گبر مسلماں مجھ کو

لیکن جدید عربی اور فارسی میں ملت کے معنی قوم کے ہو گئے ہیں، اور چونکہ جدید فارسی ہندوستان کے موجودہ انگریزی داں طبقہ میں بھی راہ پا گئی، اس لئے وہ ملت کے قدیم مفہوم سے بیگانہ ہو گئے، اور انہوں نے اس لفظ کو قوم کے معنی میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔[1]

پہلے دو شعر:۔ واضح ہو کہ اقبال نے "پیش کش" میں عاشقانہ شاعری کا اسلوبِ بیان اختیار کیا ہے، چنانچہ عرفی کا شعر اس پر شاہد ہے، لیکن تمہید خالص اسلامی رنگ میں لکھی ہے۔ جب ہم پیشکش پڑھنے کے بعد "تمہید" کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نئی دنیا میں آگئے۔ مثال کے طور پر

---

[1] اقبال نے اس مشہور شعر میں بھی لفظِ ملت کو قوم ہی کے مضمون میں استعمال کیا ہے :۔

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است

پہلے دو شعروں پر غور کیجئے۔ اقبال نے پہلے شعر کے پہلے مصرع میں فرد کے لئے جماعت سے وابستگی کو "رحمت" قرار دیا ہے اور اربابِ علم جانتے ہیں کہ یہ لفظ نہ عاشقانہ ہے نہ فلسفیانہ بلکہ خالص اسلامی (قرآنی) ہے۔

اقبال نے یہ لفظ قرآن مجید کی اس آیت شریفہ سے اخذ کیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (۴۸: ۲۹)

اور جو لوگ آپ کی جماعت میں شامل ہیں، وہ کافروں کے حق میں بہت سخت ہیں۔ لیکن آپس میں ایک دوسرے پر بہت شفیق اور مہربان ہیں۔

دوسرے مصرع میں لفظ "جوہر" سے مراد، ذات یا نفسِ ناطقہ یا روح ہے۔ اس پر قرینہ یہ ہے، کہ فلاسفہ نے نفسِ ناطقہ کو عرض یا جسم یا مادّی نہیں مانا۔ بلکہ اسے مجردات میں سے تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ علم النفس کی کتابوں میں مرقوم ہے کہ نفسِ ناطقہ ایک جوہر مجرّد ہے۔

اس کے بعد علم الاخلاق میں انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ حصولِ کمال کی آرزو، نفسِ ناطقہ کا ذاتی تقاضا ہے۔ اور علم یا معرفت (گیان) سے اس کو کمال حاصل ہو سکتا ہے۔

لیکن اقبال یہ کہتے ہیں کہ:۔

ع جوہر او را کمال از ملت است

جب فرد اپنا رابطہ ملت سے استوار کر لیتا ہے تو کمال کی کئی راہیں اس پر کشادہ ہو جاتی ہیں۔ یعنی حصول کمال اسی رابطہ پر موقوف ہے۔

اقبال نے دوسرے شعر میں حصولِ کمال کا طریقہ بیان کیا ہے کہ جہاں تک

تم سے ممکن ہو سکے، اجتماعی زندگی بسر کرو۔ جماعت کے ساتھ رہو۔ اس شعر میں یار کا معنیٰ ہے مددگار، معین یا رفیق کار، اور احرار سے مراد ہیں مسلمان۔ کیونکہ قرآن حکیم کی رو سے مسلمان دنیا میں کسی کا غلام نہیں ہو سکتا۔ اسلام اور غلامی میں تقابل تضاد ہے۔

واضح ہو کہ جس طرح مرشد رومیؒ نے مثنوی کے پہلے دو شعروں میں پوری مثنوی بیان کر دی ہے، اسی طرح اقبالؔ نے ان دو شعروں میں ساری "رموزِ بیخودی"، کا عطر کھینچ دیا ہے۔

بات صرف اتنی ہی ہے کہ:۔

(ا) فرد کا جماعت سے مربوط اور پیوستہ رہنا اس کے حق میں باعثِ رحمت ہے۔

(ب) کیونکہ اس کی خودی کی تکمیل اجتماعی زندگی بسر کرنے ہی سے ہو سکتی ہے اجتماعی زندگی کی بدولت اس کی خودی کی مخفی صلاحیتیں بروئے کار آجاتی ہیں۔ اسی لئے اسلام کا دوسرا نام "ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ" بھی ہے۔

(ج) پس کمالِ روحانی حاصل کرنے کے لئے فرد کو لازمی ہے کہ حتی المقدور اجتماعی زندگی بسر کرے۔ خیالات اقوال اور اعمال تینوں شعبوں میں جماعت کی پیروی کرے۔ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ نہ بنائے۔ واضح ہو کہ اقبالؔ نے اسی بات کو پوری کتاب میں بالوضاحت بیان کیا ہے تیسرے شعر میں انہوں نے اپنے دعویٰ کو حدیثِ نبویؐ سے مدلل کیا ہے:

عَلَيْكُمْ بِالسَّوَادِ الْأَعْظَمِ فَإِنَّهُ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ۔

اے مسلمانوں! تم پر اجتماعی زندگی بسر کرنی فرض ہے کیونکہ جو شخص جماعت سے الگ ہو گیا تو اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

ترمذی میں یہ حدیث یوں آئی ہے:۔

اِتَّبِعُوا السَّوَادَ الْاَعْظَمَ فَاِنَّہٗ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ۔

یعنی اے مسلمانوں! سوادِ اعظم (جماعت) کی اتباع کرو کیونکہ جو شخص سوادِ اعظم سے کٹ جائے گا۔ وہ دوزخ میں جا پڑے گا۔

اس کے علاوہ ابنِ ماجہ میں یہ حدیث آئی ہے:۔

یَدُ اللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَۃِ۔

جماعت پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہوتا ہے یعنی جماعت گمراہ نہیں ہو سکتی۔

تیسری حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جماعت سے الگ مت رہو کیونکہ بھیڑیا اسی بکری کو لے جاتا ہے جو گلہ سے الگ ہو جاتی ہے۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شیطان اس شخص کو ہرگز نہیں ورغلا سکتا جو جماعت (سوادِ اعظم) کے ساتھ ہے یعنی اجتماعی زندگی بسر کرتا ہے۔

چوتھے شعر سے اس بند کے آخر تک اقبال نے اپنے اس دعویٰ کی وضاحت کی ہے جو پہلے دو شعروں میں کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ فرد اور قوم یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے بمنزلہ آئینہ ہیں۔ یعنی فرد اور قوم کی ایک تو انفرادی ہستی ہے۔ جس کی بدولت وہ اپنی اپنی جگہ قائم ہیں۔ دوسری اُن کی اجتماعی ہستی ہے جس میں وہ ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ آئینہ نہ ہو تو انسان اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتا اور انسان نہ ہو تو آئینہ کا وجود کس طرح متحقق ہو سکتا ہے؟ اسی طرح قوم نہ ہو تو فرد اپنی قدر و قیمت کا

تعین نہیں کر سکتا اور افراد نہ ہوں تو قوم کا وجود کیسے متحقق ہو سکتا ہے یعنی قوم کیسے عالم وجود میں آسکتی ہے؟ لہٰذا افراد اور قوم اپنا اپنا وجود ایک دوسرے کی بدولت حاصل کرتے ہیں مثلاً اگرچہ ہر فرد بجائے خود وجود رکھتا ہے لیکن اس کا وجود دنیا میں اسی وقت چمک سکتا ہے جب اس کا عکس قوم کے آئینہ سے دنیا والوں پر ظاہر ہو۔ اسی طرح قوم کا مرتبہ اور مقام بلکہ وجود، افراد ہی کی بدولت دنیا کی نگاہوں میں قائم ہو سکتا ہے۔ افراد نہیں تو قوم کہاں سے آئے اور قوم نہ ہو تو فرد کیسے قیمت پائے؟

نوٹ:۔ افراد اور قوم کے ربطِ باہمی پر ایک فلسفیانہ اعتراض وارد ہوتا ہے۔ جس کو منطقی اصطلاح میں دور کہتے ہیں۔ یعنی موقوف ہونا فرد کا قوم پر اور قوم کا فرد پر۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دور کی دو قسمیں ہیں (۱) دورِ معی، (۲) دورِ مہروب۔ یہاں دورِ معی ہے اور یہ صورت مناطقہ کے نزدیک جائز ہے۔

کہتے ہیں کہ فرد جب اپنی ہستی جماعت میں گم کر دیتا ہے تو اس کی مثال اس قطرہ کی سی ہو جاتی ہے جو سمندر میں مل کر سمندر بن جاتا ہے۔ یعنی جب فردِ قوم کے مقاصد کو اپنی زندگی کے مقاصد قرار دے لیتا ہے اور اپنی زندگی قومی نصب العین کے حصول کے لئے وقف کر دیتا ہے تو پوری قوم اس کی ذات میں سما جاتی ہے اور وہ پوری قوم کے جذبات و احساسات کا مظہر (Symbol) بن جاتا ہے۔ مثلاً جب اسمبلی کا ایک رکن (فرد) ایوان میں تقریر کرتا ہے تو وہ اس وقت اپنے حلقۂ انتخاب کے تمام افراد کے جذبات اور احساسات کا ترجمان ہوتا ہے یعنی وہ فرد، بجائے خود قوم بن جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ملّت سے رابطہ کی بدولت، فرد سیرتِ ملّی کا حامل بن جاتا ہے۔ یعنی پوری قوم کی سیرت اس کی ذات میں جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ اور اسے دیکھ کر ایک شخص یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ جس قوم کا یہ فرد ہے وہ زمانۂ ماضی میں کیسے شاندار کارنامے دکھا چکی ہے اور آئندہ کس قسم کے شاندار کارنامے ظہور پذیر ہوں گے۔ یعنی اس کی ذات، ماضی اور مستقبل دونوں کے لئے نقطۂ اتصال بن جاتی ہے۔ ایک شخص اس کو دیکھ کر اس کے ماضی سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ اور اس کے مستقبل کا اندازہ کر سکتا ہے۔

کہتے ہیں کہ اس رابطہ کی بدولت فرد کے دل میں ترقی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور ملّت ہر وقت اس کے اعمال و افعال کا احتساب کرتی رہتی ہے۔ یعنی اگر کسی وقت اس کا قدم صراطِ مستقیم سے ہٹ جاتا ہے تو ملّت فوراً اُس کو متنبہ کر دیتی ہے اور اس طرح راہِ راست پر آجاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ اس ربط کی بدولت فرد کی پوری زندگی، قوم کے سانچہ میں ڈھل جاتی ہے اس کا ظاہر اور باطن غرضکہ پوری شخصیت قوم کی مرہونِ منّت ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ قوم ہی کی زبان سیکھتا ہے اسی کے ذریعہ سے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے اور اسی ربط کی بدولت وہ اپنے بزرگوں کی تقلید کرتا ہے۔ اور قومی خصائص اختیار کرتا ہے۔

کہتے ہیں کہ اجتماعی زندگی کی بدولت فرد کی سیرت پختہ تر ہو جاتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات وہ بذاتِ خود، ملّت بن جاتا ہے۔ یعنی اس کی شخصیت میں پوری قوم کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔

نوٹ:- ایسا شخص وہ ہوتا ہے جسے قدرت مصلح بنانا چاہتی ہے اور اگر وہ مصلح اپنی قوم کی دینی اصلاح کرتا ہے تو اسے اصطلاح میں مجدد کہتے ہیں جیسے حضرت مجدد الفِ ثانی رح۔

اقبالؔ نے یہ نکتہ قرآن مجید کی اس آیت سے اخذ کیا ہے:-

اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفًا ط (۱۶: ۲۰)

بیشک حضرت ابراہیمؑ (قوم موحدین کے) پیشوا تھے، اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار صحیح راستہ پر یعنی سب سے قطع تعلق کر کے صرف اللہ کے ہو گئے تھے۔

کہتے ہیں کہ ربط ملت کی بدولت فرد کی وحدت میں پختگی (استقامت) پیدا ہو جاتی ہے اور اس قسم کے پختہ اور باکمال افراد کی بدولت خود قوم کے اندر شانِ وحدت پیدا ہو جاتی ہے یعنی جب متعدد افراد اپنی وحدت کو کثرت (قوم) میں گم کر دیتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کثرت (قوم) میں وحدت کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی پوری قوم وحدتِ افکار و کردار کی بدولت، ایک شخص بن جاتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ تمام مسلمان ایک جسم کی طرح ہیں کہ اگر ایک عضو کسی وجہ سے مبتلائے الم ہو جائے تو تمام اعضاء اس کی تکلیف سے متاثر ہو جاتے ہیں۔

حق یہی ہے کہ اگر تمام افراد، انفرادی زندگی بسر کرنی شروع کر دیں اور کوئی فرد دوسرے افراد سے ارتباط اور اختلاط پیدا نہ کرے تو قوم کبھی ہرگز معرضِ وجود میں نہیں آسکتی۔

اگلے شعر میں اس نکتہ کو ایک مثال سے واضح کرتے ہیں کہ شعر اس وقت،

موزوں اور با معنی بنتا ہے جب اس کے تمام الفاظ آپس میں مربوط ہوں لیکن اگر الفاظِ شعر میں سے کسی ایک لفظ کو بیت سے خارج کر دیا جائے تو سارا مضمون خبط ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر ایک شخص بھی اپنی ملت سے قطع تعلق کر لے تو ملت کو بہت ضعف پہنچ جائے گا۔

اس کے بعد دوسری مثال دیتے ہیں کہ جو پتہ شاخ سے جدا ہو جاتا ہے وہ موسمِ بہار میں سرسبز نہیں ہو سکتا۔ یعنی جو شخص ملت سے جدا ہو جاتا ہے اس کی ترقی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتا ہے۔

بات یہ ہے کہ فرد اگر تنہا زندگی بسر کرے تو وہ اپنے مقاصدِ حیات سے بیگانہ بلکہ اپنی خودی سے غافل ہو جائے گا۔ اور اس کی تمام خداداد قوتیں آشفتہ ہو جائیں گی وہ ان سے خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں کر سکے گا۔ یہ قوم ہی ہے جو فرد کی زندگی میں نظم اور ضبط پیدا کر دیتی ہے اور اسے قوانین کی اطاعت کا سبق پڑھاتی ہے اور اس کی زندگی میں اعتدال کا رنگ پیدا کر دیتی ہے۔

بیشک قوم اس کو آئین کا پابند بنا دیتی ہے اور اس کے اقوال و افعال (دست و پا) پر قیود عاید کر دیتی ہے۔ مثلاً فلاں فعل جائز ہے، فلاں ناجائز۔ لیکن انہی پابندیوں کی بدولت اسے حقیقی آزادی نصیب ہوتی ہے کیونکہ فلسفہ عمرانیات کی رُو سے آزادی نام ہی پابندیوں کا ہے۔

نوٹ:۔ اقبالؔ نے اپنی تصانیف میں اس فلسفہ کو مختلف طریقوں سے واضح کیا ہے۔ مثلاً ایک شعر درج کرتا ہوں:۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں ۔۔۔ موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

کہتے ہیں کہ جب فرد، قانون (آئین) کا پابند ہو جاتا ہے تو اس کا آہو، جو خوئے رم رکھتا ہے، مشکیں ہو جاتا ہے یعنی اس کی شخصیت جس میں خود غرضی کا عنصر کارفرما ہوتا ہے، پابندیٔ آئین کی بدولت دوسروں کے لئے فائدہ رساں بن جاتی ہے جب تک آہو کا خون گردش کرتا رہتا ہے نافہ نہیں بنتا لیکن جب وہ ناف میں آ کر مقید ہو جاتا ہے تو اس کا وجود نہایت قیمتی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب ایک مسلمان، شریعت کے حلقہ میں اسیر ہو جاتا ہے تو اس کا وجود دنیا والوں کے لئے مفید بن جاتا ہے۔

دوسرا بند :- خیالات کی گہرائی کے لحاظ سے یہ بند اس کتاب کا سب سے زیادہ مشکل مقام ہے۔ اس لئے میں ہر شعر کا مطلب جداگانہ بیان کروں گا۔

اس مقام کے دشوار ہونے کا سبب یہ ہے کہ اس میں اقبالؔ نے اپنی عادت کے مطابق اجمال سے کام لیا ہے یعنی فلسفۂ تصوّف کو چند لفظوں میں قلمبند کر دیا ہے چونکہ ان اشعار کا سمجھنا اس فلسفہ سے آگاہی پر موقوف ہے اس لئے مناسب ہے کہ پہلے اس کی وضاحت کر دوں :-

واضح ہو کہ فلسفۂ تصوّف کی رو سے سلسلۂ موجودات تعیّن وحدت ہی سے شروع ہوتا ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ ابتدا میں صرف حق تعالیٰ موجود تھا۔ چنانچہ یہ حدیث اس پر شاہد ہے :-

كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ مَعَهُ شَيْءٌ ۔

یعنی ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب صرف اللہ موجود تھا اور اس کے ساتھ کوئی شئے

موجود نہ تھی۔

جب خدا نے کائنات کو پیدا کرنا چاہا تو سب سے پہلے اس وحدتِ محضہ میں امتیازِ علمی کا مرتبہ نمودار ہوا۔ یعنی حق تعالیٰ نے اپنی مرضی سے نورِ محمدی ص کو پیدا کیا جسے اصطلاح میں حقیقت الحقائق کہتے ہیں چونکہ نورِ محمدی مخلوق ہے اس لئے واجب اور ممکن کا امتیاز پیدا ہو گیا ہے جسے اصطلاح میں تعینِ اول کہتے ہیں۔

نوٹ :۔ تعین سے صوفیاء کی مراد ہے کلی کا جزئی بن جانا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جب آپ نے سمندر میں سے لوٹا بھر پانی بھرا تو بظاہر غیر محدود سمندر کا پانی اس لوٹے میں محدود ہو گیا۔ بس یہی تعین ہے بالفاظِ دگر۔

سمندر = وجودِ مطلق ہے

لوٹا بھر پانی = تعین یا تشخص ہے

اب پڑھئے خواجہ میر درد کے اس شعر کو :۔

پردے کو تعین کے درِ دل سے اٹھا دے

کھلتا ہے ابھی پل میں طلسماتِ جہاں کا!

اس تعین اول کے بعد عالم ارواح کا وجود متحقق ہوا، پھر عالم مثال کا دل جس کے درمیان برزخی کیفیت رکھتا ہے۔ پھر عالم اجسام کا۔ اور تعینات و تقیدات کی آخری شکل انسان ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ

(۱) وحدتِ محضہ سے نورِ محمدی پیدا ہوا جیسا کہ حدیث میں آتا ہے :۔

اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ۔

سب سے پہلی چیز جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی وہ نور تھا۔

یہ تعین اول ہے اسی کی بدولت واجب اور ممکن کا امتیاز پیدا ہوا۔

(ب) تعین ثانی ہیں، ارواحِ بسیطہ عالم وجود میں آئیں۔

(ج) تعین ثالث ہیں عالم مثال یا عالم برزخ۔

(د) تعین رابع میں عالمِ اجسام اور اس کی مختلف اشکال مثلاً جسم مطلق جسمِ نامی (حیوان) اور جسمِ انسانی

عارف جامی نے مسئلہ تخلیق کائنات کو بدیں الفاظ بیان کیا ہے۔

حبذا روزیکہ قبل از روز و شب
فارغ از اندوہ و آزارِ طلب

متحد بودیم باشاہِ وجود
حکمِ غیریت بکلی محو بود

ناگہاں از جنبشِ بحرِ وجود را
جملہ را در خود، ز خود، با خود نمود

واجب و ممکن زہم ممتاز شد
رسم و آئینِ دوئی آغاز شد

بعد ازاں یک موجِ دیگر زد محیط
سوئے ساحل آمد ارواحِ بسیط

یعنی ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے جب اس کائنات کا کوئی وجود نہ تھا اور ہم اندوہ (غم) اور طلب (خواہشات) سے بالکل فارغ تھے اور حق تعالیٰ کے ساتھ متحد تھے۔ اور اس میں اور ہم میں مطلق غیریت نہیں تھی۔

ناگہاں (جب خدا نے چاہا) بحرِ وجود میں جنبش ہوئی اور اس جنبش کی بدولت امواج پیدا ہو گئیں۔ یعنی شاہِ وجود (حق تعالیٰ) نے تمام کائنات کو "در خود، از خود اور با خود" ظاہر فرما دیا۔

(۱) در خود سے مراد یہ ہے کہ یہ کائنات خدا ہی کے اندر ہے کوئی شئے اس سے باہر نہیں ہے کیونکہ ہو ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے:۔

وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ۝ (۴ : ۱۲۵)

اور اللہ ہر شئے کو گھیرے ہوئے ہے۔

اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ۝ (۴۱ : ۵۴)

آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ نے ہر شئے کا احاطہ کر رکھا ہے۔ یعنی اپنے اندر لے رکھا ہے کوئی شئے اس سے باہر نہیں ہے۔

(ب) از خود سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو اپنے ہی وجود سے بنایا ہے کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی شئے تو موجود ہی نہیں ہے یا دوسری کسی شئے کا وجود نہیں ہے۔

(ج) با خود سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو اپنے وجود کے سہارے

سے قائم کر رکھا ہے۔ یہ کائنات اس کی صفت قیومیت کی بدولت نظر آ رہی ہے۔ جس طرح شعلۂ جوالہ کا وجود، ہاتھ کی حرکت پر منحصر ہے۔ اگر حرکت رک جائے تو وہ حلقۂ آتشیں فوراً معدوم ہو جائے گا۔

قصہ مختصر تعینِ اول کے بعد واجب الوجود اور ممکن الوجود کا امتیاز پیدا ہوا حق تعالیٰ واجب الوجود ہے اور ساری کائنات ممکن الوجود ہے۔

نوٹ:۔ واجب الوجود اُسے کہتے ہیں جس کی ماہیت وجود ہو۔ اور ممکن الوجود اُسے کہتے ہیں جس کی ماہیت عدم ہو۔

اور اس امتیاز کی بدولت دوئی اور غیریت کا قانون کائنات میں رائج ہو گیا۔ یعنی یہ زید ہے، وہ بکر ہے، یہ کوہ ہے، وہ دریا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد سمندر سے دوسری موج اُٹھی اور اس کی بدولت ارواح عالم وجود میں آگئیں۔ ساری کائنات، واجب الوجود ہی کی ذات سے نکلی ہے۔ جس طرح لہریں سمندر ہی سے نکلتی ہیں اور پھر اسی میں مل جاتی ہیں۔ اسی نکتہ کو قرآن مجید یوں فرماتا ہے:۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ○

بیشک ہم اللہ ہی کی طرف سے آئے ہیں اور بلاشبہ ایک دن اُسی کی طرف لوٹ کر چلے جائیں گے۔

نوٹ:۔ ہر شخص رات دن اس آیت کی تلاوت کرتا رہتا ہے لیکن کوئی بھی اس کا مفہوم سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔

عارف رومی نے اسی حقیقتِ کبریٰ کے اظہار سے اپنی مثنوی کا آغاز کیا ہے:۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

یعنی انسان چونکہ اپنی اصل سے دور ہو گیا ہے اس لئے جدائی کی شکایت کر رہا ہے اور وصل کا طالب ہے۔

ان تصریحات کے بعد اب اس مشکل بند کا مطلب لکھتا ہوں لیکن اس سے پہلے اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اس بند کا مطلب دو مختلف، طریقوں سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے شعر میں "جوہر نوری" کے معنی انائے مطلق بھی ہو سکتے ہیں اور انائے مقید بھی۔ اگر پہلے مفہوم کو مدِ نظر رکھا جائے تو سارے بند کی شرح صوفیانہ زاویۂ نگاہ سے ہو سکتی ہے۔ اور اگر دوسرے مفہوم کو تسلیم کیا جائے تو پھر اس بند کا مطلب عقلی نقطۂ نظر سے بیان کر سکتے ہیں۔ میں دونوں مطلب ذیل میں درج کئے دیتا ہوں، ناظرین جسے پسند کریں اختیار کرلیں۔

(۱) **بند کی صوفیانہ تعبیر**۔ کہتے ہیں کہ اے مخاطب! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو اس امتیاز کو نہیں سمجھ سکا جو خودی اور بیخودی میں پایا جاتا ہے۔ اس لئے تو اوہامِ باطلہ میں گرفتار ہو گیا۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ یہ ساری کائنات، انائے مطلق ہی کا ظہور ہے۔ مجھ میں، تجھ میں، ہر شئے میں وہی جلوہ گر ہے۔ اور جسے تو "ادراک" کہتا ہے۔ یہ اُسی نورِ مطلق کی ایک شعاع ہے اسی کی کارفرمائی (تجلیات) سے تو کبھی راحت محسوس کرتا ہے اور کبھی تجھ پر رنج و غم طاری ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ تو اُسی شانِ قیومیت

کی بدولت زندہ ہے۔ اگر اس کی تجلیات کا سلسلہ ایک سیکنڈ کے لاکھویں حصے کے لئے بھی رُک جائے تو ساری کائنات فنا ہو جائے۔

یہ جوہرِ نوری (انائے مطلق) بذاتِ خود واحد ہے۔ لاشریک ہے۔ یعنی اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ کیونکہ وہ واجب الوجود ہے۔ اور اس کے علاوہ اگر دوسرے کو بھی واجب الوجود تسلیم کیا جائے تو تعددِ وجباء لازم آجائے گا۔ اور تعددِ وجباء عقلاً محال ہے۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ اگر دو واجب فرض کئے جائیں تو جب تک ان میں امتیاز نہ ہوگا ان کو دو نہیں کہہ سکتے اور اگر ان میں امتیاز ہوگا تو ذات میں ترکیب لازم آجائے گی۔ یعنی دونوں مرکب ہوں گے۔ اور مرکب ترکیب سے پہلے موجود نہیں ہو سکتا۔ پس دونوں حادث ہو گئے۔ اور جو حادث ہوتا ہے، وہ قدیم نہیں ہو سکتا۔ اور جو قدیم نہیں وہ خدا کیسے ہوگا؟

اس لئے وہ واحد ہے، اور ایسا واحد ہے کہ اس میں دوئی کی گنجائش ہی نہیں نکل سکتی۔ یہ مطلب ہے، اس مصرع کا

ع واحدست و بر نمی تابد دوئی

میں اُسی تجلّی کی بدولت (جو مجھ میں ہو رہی ہے) میں ہوں۔ اور تو اُسی تجلّی کی بدولت تو ہے۔ اگر وہ نہ ہوتا، یا اس کی تجلّی نہ ہوتی۔ تو نہ میں ہوتا، نہ تو ہوتا۔ (نہ یہ کائنات ہوتی) اسی نکتہ کو اقبالؔ نے یوں واضح کیا ہے:۔

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں
کہ تُو مَیں نہیں اور مَیں تُو نہیں

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر
مگر ہر کہیں بیچگوں بے نظیر

یعنی انائے مطلق واحد ہے لیکن تعینات کی وجہ سے متکثر نظر آتا ہے۔

یہ انائے مطلق خویش دار ہے۔ خویش باز ہے اور خویش ساز ہے خویش دار ہے یعنی بذاتِ خود قائم ہے۔ اسے اپنے قیام کے لئے کسی دوسرے کی حاجت نہیں ہے۔ خویش باز ہے یعنی ہر دم اپنی ہی صفات کی جلوہ گری میں مشغول ہے۔ خویش ساز ہے یعنی اپنی ہی صفات کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ ان تینوں شئون سہ گانہ کا سبب یہ ہے کہ دوسرا تو موجود نہیں ہے۔

دو عالم میں نہیں موجود و مشہود
بجز ذات و صفات افعال و آثار

چونکہ دوسرا موجود نہیں ہے اس لئے وہ خود ہی اپنا عاشق ہے۔ اور خود ہی اپنا معشوق ہے۔ چونکہ وہ عاشق ہے، اس لئے اس میں نیاز کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اور چونکہ خود ہی معشوق ہے اس لئے اس میں ناز کا انداز بھی جلوہ گر ہے۔

ع ناز ہا می پرورد اندر نیاز

یہی جوہر نوری یا انائے مطلق جب تعینات کے پردوں میں ظاہر ہوتا ہے تو اسے انائے مقید کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور چونکہ انائے مقید کی اصل وہی انائے مطلق ہے، اس لئے ہر انائے مقید (شرر) کے دل میں انائے مطلق (شعلہ) کے حصول کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

انائے مطلق کی ذات میں آزادی اور پابندی دونوں شانیں جلوہ گر ہیں۔ اسی لئے اس کے جزو (انائے مقید) میں کل (انائے مطلق) کو اپنے اندر سمو لینے کی طاقت ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ اگر ذات باری کے لطون پر

نظر کی جائے تو وہ مطلق (آزاد) ہے۔ اور ظہور کو ملحوظ رکھا جائے تو وہ مقید (زنجیری) ہے[1]۔

یہ جوہرِ نوری (انائے مطلق) خوگرِ پیکار پیہم ہے یعنی اپنے وجود سے اغیار کے پیکر بناتا رہتا ہے، جو ہر وقت آپس میں متصادم رہتے ہیں۔

سازد از خود پیکرِ اغیار را
تا فزاید لذّتِ پیکار را

اور میں اُسی جوہرِ نوری کو خودی یا حیات سے تعبیر کرتا ہوں۔

یہاں تک اقبالؔ نے انائے مطلق کی تشریح کی ہے۔ اب اس کے بعد وہ یہ بتاتے ہیں کہ یہی انائے مطلق جب تعیّنات کے پردوں میں ظاہر ہوتا ہے، تو افراد کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ گویا یہاں سے اس پر خودی کا اطلاق ہونے لگتا ہے۔

کہتے ہیں کہ جب انائے مطلق، افراد کی شکل میں نمودار ہوتا ہے یعنی جب خلوت سے جلوت میں آتا ہے تو اس میں من و تو کا امتیاز پیدا ہو جاتا ہے (اس کی تشریح یہ ہے کہ

جب تک سالک (انائے مقید) مقاماتِ سلوک طے نہیں کرتا وہ انانیت

---

[1] اسی نکتہ کو ایک عارف نے یوں بیان کیا ہے:۔

ظہورش غازۂ تقییدِ آفاق
بطونش بے نیازِ بہائے اطلاق (بیدلؔ)

کے درجہ میں رہتا ہے۔ لیکن جب وہ ان مقامات کو طے کرنا شروع کرتا ہے، تو انائے مطلق کا تصور کرتا ہے۔ یعنی

ع نقش گیر اندر دلش "او" می شود

جب وہ "او" کے تصور میں مستغرق ہو جاتا ہے، تو اسے ہر شئے میں اُسی کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے۔

ع جدھر دیکھتا ہوں ادھر تُو ہی تُو ہے

یعنی "من زہم می ریزد و "تو" می شود" والا معاملہ ہو جاتا ہے۔

جب انائے مطلق، انائے مقید کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، تو تقیید کی وجہ سے اس میں شانِ جبر پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ انائے مقید اپنے حقیقی مقام (اختیار) کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے عشق کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ ابتدا میں سالک اپنا راستہ نوافل و اذکار کے ذریعہ سے طے کرتا ہے بعد ازیں محبت کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ اور یہ محبت اس انائے مقید کو انائے مطلق سے واصل کر دیتی ہے۔ یعنی اگرچہ اصل سے جدائی کے بعد انائے مقید میں شانِ جبر پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اسی شان کی بدولت اس میں محبت کا رنگ پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ محبت اس نقصان کی تلافی کر دیتی ہے۔

ع از محبت مایہ دارش می کند

شیخ سعدیؒ نے اسی مضمون کو یوں بیان کیا ہے:۔

بپائے طلب رہ بدینجا بری
وز ینجا بہ بالِ محبت پری

یعنی معشوقِ حقیقی کی طلب میں سالک پہلے ریاضت اور مجاہدہ سے مقامات طے کرتا ہے۔ پھر مقامِ عشق پر پہنچ کر اپنا راستہ محبت کے بازوں سے طے کرتا ہے۔۔یعنی سعدیؒ کا یہ شعر اقبالؔ کے اس مصرع کی شرح ہے۔

انائے مطلق کی شان یہ ہے کہ وہ خود ہی عاشق اور خود ہی معشوق ہوتا ہے۔ یعنی نازہا می پرورد اندر نیاز۔ لیکن جب وہ مقید ہو جاتا ہے تو پھر اس کو جماعت کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ تاکہ وہ افراد سے محبت کر سکے۔

اس نکتہ کی اصل اہلِ تصوف کا یہ مقولہ ہے کہ جب تک سالک کو عرفانِ حقیقی حاصل نہیں ہوتا، وہ خالق کا بندہ رہتا ہے۔ لیکن جب اسے عرفانِ حقیقی حاصل ہو جاتا ہے، یعنی جب یہ حقیقت اس پر منکشف ہو جاتی ہے کہ تمام مخلوقات (بنی آدم) اُسی خالقِ اکبر کے مظاہر ہیں، تو وہ مخلوقات (جماعت) کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔

اسی لئے سعدیؒ نے کہا ہے:۔

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

جب سالک پر یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ وہی ذاتِ واحد مختلف اشکال میں جلوہ گر ہے، تو وہ "خودشکن" بن جاتا ہے۔ یعنی اپنے آپ کو جماعت کی محبت میں فنا کر دیتا ہے، نہ اس لئے کہ اسے افراد سے محبت ہوتی ہے، بلکہ اس لئے کہ افراد، مظاہرِ ذاتِ باری ہیں۔ وہ ہر فرد میں اُسی کا جلوہ دیکھتا ہے، اس لئے خودی سے نکل کر بیخودی کی منزل میں آجاتا ہے۔ یعنی جماعت کی خدمت

کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ اپنے آپ کو جماعتی زندگی میں گم کر کے وہ اپنی خودی کے تقاضوں سے قطع نظر کر لیتا ہے (ایسا کرنا لازمی ہے) لیکن اسی خود شکنی کی بدولت وہ گلبرگ سے چمن بن جاتا ہے۔ یعنی اس میں پوری قوم کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی اس کی خودی مرتبۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ فرد جب تک فرد رہتا ہے اور جماعت سے وابستہ نہیں ہوتا، اُس وقت تک وہ مقامِ انانیت میں رہتا ہے۔ یہ "من" کی منزل ہے۔ اس کے بعد دوسری منزل یہ ہے کہ وہ خالق سے محبت کرتا ہے۔ اور اس کے تصور میں مستغرق ہو جاتا ہے۔ یہ "او" کی منزل ہے۔ اس کے بعد تیسری منزل آتی ہے جب اس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ مخلوقات، مظاہرِ ذاتِ باری ہیں۔ اس لئے وہ ان سے محبت کرنے لگتا ہے۔ یہ "تو" کی منزل ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ فرد کے لئے ملت سے رابطہ اس لئے ضروری ہے کہ ملت تو خود ذاتِ واحد (انائے مطلق) ہی کی دوسری شکل ہے، افراد بظاہر مختلف ہیں لیکن سب میں وہی جوہرِ نوری جلوہ گر ہے۔ یا یوں سمجھو کہ فرد اور ملت دونوں میں وہی ذاتِ واحد جلوہ گر ہے۔ پس فرد کو چاہیئے کہ اپنے آپ کو ملت میں گم کر دے، تاکہ اس کی خودی پایۂ تکمیل کو پہنچ سکے۔ جب تک انسان انانیت اور خود غرضی کی زندگی کو ترک کر کے ملی یا اجتماعی زندگی بسر نہیں کرے گا۔ وہ اپنے مقام کو حاصل نہیں کر سکتا۔ یعنی جب خودی کو ترک کر دو گے اور بیخودی کو اختیار کر لو گے تو تمہارے اندر انائے مطلق کا رنگ پیدا ہو جائے گا۔ اور یہی مقصدِ حیات ہے۔ اسی نکتہ کو شاعر نے یوں ادا کیا ہے:-

چاک کن جامۂ ہستی کہ شود او پیدا
تا گریباں ندرد گل نہ کند بو پیدا

(ب) فلسفیانہ تعبیر:- (۱) کہتے ہیں کہ اے مخاطب! چونکہ تو نے خودی، اور بیخودی میں امتیاز نہیں کیا۔ اسی لئے تو غلط خیالات کا شکار ہو گیا اور اصل حقیقت تک نہ پہنچ سکا۔ یاد رکھ! خودی اور چیز ہے، بیخودی اور چیز ہے۔

(۲) خودی کیا ہے؟ یہ ایک جوہرِ نوری ہے جسے حکما اپنی اصطلاح میں نفسِ ناطقہ کہتے ہیں۔ اور تیرے اندر یہ جو قوتِ ادراک (عقل) پائی جاتی ہے یہ اسی جوہرِ نوری کی ایک شعاع ہے۔ ورنہ انسان کا جسم تو مادی ہے، اس میں یہ قوت کس طرح پیدا ہو سکتی تھی؟

(۳) اس کے عیش پر تیرا عیش منحصر ہے۔ یعنی جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مثلاً زید خوش ہے، تو در اصل وہ جوہرِ نوری خوش ہوتا ہے۔ اور اس کی خوشی سے زید بھی متاثر ہو جاتا ہے۔ وگرنہ زید تو ایک مشتِ خاک ہے۔ چنانچہ جب وہ جوہرِ نوری اپنا تعلق، جسمِ زید سے منقطع کر لیتا ہے، تو زید محض ایک تودۂ خاک رہ جاتا ہے۔ اسی طرح جب وہ غمگین ہوتا ہے تو تجھ پر بھی غم کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے مختصر یہ کہ تو اُسی جوہرِ نوری کے انقلابِ پیہم کی بدولت زندہ ہے۔

نوٹ:- وہ جوہرِ نوری کوئی ساکن یا جامد شئے نہیں ہے۔ بلکہ اس میں زندگی اور حرکت ہے اس لئے وہ ہر دم متغیر اور منقلب ہے۔ اور انسان اسی انقلاب کی بدولت زندہ کہلاتا ہے۔

(۴) ہر فرد کی خودی "واحد" ہے اور دوئی کو برداشت نہیں کر سکتی میں اسی کی چمک

دمک کی بدولت ئیں ہوں۔ اور تو اسی کی تب و تاب کی بدولت تو ہے۔ یعنی اس کی وحدت کی بنا پر ہر فرد میں انفرادیت کی شان پائی جاتی ہے۔ چنانچہ کوئی فرد اپنے آپ کو دوسرے کا عین نہیں سمجھتا بلکہ ہمیشہ اپنی جداگانہ ہستی (انفرادیت) کو برقرار رکھنے کے لئے کوشاں رہتا ہے۔

(۵) اس جوہر نوری یعنی خودی کی صفات حسب ذیل ہیں:۔

(ا) وہ خویش دار ہے یعنی وہ اپنے وجود کے لئے دوسروں کی محتاج نہیں ہے۔

(ب) وہ خویش باز ہے یعنی وہ اپنی توجہ اپنی ہی ذاتی صلاحیتوں پر مرکوز رکھتی ہے۔

(ج) وہ خویش ساز ہے یعنی وہ اپنی ذات سے موافقت کرنے کی قابلیت رکھتی ہے۔

(د) اس کے نیاز میں بھی ناز کا رنگ پوشیدہ ہے۔ یعنی اگر وہ بعض امور میں دوسروں کے تعاون کی محتاج ہے تو بعض امور میں دوسرے افراد اس کے محتاج ہیں۔

(۶) اُس میں کائنات کی تسخیر کا جذبہ (سوز) پنہاں ہے اور اسی لئے جو آتش اُس کے سوز سے پیدا ہوتی ہے، وہ اس قدر قوی ہوتی ہے کہ اس کا شرر بھی شعلہ کو مسخر کر سکتا ہے۔

(۷) خودی کی فطرت میں دونوں شانیں مضمر ہیں، وہ آزاد بھی ہے، اور مقید بھی ہے۔ اور اس کے جزو میں رکل، کو مسخر کرنے کی قوت پوشیدہ ہے۔ یعنی اگر انائے مقید اپنے اندر طاقت پیدا کر لے تو انائے مطلق کو آغوش میں لے سکتا ہے۔

(۸) کہتے ہیں کہ خودی ہر وقت مصروف پیکار رہتی ہے۔

سازد از خود پیکرِ اغیار را

تا فزاید لذتِ پیکار را (اسرارِ خودی)

(۹) جب خودی خلوت سے نکل کر جلوت میں آتی ہے یعنی جب فردا پنی
(۱۰) انفرادیت کے دائرہ سے نکل کر جماعت سے رابطہ استوار کرتا ہے، تو اس کے اندر "من" یعنی خود غرضی کی جگہ "او" اور "تو" یعنی ایثار کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ پہلے وہ خود بین تھا۔ یعنی اپنی ہی ذات یا شخصیت کی بہبود کا آرزومند رہتا تھا۔ لیکن جماعت سے مربوط ہو جانے کے بعد وہ دوسروں کی بہبود کا آرزومند بن جاتا ہے۔ یعنی اس میں ایثار کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔

(۱۱) جب فرد اپنے آپ کو جماعت کے قوانین کا پابند بناتا ہے۔ اور اپنے مفاد کو جماعت کے مفاد پر قربان کرتا ہے، تو اس کے اندر اختیار کے بجائے جبر کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب جماعت اُسے یہ حکم دیتی ہے کہ جاڑوں کی رات میں سرحد کی حفاظت کرو۔ تو وہ اپنی مرضی یا اپنے اختیار سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ اپنی مرضی کو جماعت کی مرضی کے تابع بنا دیتا ہے۔ لیکن اگر وہ ایک نعمت (اختیار) سے محروم ہو جاتا ہے تو اُس کی بجائے اُسے دوسری نعمت نصیب ہو جاتی ہے۔ یعنی اس میں قوم کی محبت کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔

(۱۲) حقیقت یہ ہے کہ فرد جب تک انفرادی زندگی بسر کرتا ہے (جسے اقبال نے لفظ ناز سے تعبیر کیا ہے) اس وقت تک اس میں ایثار اور قربانی (نیاز) کا مادہ پیدا نہیں ہو سکتا لیکن جب بہت سے افراد اپنے آپ کو ملت کے قوانین کا پابند بنا لیتے ہیں تو ان کے اندر ایثار (نیاز) کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

(۱۳) جماعت سے وابستہ ہو کر خودی اپنی انفرادیت کو جماعت میں گم کر دیتی ہے (اسے اقبال نے خودشکنی سے تعبیر کیا ہے) لیکن اس کا ثمرہ اسے یہ ملتا ہے کہ وہ

ادنیٰ حیثیت (گلبرگ) سے ترقی کر کے بلند مقام (چمن) پر فائز ہو جاتی ہے۔
اسی خود شکنی کو اقبالؔ نے "بیخودی" سے تعبیر کیا ہے۔

(۱۲) بیخودی کا مفہوم واضح کرنے کے بعد اقبالؔ کہتے ہیں کہ جو نکتے میں نے بیان کئے ہیں وہ بہت دقیق ہیں، اس لئے صرف اربابِ بینش ان کو سمجھ سکتے ہیں۔
عامۃ الناس انہیں نہ سمجھ سکیں تو معذوری ہے۔ میں ان کو سمجھانے کے لئے اس سے زیادہ وضاحت نہیں کر سکتا۔

در معنیٔ ایں کہ ملّت از اختلاطِ افراد پیدا می شود

ملّت افراد کے اختلاط سے پیدا ہوتی ہے اور

و تکمیل تربیت او از نبوّت است

نبوّت سے پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے ،

از چہ رو بربستہ ربطِ مردم است / رشتۂ ایں داستاں سر در گم است

در جماعت فرد را بینیم ما / از چمن او را چو گل چینیم ما

فطرتش وارفتۂ یکتائی است / حفظِ او از انجمن آرائی است

سوزدش در شاہراہِ زندگی / آتشِ آوردگاہِ زندگی (۱)

مردماں خوگر بیک دیگر شوند / سفتہ در یک رشتہ چوں گوہر شوند

در نبردِ زندگی یارِ ہم اند / مثلِ ہمکاراں گرفتارِ ہم اند

محفلِ انجم ز جذبِ باہم است / ہستی کوکب ز کوکب محکم است

خیمہ گاہِ کارواں کوہ و جبل / مرغزار و دامنِ صحرا و تل

سست و بیجاں تار و پودِ کارِ او / ناکشودہ غنچۂ پندارِ او

سازِ برق آہنگِ او ناسوختہ / نغمہ اش در پردہ ناپرداختہ

گوشمالِ جستجو ناخوردہ / زخمہ ہائے آرزو ناخوردہ

(۱) آوردگاہ : جنگ

نابساماں محفلِ نوزادہ اش — می تواں با پنبہ چیدن بادہ اش

نو دمیدہ سبزۂ خاکش ہنوز — سرد خوں اندر رگِ تاکش ہنوز

منزلِ دیو و پری اندیشہ اش — از گمانِ خود رمیدن پیشہ اش

تنگ میداں ہستیِ خامش ہنوز — فکرِ او زیرِ لبِ بامش ہنوز

ہیم جاں سرمایۂ آب و گلش — ہم ز بادِ تند می لرزد دلش

جانِ او از سخت کوشی رم زند — پنجہ در دامانِ فطرت کم زند

ہرچہ از خود می دمد بردارد دلش — ہرچہ از بالا فتد بردارد دلش

تا خدا صاحبدلے پیدا کند — کو ز حرفے دفترے املا کند

سازپردازے کہ از آوازۂ (۱) — خاک را بخشد حیاتِ تازۂ

ذرۂ بے مایہ ضو گیرد ازو — ہر متاعے ارجِ نو گیرد ازو

زندہ از یک دم دو صد پیکر کند — محفلے رنگیں ز یک ساغر کند

دیدۂ او می کشد لب جاں دہد — تا دوئی میرد یکی پیدا شود

رشتہ اش کو بر فلک دارد سرے — بارہائے زندگی راہیگرے

تازہ اندازِ نظر پیدا کند — گلستاں در دشت و در پیدا کند

از تفِ او ملتے مثلِ سپند — بر جہد شور افگن و ہنگامہ بند

یک شرر می افگند اندر دلش — شعلۂ درگیر می گردد گلش

نقشِ پایش خاک را بینا کند — ذرہ را چشمک زنِ سینا کند

---

(۱) آوازہ: اصطلاحِ موسیقی۔ وہ نوا جو دو مقام سے ترکیب پائے۔ تلمیح ہے دین و دنیا کی طرف ۱۲

عقلِ عریاں را دہد پیرایہ | بخشد ایں بے مایہ را سرمایہ
دامنِ خود می زند بر اخگرش | ہر چہ غش باشد رباید از زرش
بندہا از پا کشاید بندہ را | از خداوندان رباید بندہ را
گویدش تو بندۂ دیگر نۂ | زیں بتانِ بے زباں کمتر نۂ
تا سوئے یک مدعائش می کشد | حلقۂ آئیں بپایش می کشد

نکتۂ توحید باز آموزدش
رسم د آئینِ نیاز آموزدش

(فصل دوم)

اقبال نے اس فصل میں پہلے تین شعر بطور تمہید لکھے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے پاس ابتدائی دور کے انسانوں کی تاریخ محفوظ نہیں ہے۔ اس لئے یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ لوگوں میں ربطِ باہمی کس طرح پیدا ہوا۔ ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اس زمانے کے افراد میں قومیت کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔ لوگ عموماً انفرادی زندگی بسر کرتے تھے۔ خود انسان کی فطرت پر نگاہ کی جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ انفرادیت کی طرف مائل ہے۔ لیکن اس کی انفرادیت کی حفاظت صرف انجمن آرائی یعنی مل جل کر رہنے سے ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد "ہر چہ از خود می دمد بر دارد ش" تک انہوں نے، انسانوں کی ابتدائی حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ ہر شخص فطرتاً یکتائی کا دلدادہ ہے۔ یعنی ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ میں سب سے بڑھ چڑھ کر رہوں۔

لیکن ہر شخص کو زندگی میں ہر قدم پر اس قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ کوئی شخص دوسروں سے بے نیاز ہو کر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس لئے

ہر دماں خو گر بیکدیگر شوند

یعنی لوگ ایک دوسرے سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ابتدائی دور میں ایسا ہی ہوا کہ رفتہ رفتہ مل جل کر رہنے لگے۔ بعد ازاں انہوں نے قبیلوں کی شکل میں پہاڑوں کے دامنوں، صحراؤں اور میدانوں میں بود و باش اختیار کی۔

اس دور میں ان کی حالت یہ تھی کہ وہ تمدن سے ناآشنا اور تہذیب سے بیگانہ تھے۔ ان کی عقل و فہم بھی ابتدائی حالت میں تھی۔ اسی لئے ان کے دل میں نہ کوئی آرزو پیدا ہوتی تھی۔ اور نہ وہ کسی بات کی جستجو کرتے تھے بالکل حیوانوں کی سی زندگی تھی۔

نابساماں محفلِ نوزادہ اش

یعنی ان کی جماعتی زندگی جو نوزائیدہ تھی، ہر قسم کے ساز و سامان سے محروم تھی اور وہ معیشت و معاشرت کے لوازمات سے بالکل ناواقف تھے۔

ان کے دماغوں میں ہر وقت دیو، بھوت اور پریوں کا تصور کارفرما تھا، اور انہیں اپنے خیالات پر مطلق اعتماد نہ تھا۔ وہ غور و فکر سے بالکل ناآشنا تھے۔ اسی لئے فطرت کے تمام مظاہر سے لرزہ براندام رہتے تھے۔ ان میں جد و جہد کا مادہ بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ یعنی نہ وہ کاشتکاری سے آگاہ تھے نہ باغبانی سے۔ خود رو اشیاء پر گزارہ کرتے تھے۔

جب وہ لوگ کچھ مہذب ہو گئے، تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی بعثت کا سلسلہ

شروع کیا، جس کی وجہ سے ان کی زندگی میں انقلاب پیدا ہو گیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ نبی میں یہ قدرت ہوتی ہے کہ وہ اپنی تعلیم (آوازہ) سے مُردوں کو زندہ کر دیتا ہے۔ اُس کی نگاہ میں جذب کی قوت ہوتی ہے۔ یعنی وہ لوگوں کو اپنی طرف مائل کر سکتا ہے اور اس کی تقریر میں یہ تاثیر ہوتی ہے کہ انسانوں میں رُوحانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ان صفات کی بدولت وہ منتشر افراد میں وحدت کا رنگ پیدا کر دیتا ہے۔ اور جو لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں، وہ سب ایک قوم بن جاتے ہیں۔ یعنی وہ وحی کی طاقت سے مختلف افراد کو باہم مربوط کر دیتا ہے۔

نبی میں یہ قوت ہوتی ہے کہ وہ اپنی قوم کے زاویۂ نگاہ میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ اور اس کے فیضِ صحبت سے قوم کے افراد ترقی کی راہ پر گامزن ہو جاتے ہیں۔

وہ انسانوں کی عقل و خرد کی اصلاح بھی کرتا ہے۔ یعنی غلط عقائد اور افکار کا ازالہ کر کے ان کو صحیح علم عطا کر دیتا ہے۔

"عقلِ عُریاں" سے اقبالؔ کی مراد ہے، وہ عقل جو وحی کی روشنی سے محروم ہو۔ نبی کا ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ انسانوں کو عقل کی خامیوں سے آگاہ کر دیتا ہے۔

پیامِ مشرق میں اقبالؔ نے اس شعر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے:۔

نقشے کہ بستۂ ہمہ اوہام باطل است
عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

کہتے ہیں کہ نبی کا ایک کام یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم کے افراد کو انسانوں کی غلامی سے آزادی عطا کرتا ہے اور ان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ اے انسان! تو کسی دوسرے انسان کا غلام نہیں ہے۔ اس لئے کسی انسان یا کسی بت کے سامنے سرِ تسلیم خم

مت کر۔ غلامی اور بت پرستی دونوں یکساں طور پر مذموم ہیں۔

قصہ مختصر یہ ہے کہ نبی اپنی قوم کے افراد میں ایک نگاہ پیدا کر دیتا ہے اور سب کو آئینِ خداوندی کا پابند بنا دیتا ہے۔ یہ یک نگاہی نکتۂ توحید سے پیدا ہو سکتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی قوم کو توحید کا درس دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت (اطاعت) مت کرو۔

نوٹ:۔ اقبالؔ کا نظریہ یہ ہے کہ قوم کی بنیاد مذہب ہے نہ کہ وطن یا نسل یا رنگ یا زبان یا جغرافیائی حدود۔ ۱۲

ارکانِ اساسی ملّیہ اسلامیہ

دینِ اسلام کے بنیادی ارکان

رُکنِ اوّل

توحید

در جہانِ کیف و کم گردید عقل
پے بہ منزل بُرد از توحید عقل

ورنہ ایں بیچارہ را منزل کجاست
کشتیٔ ادراک را ساحل کجاست

اہلِ حق را رمزِ توحید از بر است
(۱) در اٰتی الرَّحمٰنِ عَبدًا مضمر است

تا ز اسرارِ تو بنماید تُرا
امتحانش از عمل باید تُرا

دیں ازو حکمت ازو آئیں ازو
زور ازو قوّت ازو تمکیں ازو

عالماں را جلوہ اش حیرت دہد
عاشقاں را بر عمل قدرت دہد

پست اندر سایہ اش گردد بلند
خاک چوں اکسیر گردد ارجمند

قدرتِ او برگزیند بندہ را
نوعِ دیگر آفریند بندہ را

---

(۱) اِن کُلُّ مَن فِی السَّمٰوٰتِ وَالاَرضِ اِلَّا اٰتِی الرَّحمٰنِ عَبدًا (آیہ شریفہ)

در رہِ حق تیز تر گردد تگش — گرم تر از برق خوں اندر رگش
بیم و شک میرد، عمل گیرد حیات — چشم می بیند ضمیرِ کائنات

چوں مقامِ عبدہٗ محکم شود
کاسۂ دریوزہ جامِ جم شود

ملتِ بیضا تن و جاں لا الٰہ — سازِ ما را پردہ گرداں لا الٰہ
لا الٰہ سرمایۂ اسرارِ ما — رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما
حرفش از لب چوں بدل آید ہمے — زندگی را قوت افزاید ہمے
نقشِ او گر سنگ گیرد دل شود — دل گر از یادش نسوزد گِل شود
چوں دل از سوزِ غمش افروختیم — خرمنِ امکاں زآہے سوختیم
آبِ دلہا در میانِ سینہ ہا — سوزِ او بگداخت ایں آئینہ ہا
شعلہ اش چوں لالہ در رگہائے ما — نیست غیر از داغِ او کالائے ما
اسود از توحید احمر می شود — خویشِ فاروقؓ و ابوذرؓ می شود
دل مقامِ خویشی و بیگانگی است — شوق را مستی ز ہم پیمانگی است
ملت از یک رنگیٔ دلہاستے — روشن از یک جلوہ ایں سیناستے
قوم را اندیشہ ہا باید یکے — در ضمیرش مدعا باید یکے
جذبہ باید در سرشتِ او یکے — ہم عیارِ خوب و زشتِ او یکے
گر نباشد سوزِ حق در سازِ فکر — نیست ممکن ایں چنیں اندازِ فکر
ما مسلمانیم و اولادِ خلیلؑ (۱) — از ابیکم گیر اگر خواہی دلیل

---

(۱) مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰھِیْمَ (آیہ شریفہ)

باوطن وابستہ تقدیرِ امم — بر نسب بنیاد تعمیرِ امم
اصلِ ملّت در وطن دیدن کہ چہ — باد و آب و گِل پرستیدن کہ چہ
بر نسب نازاں شدن نادانی است — حکمِ او اندر تن و تن فانی است
ملّتِ ما را اساسِ دیگر است — ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است
حاضریم و دل بغائب بستہ ایم — پس ز بندِ ایں و آں وارستہ ایم
رشتۂ ایں قوم مثلِ انجم است — چوں نگہ ہم از نگاہِ ما گم است
تیرِ خوش پیکانِ یک کیشیم ما — یک نما یک بیں یک اندیشیم ما
مدعائے ما مآلِ ما یکیست — طرز و اندازِ خیالِ ما یکیست

ما ز نعمتہائے او اخواں شدیم
یک زبان و یک دل و یکجاں شدیم

(فصل سوم)
توحیدِ الٰہی

تمہید:۔ اس فصل میں دو بند ہیں۔ پہلے بند میں اقبال نے حسبِ ذیل امور کی تشریح کی ہے:۔

(۱) توحید اور عقل

(۲) توحید اور اہلِ حق

(۳) توحید اور فرد

اس بند کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اشعار میں انتہائی درجہ کی بلاغت پائی

جاتی ہے۔ یعنی شاعر نے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ اس لئے میں ہر شعر کی شرح لکھوں گا:۔

پہلا اور دوسرا شعر:۔ کہتے ہیں کہ جب انسان میں غور و فکر کا مادہ اور حقیقت کی جستجو کا جذبہ پیدا ہوا تو سب سے بڑا سوال جو اس کے سامنے آیا وہ یہ تھا کہ یہ کائنات جو میری نظر کے سامنے ہے خود بخود پیدا ہو گئی یا اس کو کسی نے پیدا کیا ہے؟ بالفاظِ دگر، صانعِ عالم کون ہے؟ اس سوال پر ہر زمانہ میں حکماء اور عقلاء نے غور کیا ہے اور اب تک حکمائے عالم نے اس سوال کے حسب ذیل جوابات دیئے ہیں:۔

(۱) بعض نے یہ کہا کہ ہماری عقل اس سوال کا کوئی جواب نہیں دے سکتی۔ یہ مسلک لاادریت کہلاتا ہے۔ [۱]

(ب) بعض نے یہ کہا کہ کوئی ایسی ہستی عقلاً ثابت نہیں ہو سکتی جسے صانع عالم کہہ سکیں۔ اسے عرفِ عام میں دہریت یا الحاد کہتے ہیں [۲]

(ج) بعض نے یہ کہا کہ صانع عالم ہے۔ لیکن اس کی تعبیر میں اختلاف پیدا ہو گیا:

(۱) بعض نے یہ کہا کہ صانع عالم صرف مادہ ہے جو ازلی اور ابدی ہے ان کو مادہ

---

[۱] لاادری کے معنی ہیں، "میں نہیں جانتا"

[۲] چونکہ منکرینِ خدا کا خیال یہ تھا کہ دہر (زمانہ) ہی ہمارا خالق ہے وہی مارتا ہے اور وہی جلاتا ہے اس لئے انہیں دہری کہنے لگے۔

پرست کہا جاتا ہے۔

(۲) بعض نے یہ کہا کہ روح اور مادہ دونوں صانع عالم ہیں اور دونوں ازلی اور ابدی ہیں۔ چنانچہ جین مت اور سانکھیہ درشن اسی مسلک کے علمبردار ہیں۔

(۵) بعض نے کہا کہ صانعِ عالم خدا ہے، لیکن اس مسلک میں بھی چار گروہ پیدا ہو گئے۔

(۱) ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ کل خدا ۳۳ ہیں۔ گیارہ دھرتی میں، گیارہ دھرتی اور آکاش کے درمیان، اور گیارہ آکاش کے اوپر۔ یہ لوگ ویدک دھرم کے پیرو ہیں۔

(ب) دوسرے گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا تین ہیں۔ باپ، بیٹا، اور روح القدس، اور یہ تینوں مل کر ایک ہیں۔ اسے اصطلاح میں تثلیث، فی التوحید اور توحید فی التثلیث کہتے ہیں۔ یہ لوگ نصاریٰ کہلاتے ہیں۔

(ج) تیسرے گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا دو ہیں۔ یزداں، خالقِ خیر ہے اور اہرمن، خالقِ شر ہے۔ یہ لوگ مجوسی کہلاتے ہیں۔

(د) چوتھا گروہ یہ کہتا ہے کہ خدا ایک ہے۔ نہ اس کا کوئی شریک ہے نہ مدِمقابل ہے نہ ہمسر ہے۔ اقبالؔ کی رائے میں صرف یہی گروہ راہ راست پر ہے۔

پہلا شعر :- کہتے ہیں کہ عقل نے اپنی بساط کے مطابق بہت کچھ کوشش کی کہ حقیقت کا علم حاصل کرے یعنی اس بات کا پتہ لگائے کہ صانع عالم کون ہے، لیکن اسے کامیابی نہ ہو سکی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اسے اپنی توحید کا صحیح علم عطا فرمایا۔ یعنی انسانی عقل، توحید کی بدولت منزلِ مقصود تک پہنچی۔ اگر

اُسے توحیدِ الٰہی کا صحیح علم حاصل نہ ہوتا، یا اگر قرآنِ حکیم کی توحید کا صحیح علم عطا نہ کرتا تو وہ اپنی کوشش سے کبھی قیامت تک اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ اقبالؔ نے عقل کو "بیچارہ" لکھا ہے۔ اس سے عقل کی عاجزی اور درماندگی کا اظہار مقصود ہے۔ چنانچہ فلسفہ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ عقلِ مجرد، جب تک وحیٔ الٰہی سے روشنی حاصل نہ کرے۔ کسی فلسفیانہ سوال کا صحیح یا تسلی بخش جواب نہیں دے سکتی۔

ادراک منطق میں عقل کے فعل کو کہتے ہیں۔ ادراک کی کشتی کو ساحل نہیں مل سکتا یعنی مجرد عقل اپنی کوشش سے صحیح علم حاصل نہیں کر سکتی۔

شعر ۳:- اہلِ حق سے انبیاء کے سچے پیرو مراد ہیں اور رمزِ توحید کا مطلب ہے توحیدِ حقیقی کا مفہوم۔ دوسرے مصرع میں اس آیت کی طرف اشارہ ہے:-

إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ إِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ؕ

آسمانوں اور زمین میں کوئی شخص نہیں ہے۔ مگر یہ کہ وہ (قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ کے سامنے (ایک عاجز) بندے کی حیثیت میں حاضر ہوگا۔ (۱۹ : ۹۳)

اس آیت میں لفظ "آتی" اسمِ فاعل ہے۔ لیکن شاعر نے ضرورتِ شعری کی بنا پر "آتی" بمعنی ماضی لکھ دیا ہے۔

حاشیہ:- جہانِ کیف و کم سے مادی دنیا مراد ہے جس میں ہم لوگ رہتے ہیں۔ کیف و کم۔ ارسطو کے وضع کردہ مقولاتِ عشر میں سے دو بہت مشہور مقولے ہیں۔ کیف بمعنی کیسا اور کم بمعنی کتنا۔

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ قرآنِ حکیم پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ توحیدِ الٰہی کے حقیقی مفہوم سے آگاہ ہیں کہ اس دنیا میں تو یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص اللہ کی ہستی اور اس کی وحدانیت کا انکار کر دے لیکن قیامت کے دن ہر شخص اس کا بندہ بن کر ہی اس کے سامنے حاضر ہوگا۔

اہلِ حق نے چونکہ اس تکوینی نظریہ کو انبیاءؑ کی تعلیم سے ذہن نشین کر لیا ہے۔ اس لئے وہ تشریعی طور پر بھی توحید کے قائل ہو گئے ہیں۔

تکوین اور تشریع دونوں شرعی اصطلاحیں ہیں۔ امورِ تکوینی میں مامور کو مطلق اختیار نہیں ہوتا۔ امر تکوینی کی تعمیل ضرور کرنی پڑتی ہے۔ لیکن امور تشریعی میں مامور کو اختیار حاصل ہوتا ہے۔ خواہ حکم کی تعمیل کرے یا نہ کرے۔ اس کی مثال یہ ہے:۔

(۱) کُوْنُوْا قِرَدَۃً خَاسِئِیْنَ (ہم نے حکم دیا کہ) ذلیل بندر بن جاؤ۔

نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ جن کو حکم دیا گیا تھا، فوراً بندر بن گئے۔ کیونکہ یہ حکم تکوینی تھا۔

(۲) اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ (ہم نے حکم دیا کہ) نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر لوگ اس حکم کی تعمیل نہیں کرتے۔ سبب یہ ہے کہ یہ حکم تشریعی ہے۔

آیتِ مذکورہ بالا میں تکوین کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔ یعنی قیامت کے دن ہر شخص بندہ ہی بن کر حاضر ہوگا۔ کسی کو سرتابی کی مجال نہ ہوگی۔ چنانچہ فرعون اور ابوجہل اور تمام منکرین بندوں ہی کی حیثیت میں حاضر ہوں گے۔

اہلِ حق نے یہ تعلیم انبیاءؑ سے حاصل کی ہے۔ یعنی جس توحید کا مظاہرہ

قیامت میں موافق اور مخالف، مومن اور منکر دونوں کریں گے۔ اہلِ حق اس توحید کا اقرار انبیاء کی تعلیم کی بدولت دنیا میں بھی کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کی عقل کو دنیا ہی میں حقیقی روشنی حاصل ہو جاتی ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ عقل حقیقت کی جویا ہے اور یہی اس کی منزل ہے۔ چنانچہ حکماء نے فلسفہ کی تعریف ہی یہ کی ہے کہ فلسفہ نام ہے حصولِ علم حقائقِ اشیاء بقدرِ طاقتِ بشری۔ اور اقبالؔ نے بھی پہلے شعر میں اسی نکتہ کو واضح کیا ہے کہ " پے بمنزل بُرد از توحیدِ عقل "، یعنی عقل کی منزل ہے عرفانِ حقیقت، بقدرِ طاقتِ بشری۔ اگر توحید، عقل کی رہنمائی نہ کرتی تو وہ کبھی منزل مقصود تک نہ پہنچتی۔ مثلاً اگر عقل، صانع عالم یعنی اللہ تعالیٰ کی ہستی کا اقرار نہ کرے تو یقیناً ثنویت یا تعددِ الٰہ کے غلط عقیدہ میں مبتلا ہو جائے گی اور حقیقت چونکہ ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتی، اس لئے عقل کو صحیح علم کبھی ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ عقل، کائنات کی اشیاء کا عرفان حاصل کرنا چاہتی ہے لیکن یہ عرفان صرف توحید سے حاصل ہو سکتا ہے پس جب عقل کو صحیح معنیٰ میں توحید کا علم حاصل ہوگا جو معرفتِ الٰہی کا اعلیٰ مرتبہ ہے، تو اُسے ساری کائنات کا علم حاصل ہو جائے گا۔

یوں تو عقل کو توحید کا علم تکوینی طور پر قیامت میں ضرور حاصل ہو جائے گا۔ لیکن اہلِ حق نے انبیاء کی تعلیمات کی بدولت دنیا میں بھی اس حقیقت کو حاصل کر لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ نے اس آیت شریفہ کو اپنا مستدل بنایا ہے۔

شعر ۴:۔ تا ز اسرارِ تو بنماید ترا
امتحانش از عمل باید ترا

چونکہ یہ شعر اسرار اور رموز دونوں کتابوں کی جان ہے، بلکہ اقبال نے ۱۹۱۴ء سے تا دمِ وفات اپنی ساری زندگی ۱۹۳۸ء اسی نکتہ کی وضاحت اور اشاعت میں بسر کردی، اس لئے خلافِ معمول میں نے اس شعر کو اپنی شرح میں نقل کردیا ہے۔ اگر ناظرین اس شعر کو سمجھ لیں تو وہ فلسفۂ اقبال کے علاوہ روحِ اسلام سے بھی آگاہ ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ اقبال کا فلسفہ اسلام سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتا۔

شعر کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ اے مخاطب! تجھے لازم ہے کہ تو اپنے عمل سے توحید (کی خوبیوں) کا امتحان کرے۔ تاکہ وہ تجھے تیری شخصیت کے اسرار (مخفی صلاحیتوں) سے آگاہ کردے۔

مطلب یہ ہے کہ اے مخاطب! اگر تو حقیقی معنی میں موحّد بن جائے۔ اگر تو اپنے عمل سے اپنے عقیدۂ توحید کو واضح کردے۔ تو میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ تو نائبِ حق کے درجہ پر فائز ہوجائے گا، اور نائبِ حق اس کائنات پر حکمراں ہوتا ہے:۔

نائبِ حق در جہاں بودن خوش است
بر عناصر حکمراں بودن خوش است

اقبال نے اس موضوع پر اس قدر لکھا ہے کہ اگر اسے ایک جگہ جمع کیا جائے تو بلا مبالغہ کئی سو صفحات مرتب ہو سکتے ہیں، چونکہ یہ کتاب اس تشریح کی متحمل نہیں ہو سکتی، اس لئے مجبوراً چند اشارات پر اکتفا کروں گا۔

اس شعر میں اقبال نے تین باتیں بیان کی ہیں:۔

(ا) اثباتِ توحیدِ الٰہی۔

(ب) امتحانِ توحید بذریعۂ عمل۔

(ج) انکشافِ اسرارِ خودی۔

واضح ہو کہ عرفا نے توحید کے دس مراتب بیان کئے ہیں، ان میں سے چھ مراتب جو آسان تر ہیں، ذیل میں لکھتا ہوں :۔

پہلا مرتبہ، یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ ساری کائنات میں اللہ کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں ہے۔ یعنی کوئی ہستی اس کی ذات میں شریک نہیں ہے۔ کلمۂ طیبہ کا پہلا جزء یعنی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ اسی حقیقت پر دال ہے اور اَلْحَمْدُ سے لے کر وَالنَّاس

حاشیہ :۔ چونکہ یہ نکتہ قرآن اور اسلام دونوں کی رُوح ہے۔ اس لئے اقبالؔ نے اس کو اپنی ہر کتاب میں واضح کیا ہے۔ لیکن اپنے گنام "خطباتِ مدراس" میں اس حقیقت کو دلکش ترین انداز میں بیان کیا ہے۔ اس لئے میں اس فقرہ کا آزاد ترجمہ درج ذیل کئے دیتا ہوں :۔

"اسلام کو اگر ایک اخلاقی نصب العین کی حیثیت سے دیکھا جائے تو وہ ہمیں ایک خدا پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہے اور اگر اسلام کو اگر ایک عمرانی نظام کی حیثیت سے دیکھا جائے تو وہ کچھ نہیں ہے مگر اسی عقیدۂ توحید کو بنی آدم کی عقل اور جذباتی زندگی میں عنصرِ فعال بنا دینے کا دوسرا نام ہے۔ یعنی دینِ اسلام وہ ضابطہ ہے جو توحید کے عقیدہ کو انسانوں کی زندگی کے ہر شعبہ میں حکمراں اور مؤثر بنا دیتا ہے۔ ۱۲

تک سارا قرآنِ حکیم اسی صداقت سے معمور ہے۔ توحید کی تمام اقسام اور اس کے جملہ مراتب اسی مرکزی نکتہ کے چاروں طرف گردش کر رہے ہیں، بلکہ اسی اصل سے متفرع ہیں۔ اور اسی بنیادی تعلیم سے ماخوذ ہیں۔ اسی صداقت کو دنیا میں قائم کرنے کے لئے قرآنِ حکیم نے ساری دنیا سے لڑائی مول لی ہے۔ تمام ادیانِ عالم کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور توحید ذاتِ باری پر ہر قسم کے دلائل پیش کرنے کے علاوہ یہ کہہ کر مخالفین پر اتمامِ حجت کر دی:۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا

اگر زمین و آسمان میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ (جو واحد لاشریک ہے) دوسرے خدا (بھی) ہوتے تو یقیناً کائنات میں فساد (عظیم) برپا ہو جاتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ یہ نظام ہی درہم برہم ہو جاتا۔ اربابِ عقل سے مخفی نہیں ہے کہ ایک عامی کو توحید کا مفہوم سمجھانے کے لئے اس سے بہتر پیرایۂ بیان ممکن نہیں ہے

دوسرا مرتبہ، یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ ساری کائنات میں کوئی ہستی صفات میں اس کی شریک نہیں ہے۔ پہلی قسم نے شرک فی الذات کی نفی کر دی، دوسری قسم نے شرک فی الصفات کی۔ یعنی ساری کائنات میں اللہ کے سوا کوئی خالق نہیں، رازق نہیں، دستگیر نہیں، قادرِ مطلق نہیں، عالم الغیب نہیں، عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِيدٌ نہیں، نفع یا نقصان پہنچانے والا نہیں، معطی نہیں، مانع نہیں، گناہ معاف کرنے والا نہیں، توبہ قبول کرنے والا نہیں۔

تیسرا مرتبہ، یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ ساری کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی ہستی اس لائق نہیں جس کے سامنے سرِ نیاز خم کیا جائے، جس کی پرستش کی جائے

جس کو معبود سمجھا جائے، یعنی اس عقیدہ کی بدولت شرک فی العبادت کی نفی ہو گی۔ مسلمان اس کائنات میں کسی ہستی کے سامنے اپنا سر نہیں جھکا سکتا۔ کسی کو اپنا معبود تسلیم نہیں کر سکتا۔

چوتھا مرتبہ، یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی حکمران یا حاکم یا بادشاہ یا آمر نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم فرماتا ہے۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ

یعنی نہیں ہے حکمرانی مگر اللہ کے لئے۔

اس آیت کی رو سے ایک مسلمان اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کسی کو اپنا بادشاہ یا فرمانروا تسلیم نہیں کر سکتا، اگر کرے گا تو شرک فی الحکم کا مجرم ہو کر اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

پانچواں مرتبہ، یعنی یہ عقیدہ کہ طاقت، قدرت اور قوت کا سرچشمہ صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ مجھ میں بذاتِ خود کوئی قوت نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ مجھے اعمال کی قوت عطا نہ کرے تو میں کوئی عمل نہیں کر سکتا۔ یعنی میں اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں اس کا محتاج ہوں۔ چنانچہ قرآنِ حکیم فرماتا ہے:۔

مَا شَآءَ اللّٰہُ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ ج (۱۸ : ۳۹)

اور جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا تو تو نے یہ بات کیوں نہ کہی کہ جو کچھ اللہ کو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے اور بدونِ خدا کی مدد کے (کسی میں) کوئی قوت نہیں ہے۔

چھٹا مرتبہ، یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ ساری کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سوا

حقیقی معنی میں اور کوئی ہستی موجود نہیں ہے۔ جس قدر موجودات نظر آتے ہیں سب اپنے اپنے وجود میں اسی واجب الوجود کے محتاج ہیں۔ اس کے سوا کسی کا وجود، ذاتی یا خانہ زاد نہیں ہے۔ ہم سب اس کے موجود کرنے سے موجود ہوئے ہیں۔ یعنی اللہ کا وجود حقیقی، اصلی اور ذاتی ہے اور ہمارا وجود مجازی، ظلی اور عارضی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم فرماتا ہے:۔

هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا ۝

بلاشبہ انسان پر زمانہ میں سے ایک وقت ایسا بھی گذرا ہے جب وہ پردۂ عدم میں مخفی تھا۔ یعنی موجود نہ تھا۔

اس سے ثابت ہوا کہ انسان کی ماہیت عدم ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے خلعتِ وجود عطا فرمادیا اس لئے موجود ہوگیا۔

توحید کے ان مراتب ستہ کا مفہوم ذہن نشین کرنے کے بعد معلوم ہو سکتا ہے کہ حقیقی معنی میں موحد وہ ہے جو شرک فی الذات، شرک فی الصفات شرک فی العبادت، شرک فی الحکم، شرک فی القوت اور شرک فی الوجود ان تمام باتوں سے اعتقاداً اور عملاً اجتناب کرے۔

اقبالؔ کے نزدیک، توحید دنیا میں سب سے بڑی اور زندہ قوت ہے۔ صرف ایک شعر لکھتا ہوں:۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے، فقط اک مسئلۂ علمِ کلام

اقبالؔ کے نزدیک توحید، گفتار نہیں ہے بلکہ تیغِ بے زنہار ہے:۔

این دو حرفِ لا ٰاِلٰہ گفتار نیست

لا ٰاِلٰہ جز تیغ بے زنہار نیست

(ب) امتحان توحید بذریعہ عمل ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اقبال کا دعویٰ یہ ہے کہ توحید سے انسان کی پوشیدہ صلاحیتیں بروئے کار آجاتی ہیں اس پر وہ آزمائش کو دلیل بناتے ہیں یعنی اگر کسی کو اس میں شک ہو تو توحید کی آزمائش کر کے دیکھ لے ۔ اور اہل علم جانتے ہیں کہ تجربہ (امتحان) دنیا میں سب سے بڑی دلیل ہے۔ اسی کی بدولت انسان کے اندر حق الیقین پیدا ہو جاتا ہے ۔

اس کی صورت یہ ہے کہ انسان حقیقی معنیٰ میں موحد بن کر دیکھ لے کہ اس کی شخصیت کے اسرار اس پر ظاہر ہوتے ہیں یا نہیں یعنی وہ دنیا میں سربلندی حاصل کرتا ہے یا نہیں ؟

ہم پہلے واضح کر چکے ہیں کہ موحد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا

(۱) کسی کو الٰہ نہیں مانتا۔

(۲) کسی کو اس کی صفات میں شریک نہیں کرتا۔

(۳) کسی کو اپنا معبود نہیں بناتا یعنی کسی کو مقصود نہیں سمجھتا۔

(۴) کسی کو حکمراں تسلیم نہیں کرتا یعنی غیر اللہ کی اطاعت نہیں کرتا۔

(۵) کسی کو مؤثر فی الوجود نہیں جانتا۔

(۶) کسی کو حقیقی معنی میں موجود نہیں سمجھتا۔

اقبال کہتے ہیں کہ توحیدِ الٰہی کے یہ مراتب ستہ انسان کے اندر بے پناہ طاقت پیدا کر دیتے ہیں ۔ موحد دنیا میں کسی کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتا

نہ کسی سے ڈرتا ہے۔ وہ کسی بادشاہ کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتا۔ کیونکہ جانتا ہے کہ جب تک اللہ نہ چاہے ساری دنیا کے بادشاہ مل کر بھی چاہیں تو مجھے کچھ نہیں دے سکتے۔ [1]

امتحان سے اقبال کی مراد یہ ہے کہ توحید کے اقتضا پر عمل کر دیکھو دیکھو کہ تمہارے اندر کتنا عظیم الشان انقلاب پیدا ہو جائے گا۔ کہ وہ بادشاہ جن کے سامنے آج تم دستِ سوال دراز کر رہے ہو، کل خود تمہارے سامنے دست بستہ حاضر ہوں گے۔

اسلام کی تیرہ سو سال کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لو۔ جن لوگوں نے توحید کے اقتضا پر عمل کیا، انہوں نے زمان و مکان پر بھی حکومت کی اور انسانوں کے قلوب پر بھی۔ اتنی بات اور یاد رکھنے کی ہے کہ

اگر فرد، توحید کے اقتضا پر عمل کرے گا تو اس کی شخصیت کے اسرار اہلِ دنیا پر واضح ہو جائیں گے۔ یعنی لوگ اس کی عزت کرنے لگیں گے۔ لیکن

اگر ملت توحید کے اقتضا پر عمل کرے گی تو حکمراں ہو جائے گی۔ کیونکہ ملت مجموعہ ہے افراد کا۔ اور جس طرح قطروں کے مجموعہ میں طاقت پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح افراد کا مجموعہ بھی قوت کا مرکز بن جاتا ہے۔

---

[1] اکبر الہ آبادی نے اس حقیقت کو کتنے دلپذیر انداز میں پیش کیا ہے:

دل میں تو ضعفِ عقیدت کو کبھی راہ نہ دے
کوئی کچھ دے نہیں سکتا اگر اللہ نہ دے

فرد از توحید لاہوتی شود
ملّت از توحید جبروتی شود

(ج) انکشاف اسرارِ خودی :۔ اقبال کا مسلک یہ ہے کہ ہر انسان میں نیابت الٰہیہ کی استعداد بالقوت موجود ہے۔ (انہی استعدادوں کو انھوں نے اسرار سے تعبیر کیا ہے) لیکن اس استعداد کو قوت سے فعل میں لانے کے لئے انسان کو توحیدِ الٰہی کے اقتضاء پر عمل کرنا لازمی ہے۔ مقامِ مطلوب تک پہنچنے کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے۔ اسرارِ خودی کی وضاحت اس لئے چنداں ضروری نہیں کہ اس موضوع کی تشریح میں اقبال نے خود ایک کتاب لکھدی ہے اور اس کا مطالعہ ہر انسان کو خودی کے اسرار سے آگاہ کر سکتا ہے۔

پانچویں شعر سے آخر بند تک :۔ کہتے ہیں کہ توحید وہ نعمتِ کبریٰ ہے، جس کی بدولت انسان کو دین، عزت، قانون، طاقت، اقتدار اور حکومت یہ سب نعمائے نصیب ہو سکتی ہیں۔

وہ علماء جو توحید کے متعلقات یعنی ذات وصفات کے ربط باہمی میں بحثیں کرتے ہیں ساری عمر حیران و سرگرداں رہتے ہیں۔ اور چونکہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے اس لئے عمل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عمل تو یقین کے بعد وقوع میں آسکتا ہے اور کلامیہ بحثوں سے یقین کا حصول ناممکن ہے اس لئے حیرانی سے مفر نہیں ہو سکتا۔ [1]

---

[1] اکبر الٰہ آبادی نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

عقل کو کچھ نہ ملا علم میں حیرت کے سوا
دل کو بھایا نہ کوئی رنگ محبت کے سوا

لیکن جو لوگ عقل کے بجائے مسلکِ عشق پر گامزن ہیں وہ اپنا وقت کلامیہ بحثوں میں ضائع کرنے کی بجائے عمل میں صرف کرتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ عشاق کو توحید الٰہی پر یقین کامل ہو جاتا ہے اس لئے یہ عقیدہ قدرتی طور پر ان کو عمل کی طرف راغب کر دیتا ہے۔

یہ ملحوظ رہے کہ عمل مقصودِ حیات ہے اور عشق پر منحصر ہے اور عشق، صحبتِ مرشد کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے مرشد کی صحبت کو کامیابی کے لئے شرطِ اولین قرار دیا ہے۔ چنانچہ مرشد رومی لکھتے ہیں:-

قال را بگذار مرد حال شو
پیشِ مردِ کاملے پامال شو

توحید میں یہ قدرت ہے کہ موحد کی زندگی میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیتی ہے حتیٰ کہ لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ تو کوئی اور ہی شخص ہے۔

ع نوعِ دیگر آفریند بندہ را

یہ بہت بلیغ مصرع ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ توحید کا عقیدہ موحد کو دوسری نوع کی زندگی عطا کر دیتا ہے۔ جو اس کی پہلی زندگی سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اسی اختلاف کو ظاہر کرنے کے لئے اقبالؔ نے "نوعِ دیگر" کی ترکیب استعمال کی ہے۔

واضح ہو کہ اس میں کوئی مبالغہ یا شاعرانہ خیال آرائی نہیں ہے۔ اور وہ تصوف، جو نااہلوں کے ہاتھوں میں پڑ جانے کی وجہ سے آج تمام دنیا میں رسوا ہے، دراصل اس طریقِ عمل (پروگرام) کا نام ہے جس پر کاربند ہونے سے ایک شخص کو نئی زندگی

حاصل ہو سکتی ہے۔

میں اس جگہ اس طریق کار کی مکمل تشریح تو درج نہیں کر سکتا۔ تاہم ایک بات کی طرف اشارہ کئے دیتا ہوں جس کی روشنی میں اربابِ علم اور طریقِ کار کی نوعیت سے بہت کچھ آگاہ ہو سکتے ہیں۔

واضح ہو کہ دوبارہ پیدا ہونے کے لئے شرطِ اولین یہ ہے کہ اس بات کا آرزومند (جسے اصطلاح میں سالک کہتے ہیں) نفسِ امارہ کو کچل ڈالے جس طرح وہ اپنے جانی دشمن پر قابو پانے کے بعد اس کا سر کچلے گا۔ اس پر حسب ذیل آیت نصِ صریح ہے:۔

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِيْلًا (پ ۲۹)

اے ہمارے رسول آپ کو شب بیداری کا حکم دیا جاتا ہے مگر تھوڑی سی رات، یعنی نصف رات یا اس سے کسی قدر کم (اور اگر چاہو تو) اس سے کچھ بڑھا دو۔ اور قرآن مجید کو صاف صاف اس طرح پڑھو کہ ایک ایک لفظ الگ الگ ہو۔ بات یہ ہے کہ ہم آپ پر بہت بھاری کلام (قرآنِ حکیم) ڈالنے کو ہیں۔ یہ حکم دے کر اب اللہ تعالیٰ قیامِ لیل کی حکمت بیان فرماتے ہیں۔ "بیشک رات کا اُٹھنا نفسِ امارہ کے کچلنے میں بہت مؤثر ہے، یعنی یہ قیامِ لیل نفسِ امارہ کو مغلوب کرنے میں بہت کارگر ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے غلاموں (صحابہ کرام رض) کو نئی زندگی عطا فرمائی تھی۔ لیکن اس حقیقت کو بھی مدِ نظر رکھنا چاہیئے کہ ان حضرات رض نے راتوں کو تنہائی میں اُٹھ کر برسوں نفسِ امارہ سے جنگ کی تھی۔

پس تصوف اسی مجاہدہ کا نام ہے اور جو مسلمان یہ مجاہدہ کرتا ہے، وہ

حقیقی معنیٰ میں تصوّف یعنی سنت نبوی ؐ پر عمل کرتا ہے۔

آج توحید میں اس قسم کی کوئی قوت باقی نہیں رہی ہے۔ کیونکہ قوم جہاد بالنفس کو دنیا نوسیت اور ملائیت سے تعبیر کرتی ہے۔ اور جہاد کے بغیر کوئی شخص موحد نہیں بن سکتا۔ اسی لئے اقبالؔ نے اسرار و رموز میں اپنی قوم کو عمل کا پیغام دیا ہے اور جہاد، عمل کی اعلیٰ اور ارفع صورت کا نام ہے۔

توحید پر عامل ہونے کا ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ موحد ہر وقت راہ حق میں لگا پو (جدو جہد) کرتا رہتا ہے۔ یعنی وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کوشش ہی میں انسان کی فوز و فلاح کا راز مضمر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کامیابی کا مکلف نہیں بنایا کیونکہ یہ تو اس کے ہاتھ میں ہے۔ اُس نے ہماری کمزوری کو دیکھ کر ہمیں صرف کوشش کا حکم دیا ہے اور موحد اپنی پوری زندگی جدو جہد میں بسر کردیتا ہے۔ مثلاً سلطان ٹیپو شہید کی زندگی کا مطالعہ کافی ہوگا۔

توحید پر عامل ہونے کا دوسرا ثمرہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی سے دو چیزوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ اور دو خوبیاں اس کے اندر پیدا ہو جاتی ہیں۔

(۱) وہ خوف اور رشک سے نجات حاصل کرلیتا ہے۔

(۲) عمل پر کمربستہ اور ضمیرِ کائنات سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

یہ بھی بہت بلیغ شعر ہے بلکہ اقبالؔ نے اپنا سارا فلسفہ اس کے اندر بند کردیا ہے۔ مختصر طور پر یوں سمجھ سکتے ہیں کہ

جب مسلمان کو یہ معلوم ہوگیا کہ اللہ کے سوا کوئی ہستی مجھے نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتی تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ دنیا میں کسی سے خوفزدہ نہیں ہو سکتا۔

ڈرتا وہی ہے جو دوسرے کو اپنے سے برتر سمجھتا ہے یا اس میں نقصان رسانی کی طاقت محسوس کرتا ہے۔

جب مسلمانوں کو توحید کا صحیح علم (جسے اصطلاح میں عرفان کہتے ہیں) حاصل ہو جاتا ہے، تو رفتہ رفتہ غور و فکر، مراقبہ اور مجاہدہ کے بعد کائنات کی کوئی حقیقت اس پر منکشف ہو جاتی ہے۔ جو اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ اس کائنات کی حقیقت نہیں ہے۔ حقیقت صرف ایک ہے، وہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہے۔ وہی خالق ہے اور وہی رازق ہے، وہی مالک ہے، وہی حاکم ہے، وہی آمر ہے، وہی دراصل فاعل ہے، وہی ہر شئے میں جلوہ گر ہے، وہی مؤثر فی الوجود ہے۔ اور دراصل وہی موجود ہے۔

اسی حقیقت کو اقبال نے "مسافر" میں یوں بیان کیا ہے:۔

از ضمیرِ کائنات آگاہ اوست

تیغِ لاموجود الا اللہ اوست

آخری شعر:۔ جب ایک مسلمان حقیقی معنیٰ میں اس کا بندہ (عبدہٗ) بن جاتا ہے۔ یعنی ماسوا اللہ سے بکلی قطع نظر کر لیتا ہے تو اس کا کاسہ گدائی جامِ جم بن جاتا ہے۔ یعنی وہ نائبِ حق کے مرتبہ پر فائز ہو کر کائنات پر حکمراں ہو جاتا ہے۔

نوٹ:۔ یہ مقام صرف سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی کو اصطلاحِ تصوف میں مقامِ فنافی الرسول کہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ حقیقی معنیٰ میں صرف حضورؐ مقامِ عبدہٗ پر فائز ہیں۔ لہٰذا جب تک کوئی شخص اپنے آپ کو حضورؐ کے رنگ میں رنگین نہ کرے۔ یہ مقام حاصل نہیں

ہو سکتا۔

دوسرا بند۔ پہلے بند میں اقبال نے یہ بتایا کہ فرد جب توحید اختیار کرتا ہے تو اس کی زندگی میں کیا انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ اس بند میں وہ یہ بتاتے ہیں کہ توحید سے قوم کی زندگی پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ

(۱) اگر ملتِ اسلامیہ کو جسم قرار دیا جائے تو کلمۂ توحید اس کے لئے بمنزلۂ رُوح ہے۔

(۲) عقیدۂ توحید، ملت کے افراد میں وحدتِ افکار پیدا کر دیتا ہے،

(۳) اگر کافر (سنگ) توحید اختیار کرے تو زندہ (دل) ہو جائے۔ اور اگر مسلمان (دل) توحید سے غافل ہو جائے تو مٹی (گِل) کی طرح بے قیمت اور بیکار ہو جائے گا۔

(۴) اگر قوم بحیثیتِ مجموعی توحید اختیار کر لے تو کائنات پر حکمران ہو سکتی ہے۔

(۵) توحید میں یہ تاثیر ہے کہ اسود کو احمر کر سکتی ہے۔ یعنی نسل اور رنگ کے امتیازات کو فنا کر سکتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو! حضرت سیدنا بلالؓ اسی توحید کی بدولت، فاروقِ اعظمؓ اور ابوذر غفاریؓ کے ہم پلہ ہو گئے۔

(۶) کہتے ہیں کہ خویشی اور بیگانگی کا مقام یعنی معیار، رنگ یا نسل یا قوم یا قبیلہ نہیں ہے بلکہ دل ہے۔ یعنی ہر شخص جو موحد ہے، خویش (اپنا) ہے۔ اور ہر شخص جو منکر ہے، بیگانہ (غیر) ہے اس لئے ملت نام ہے اُن افراد کے مجموعہ کا جو اعتقادِ قلبی کے اعتبار سے یک رنگ ہوں۔ یعنی ملتِ اسلامیہ کی بنیاد نہ رنگ ہے نہ نسل، نہ زبان، نہ قبیلہ بلکہ عقیدۂ توحید۔

(۷) ملت (قوم) کے تمام افراد میں وحدتِ افکار لازمی ہے۔ ورنہ اس پر ملت کا اطلاق درست نہ ہوگا۔ دوسرے شعر میں اسی نکتہ کی مزید تشریح کی ہے کہ ملت وہ ہے جس کے افراد میں ایک ہی قسم کے جذبات موجزن ہوں۔ اور اچھائی اور برائی کا معیار بھی ایک ہی ہو۔ یعنی خوب وہ ہے جسے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خوب قرار دیں۔ اور زشت وہ ہے جسے حضورِ انور زشت قرار دیں۔ اس لئے ملت کا فرض ہے کہ اسی معیار کو اختیار کرے۔

(۸) اور جب تک۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا جذبہ (سوزِ حق)

حاشیہ، صفحہ ۱۰۲ سے:۔ فاروقِ اعظمؓ کا نام نامی تو غایت شہرت کی بنا پر محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کے مختصر حالات ذیل میں درج کرتا ہوں۔ جندب نام تھا، ابوذر کنیت تھی، غفاری قبیلہ کے چشم و چراغ تھے۔ فطرۃً نہایت بیباک شجاع اور جری تھے۔ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ان سے بڑھ کر راست گو انسان دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ "ابوذر سے زیادہ سچی زبان والے انسان کو زمین نے اپنی پشت پر نہیں اٹھایا۔" وہ سابقون الاولون میں سے ہیں یعنی دنیا میں پانچویں مسلمان ہیں اور پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے علی الاعلان حرمِ کعبہ میں کلمۂ توحید پڑھا تھا۔ کلمۂ توحید سُن کر کافر ان پر ٹوٹ پڑے اور اگر حضرتِ عباس انھیں نہ بچاتے تو شہادت یقینی تھی۔ زہد و تقویٰ اور ترک و تجرید کے اعتبار سے مثیلِ مسیحؑ تھے۔ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے عاشق تھے۔ سنہ ۳۲ھ میں وفات پائی۔ ۱۲

افراد کے دلوں میں کارفرما نہیں ہوگا، یہ انداز فکر پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

(۹) اے مسلمانو! یاد رکھو کہ ہم سب حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہیں۔ کیونکہ قرآن مجید نے انہیں ہمارا باپ قرار دیا ہے۔ لہٰذا ہر شخص جو مسلمان ہے ہمارا بھائی ہے۔ خواہ وہ عربی ہو یا عجمی۔

(۱۰) اگرچہ دنیا کی اقوام نے اپنی اپنی قومیت کی بنیاد وطن پر رکھی ہے لیکن ہم مسلمانوں کی ملت کی اساس نہ وطن ہے نہ نسب ہے، بلکہ وہ اساس ہمارے دل میں پوشیدہ ہے یعنی عقیدۂ توحید الٰہی۔

(۱۱) چونکہ ہم نے اللہ تعالیٰ (غائب) سے رشتۂ محبت استوار کر لیا ہے۔ اس لئے ہم رنگ، نسل، نسب، وطن اور قبیلہ (این و آں) کے امتیازات سے آزاد ہو گئے ہیں۔

(۱۲) دُنیا کی دوسری قوموں کی قومیت، خارجی مظاہر پر مبنی ہے جو نگاہ سے نظر آسکتے ہیں مثلاً رنگ، وطن یا نسب، لیکن ہماری قومیت کی بنیاد آنکھوں سے نظر نہیں آسکتی۔ یعنی عقیدۂ توحید جو دل میں مخفی ہے۔

ہم چونکہ شمعِ توحید کے پروانے ہیں اس لئے ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں وحدت کا رنگ جلوہ گر ہے۔ چنانچہ ہم یک نما ہیں، یک بین ہیں اور یک اندیش ہیں۔ ہمارا مدعا ایک ہے، ہمارا مآل ایک ہے، اور ہمارے خیال کا انداز بھی ایک ہے۔ یعنی ملتِ اسلامیہ پر ملت کا اطلاق اس وقت درست ہوگا، جب تمام افراد میں وحدت کا رنگ پیدا ہو جائے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی اور نوازش سے ہم سب

مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا۔ اور اس اخوت کا ثمرہ یہ ہے کہ ہم یک زبان، یک دل اور یک جان ہو گئے۔ یعنی ہمارا کلمہ ایک ہے، دعویٰ ایک ہے اور مقصودِ حیات ایک ہے۔

اس شعر کا پہلا مصرع اس آیت سے ماخوذ ہے۔

إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَآءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِۦٓ إِخْوَانًا۔

اے مسلمانو ! اُس وقت کو یاد کرو جب تم قبولِ اسلام سے پہلے، آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی۔ پس تم اس کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے۔ (۳:۱۰۳)

در معنی این کہ یاس و حزن و خوف ام الخبائث است و قاطع حیات و توحید ازالۂ این امراضِ خبیثہ می کند

مرگ را ساماں ز قطعِ آرزوست (۱) زندگانی محکم لاتقنطوا است
تا امید از آرزوے پیہم است نا امیدی زندگانی را سم است
نا امیدی ہمچو گور افشاردت گرچہ الوندی ز پا می آوردت
ناتوانی بندۂ احسانِ او نامرادی بستۂ دامانِ او
زندگی را یاس خواب آور بود این دلیلِ سستیٔ عنصر بود
چشمِ جاں را سرمہ اش اعمی کند روزِ روشن را شبِ یلدا کند
از دمش میرد قوائے زندگی خشک گردد چشمہ ہاے زندگی
خفتہ با غم در تہِ یک چادر است غم رگِ جاں را مثالِ نشتر است
اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر (۲) از نبیؐ تعلیم لاتحزن بگیر
این سبق صدیقؓ را صدیق کرد سرخوش از پیمانۂ تحقیق کرد
از رضا مسلم مثالِ کوکب است در رہِ ہستی تبسم بر لب است

---

(۱) لاتقنطوا من رحمة اللّٰه (آیہ شریفہ) (۲) لاتحزن ان اللّٰه معنا (آیہ شریفہ) ۱۲

گر خدا داری ز غم آزاد شو
از خیالِ بیش و کم آزاد شو

قوتِ ایماں حیات افزایدت (۱) وردِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ بایدت
چوں کلیمے سوئے فرعونے رود (۲) قلبِ او از لَا تَخَفْ محکم شود
بیمِ غیر اللہ عمل را دشمن است کاروانِ زندگی را رہزن است
عزمِ محکم ممکنات اندیش ازو ہمتِ عالی تأمل کیش ازو
تخمِ او چوں در گلت خود را نشاند زندگی از خود نمائی باز ماند
فطرتِ او تنگ تاب و سازگار (۱) با دلِ لرزان و دستِ رعشہ دار
دزدد از پا طاقتِ رفتار را می رباید از دماغ افکار را
دشمنت ترسان اگر بیند ترا از خیابانت چو گل چیند ترا
ضربِ تیغِ او قوی تر می فتد ہم نگاہش مثلِ خنجر می فتد
بیم چوں بند است اندر پائے ما ورنہ صد سیل است در دریائے ما
بر نمی آید اگر آہنگِ تو نرم از بیم است تارِ چنگِ تو
گوش تابش دہ کہ گردد نغمہ خیز بر فلک از نالہ آرد رستخیز
بیم جاسوسے است از اقلیمِ مرگ اندرونش تیرہ مثلِ بیمِ مرگ
چشمِ او برہمزنِ کارِ حیات (۲) گوشِ او تیزگیرِ اخبارِ حیات

---

(۱) لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ٥ (آیہ شریفہ)
(۲) قُلْ لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى (آیہ شریفہ) ۱۲

ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلبِ تست — اصلِ او بیم است اگر بینی درست
لابہ و مکاری و کین و دروغ — این ہمہ از خوف می گیرد فروغ
پردۂ زور و ریا پیراہنش — فتنہ را آغوشِ مادر دامنش
زانکہ از ہمت بنا شد استوار — می شود خوشنود با ناسازگار

(۱) رموزِ بیخودی

ہر کہ رمزِ مصطفےٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

فصل چہارم

تمہید :- اس فصل میں اقبالؔ نے یہ بیان کیا ہے کہ ناامیدی، حزن اور خوف یہ تینوں عیوب تمام اخلاقی برائیوں کی جڑ ہیں، بلکہ زندگی کی نہر کو خشک کر دیتے ہیں۔ لیکن توحیدِ الٰہی پر عقیدہ رکھنے اور اس کے اقتضاء پر عمل کرنے سے ان تمام رذائل کا ازالہ ہو سکتا ہے۔

گذشتہ فصل میں اقبالؔ نے عقیدۂ توحید پر نفسیاتی اور عمرانی زاویۂ نگاہ سے بحث کی تھی۔ اس فصل میں وہ اخلاقی نقطۂ نظر سے اس عقیدہ کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔

اس فصل میں دو بند ہیں۔ پہلے بند میں انہوں نے یاسؔ اور حزنؔ کی مضرتیں بیان کی ہیں۔ اور دوسرے بند میں خوف کے نقصانات واضح کر کے توحید اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔

پہلا بند :- کہتے ہیں کہ اگر انسان اپنے سینہ کو آرزو سے خالی

کر لے، اور کامیابی سے مایوس ہو جائے، تو یہ مایوسی اور نا امیدی اس کے حق میں پیامِ موت بن جائے گی۔ یعنی زندگی نام ہے۔ ہر دم نئی تمنائیں دل میں پیدا کرنے اور ان کے حصول کے لئے جدوجہد کرنے کا۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصلِ او در آرزو پوشیدہ است

اس مسئلہ کو اقبالؔ نے اسرارِ خودی میں " حیاتِ خودی از تخلیق مقاصد است" کے زیرِ عنوان، بالوضاحت بیان کر دیا ہے۔ اس لئے یہاں اس کی وضاحت چنداں ضروری نہیں ہے۔ بس اتنی صراحت کافی ہے کہ اس باب میں اسلامی تعلیم یہ ہے کہ:۔

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ط (۳۹ : ۵۳)

اے گنہ گارو تم اللہ کی رحمت سے نا اُمید مت ہو۔

اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ قرآنِ حکیم کی رُو سے نا اُمیدی بہت بڑا گناہ ہے، کیونکہ جو شخص اصلاحِ حال (کامیابی) سے نا اُمید ہو جاتا ہے۔ وہ پھر اس کے حصول کے لئے کوشش نہیں کرتا۔ اور جب وہ جدوجہد سے دستبردار ہو جاتا ہے، تو اس کی زندگی اور موت دونوں یکساں ہو جاتی ہیں۔ واضع ہو کہ اقبالؔ نے آئندہ اشعار میں اسی نکتہ کی وضاحت کی ہے۔

کہتے ہیں کہ نا امیدی زندگی کے حق میں زہرِ قاتل ہے۔ اگر رنگ (جذبہ) انسان کے دل پر غالب آجائے، تو وہ دنیا میں پھر کسی قسم کی ترقی نہیں کر سکتا۔

نا امیدی سے ناتوانی اور نامرادی پیدا ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ انسان کی تمام

قوتیں فنا ہو جاتی ہیں۔ بلکہ زندگی کے چشمے ہی خشک ہو جاتے ہیں۔

یاس (ناامیدی) اور حزن (رنج و غم) دونوں کا آپس میں شدید رشتہ ہے، اور اسی لئے زندگی پر دونوں کا اثر یکساں مرتب ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح یاس قاطع حیات ہے۔ اسی طرح حزن "سمِ زندگی" ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ہمیں یہ تعلیم عطا فرمائی:

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (۹ : ۴۰)

(جبکہ آپؐ اپنے رفیق سے فرما رہے تھے کہ) تم کچھ غم نہ کرو۔ یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ اس تلقین (سبق) نے صدیقؓ کو صدیق بنا دیا۔ دوسرے مصرع میں اس دعوےٰ پر دلیل پیش کی ہے، یعنی اسلام کی حقیقت ان پر آشکارا ہو گئی۔ اور اسلام کی حقیقت دوسرے شعر میں بیان کر دی ہے۔ یعنی شیوۂ تسلیم و رضا۔ اور اس کا ثمرہ یہ ہے کہ جب مسلمان کے اندر یہ شان پیدا ہو جاتی ہے تو وہ کبھی غمگین نہیں ہوتا، خواہ اس پر مصائب کے پہاڑ ہی کیوں نہ ٹوٹ پڑیں۔ وہ ہر حال میں خنداں نظر آتا ہے[۱]۔ دنیا کی کوئی مصیبت اس کے اطمینانِ قلب کو زائل نہیں کر سکتی۔

---

[۱] اقبال نے یہ شعر ۱۹۱۸ء میں لکھا تھا۔ وفات سے چند ماہ پہلے ۱۹۳۷ء میں انہوں نے اسی شعر کی شرح ان الفاظ میں کی تھی:

نشانِ مردِ حق دیگر چہ گویم
چو مرگ آید تبسم برلبِ اوست

واضح ہو کر،، ازبس تعلیم لاتحزن بگیر، بہت بلیغ مصرع ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو اپنے ساتھ لے کر بوقتِ شب مکۂ معظمہ سے ہجرت فرمائی تو شہر سے باہر نکل کر بنظرِ احتیاط، جبلِ ثور کی چوٹی کے نزدیک ایک غار میں قیام فرمایا۔ جسے عرفِ عام میں غارِ ثور کہتے ہیں۔ جب سپیدۂ سحر نمودار ہوا تو حضرت ابوبکرؓ نے اُس غار کے شگاف میں سے کفارِ مکہ کو دیکھا۔ جو حضورِ انورؐ کی تلاش میں کوہ دشت کا چپہ چپہ چھان رہے تھے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر اُن کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر ان لوگوں نے شگاف میں سے جھانک کر دیکھ لیا، تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ چونکہ انہیں سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے اندازہ محبت تھی اس لیے اس تصور سے کہ اگر ایسا وقوع پذیر ہو جائے تو حضورؐ کے دشمنوں کو گزند پہنچ جانا یقینی ہے۔ اُن پر حزن کی کیفیت طاری ہو گئی۔ چنانچہ انہوں نے جذبۂ محبت سے مغلوب ہو کر سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دبی زبان سے اس اندیشہ کا اظہار کیا[1]۔ اس پر حضورِ انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زبانِ وحی ترجمان سے یہ غیر فانی جملہ ارشاد فرمایا:۔

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا ط (۹: ۴۰)

یعنی تم کچھ غم نہ کرو (کیونکہ) بلاشبہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

---

[1] کتب احادیث میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ حضورؐ ہم تو دشمنوں میں محصور ہو گئے ۱۲

اِس جملہ سے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیقِ اکبرؓ کو اس حقیقت سے آگاہ فرمایا کہ :-

(۱) اللہ ہمارے ساتھ ہے یعنی ہمارا محافظ ہے۔

(ب) اور جب وہ ہمارا محافظ ہے تو ہمیں کوئی ہستی کسی قسم کا گزند نہیں پہنچا سکتی۔

(ج) اس لیے تم اس بات کا مطلق غم نہ کرو کہ ہم نے غیر موزوں جگہ کا انتخاب کیا، یا اگر دشمن دیکھ پائے گا تو ہمیں گزند پہنچائے گا۔

ہمارے لئے اس تعلیم میں یہ سبق ہے کہ

مسلمان وہ ہے جس کو اس بات کا یقین حاصل ہو کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت میرے ساتھ ہے۔ اس لئے جب تک وہ خود نہ چاہے، کوئی شخص مجھے کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اور اگر کوئی ضرر پہنچ جائے تو وہ یہ سمجھے کہ اللہ ہی کی یہ مرضی تھی، اور چونکہ یہ ضرر مجھے اس کی مشیت سے پہنچا ہے، اس لئے مجھے راضی برضائے الٰہی رہنا چاہیئے۔ اس اندازہ یا میلانِ خاطر کو تصوف کی اصطلاح میں رضاء بالقضاء کہتے ہیں۔ اور یہ شیوۂ تسلیم و رضا ہی اسلام کی حقیقت ہے، دگر ہیچ۔

اب میں اپنی پیش کردہ توضیح کو قرآنی آیات سے مبرہن کرتا ہوں :-

قُل لَّن يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا (۹ : ۵۱)

آپ فرما دیجئے کہ ہم پر کوئی حادثہ نہیں پڑ سکتا، مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے مقدر فرما دیا ہے (اس کا سبب یہ ہے کہ) کہ وہ ہمارا مالک ہے۔ (۹ : ۵۱)

مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِيْ أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِيْ كِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ أَنْ نَّبْرَأَهَا ۚ إِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتٰكُمْ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۙ

کوئی مصیبت نہ دنیا میں آتی ہے، نہ خاص تمہاری جانوں میں مگر وہ ایک کتاب (لوح محفوظ) میں لکھی ہوئی ہے (یعنی تمام مصائب خواہ خارجی ہوں یا داخلی سب مقدر ہیں) قبل اس کے کہ ہم اس کو پیدا کریں۔ اور یہ اللہ کے نزدیک بہت آسان ہے اور یہ بات (ہم نے) اس لئے تمہیں بتادی ہے کہ جو چیز تم سے جاتی رہے اس پر رنج مت کرو اور جو چیز تم کو عطا فرمائی ہے اس پر اتراؤ نہیں۔ (کیونکہ) اللہ تعالیٰ کسی شیخی باز اور اترانے والے کو پسند نہیں کرتا۔ (۵۷ - ۲۲)

اس آیت کی تفسیر کا تو یہ موقع نہیں صرف ایک بات کو نمایاں کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ تعلیم دے رہے ہیں کہ اگر کوئی بات تمہاری مرضی کے خلاف واقع ہو جائے (مثلاً مال و دولت میں کمی ہو جائے وغیرہ) تو رنج مت کرو۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہماری مرضی یونہی تھی۔ جو نقصان تمہیں پہنچا، جو مصیبت تم پر آئی وہ ہماری مشیت کاملہ کے مطابق تھی۔ ہم نے ایسا ہی چاہا، اور چونکہ تم ہمیں اپنا خالق، رزاق، مالک اور حاکم تسلیم کرتے ہو اس لئے ہماری مشیت کے سامنے سر جھکا دو (اسی کو تصوف میں مقام تسلیم و رضا کہتے ہیں) اور جب تم نے یہ مسلک اختیار کر لیا تو پھر رنج کیسا؟ [۱]

---

[۱] اکبر الٰہ آبادی نے اس شعر میں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے:-

رضائے حق پہ راضی رہ یہ حرفِ آرزو کیسا
خدا خالق، خدا مالک، خدا کا حکم تو کیسا؟

تمہارا غمگین یا رنجیدہ ہونا تو اس بات کی دلیل ہے کہ تم ہمیں اس کائنات کا مالک، منتظم اور منصرم نہیں سمجھتے۔ یہ دنیا اور اس میں جو کچھ ہے سب کو ہم نے پیدا کیا ہے اور پیدا کر کے ہم اس سے بے تعلق نہیں ہو گئے ہیں بلکہ ہم ہی اس کارخانے کو چلا رہے ہیں۔ پس اگر تم ہم پر صحیح معنوں میں ایمان رکھتے ہو تو حزن و ملال اور رنج و غم سے اپنے دل کو بالکل پاک صاف کر لو اور کسی وقت اس خیال کو اپنے دل میں راہ نہ دو کہ فلاں شخص کے پاس زیادہ ہے، میرے پاس کم ہے۔ کیونکہ اس کے پاس اگر زیادہ ہے تو اس میں اس کی کوئی خوبی نہیں ہے۔ ہماری مشیئت ہی تھی کہ اس کے پاس تم سے زیادہ ہو۔

یہ ہے وہ سبق جو "لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا" کے پردہ میں سرکار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پڑھایا کہ

(۱) اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

(۲) وہ چاہے گا تو ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا۔

(۳) اس لئے تم بالکل غم مت کرو۔

بس اسی کو مقام تسلیم و رضا کہتے ہیں اور یہی اسلام کی حقیقت ہے، قرآن مجید مسلمان میں یہی ذہنیت پیدا کرنی چاہتا ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ کی مشیئت کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔

اس واقعہ سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ کی معیت کا علم الیقین حاصل تھا۔ لیکن ارشاد نبویؐ کے بعد انہیں حق الیقین حاصل ہو گیا اور اس یقین کی دولت سے مالا مال ہو کر وہ مقام صدیقیت کبریٰ پر فائز ہو گئے۔ یہ مطلب

ہے اس مصرع کا " ایں سبق صدیق رضؓ را صدیق کرد " یعنی صدیق تو وہ پہلے بھی تھے لیکن قدرتِ خداوندی کا مشاہدہ کرنے کے بعد حقیقی معنی میں صدیق بن گئے۔

دوسرا بند:۔ دوسرے بند میں اقبال نے مسلمان کے تیسرے دشمن یعنی خوف کی حقیقت واضح کی ہے۔ اور اس سے اجتناب کی تلقین کی ہے۔ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان کی بدولت زندگی میں قوت اور شوکت پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کا ثمرہ یہ ہے کہ انسان خوف اور حزن دونوں آفتوں سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ چنانچہ آیتِ ذیل اس پر شاہد ہے:۔

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (۲: ۱۱۲)

بیشک جو شخص بھی اپنا رُخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو تو ایسے شخص کو اس کا عوض ملتا ہے پروردگار کے پاس پہنچ کر۔ ایسے مخلصین کو قیامت میں نہ کوئی خوف (اندیشہ) ہوگا نہ حزن (رنج و ملال)

کہتے ہیں کہ ایمان باللہ میں یہ تاثیر ہے کہ اس کی بدولت مومن اُس دنیا کے علاوہ اِس دنیا میں بھی خوف سے آزاد ہو جاتا ہے چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو فرعون کے پاس بھیجا تو روانگی سے قبل بھی لَا تَخَفْ کا مژدہ سُنا دیا اور جب فرعون کے ساحروں سے مقابلہ ہوا تو اس وقت بھی اسی جملہ سے ان کی ڈھارس بندھائی:۔

قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى (۲۰: ۶۸)

جب حضرت موسیٰؑ کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ لوگ حق و باطل میں کس طرح امتیاز کریں گے تو ہم نے ان سے کہا کہ تم ڈرو نہیں، تم ہی غالب رہو گے۔

کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسروں سے ڈرتا ہے تو اس خوف کا نتیجہ یہ مرتب ہوتا ہے کہ اس کے قوائے عملیہ مفلوج ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ جب ایک انسان دوسرے انسانوں سے ڈرنے لگتا ہے تو ہر قدم پر اسے یہ خوف دامن گیر ہوتا ہے کہ اگر میں نے یہ بات کہی یا یہ کام کیا تو ممکن ہے کہ فلاں شخص مجھ سے ناراض ہو جائے اور مجھ کو ملازمت سے برطرف کر دے یا میرے لڑکے کو ولایت نہ بھیجے یا میرے بھتیجے کو ٹھیکہ نہ دے۔ وغیرہ وغیرہ۔

غیر اللہ سے ڈرنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عزم و ارادہ میں تزلزل پیدا ہو جاتا ہے۔ انسان ہر معاملہ میں، ہر بات میں، ہر فعل میں سوچنے لگتا ہے کہ ممکن ہے میری اس بات سے فلاں افسر ناراض ہو جائے یا میرے اس اقدام سے فلاں وزیر ناخوش ہو جائے غرضیکہ وہ ممکنات اندیش ہو کر عمل صالح سے معذور ہو جاتا ہے نہ سچی بات منہ سے نکال سکتا ہے اور نہ اللہ رسولؐ کے فرمودہ پر عمل کر سکتا ہے۔ نتیجہ اس بے عملی کا یہ نکلتا ہے کہ:۔

زندگی از خود نمائی باز ماند

نہایت بلیغ مصرعہ ہے۔ جس میں اقبالؒ نے کافرانہ زندگی کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ مومن اور کافر بظاہر دونوں ایک ہی فضا میں سانس لیتے ہیں لیکن۔

ملا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور

کافر سب کچھ کرتا ہے مگر اپنی خودی کو عیاں نہیں کر سکتا۔ کیونکہ بیم غیر اللہ اُسے اس کی اجازت ہی نہیں دے سکتا۔ اگر وہ اپنا مافی الضمیر اعلانیہ بیان کر دے تو حاکم کی ناراضگی کا امکان (اندیشہ) ہے۔ صرف وہ شخص اپنی خودی کی نمائش کر سکتا ہے جو اللہ کے سوا اور کسی سے نہ ڈرے۔ مثلاً اگر امام ربانی مجدد الف ثانیؒ جہانگیر سے نوش سے یا اس کی سلطنت سے مرعوب ہو جاتے تو کلمۂ حق کیسے کہہ سکتے تھے۔ بالفاظِ دگر اس بے دین کے دربار میں اپنی خودی کی نمائش کیسے کر سکتے تھے؟

کہتے ہیں کہ بیم غیر اللہ یعنی انسانوں سے ڈرنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کی فطرت (شخصیت) تنگ و تاب (کمزور) اور اخلاقی کمزوریوں سے سازگار (موافق) ہو جاتی ہے۔ انسان عافیت کوش اور مصلحت بین اور ممکنات اندیش ہو جاتا ہے۔

خوف کی وجہ سے دل پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے انسان کلمۂ حق زبان پر نہیں لا سکتا اور اس کے ہاتھ میں رعشہ پیدا ہو جاتا ہے جس کی بنا پر وہ جہاد نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد اقبالؔ خوف کے مضر نتائج کو ایک مثال سے واضح کرتے ہیں کہ اگر تو میدانِ جنگ میں دشمن سے خائف اور ترساں ہو جائے گا تو

(۱) تو اس پر وار نہ کر سکے گا۔ بلکہ آنکھ بھی نہ ملا سکے گا۔

(۲) دشمن تجھ پر بڑھ چڑھ کر وار کرے گا۔

(۳) بلکہ تھوڑی دیر کے بعد صرف اُس کی نگاہ تجھے مغلوب کرنے

کے لئے کافی ہوگی۔ ۱؎

کہتے ہیں کہ اگر انسان اپنی شخصیت کا نفسیاتی اعتبار سے مطالعہ کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس کے اندر جس قدر اخلاقی عیوب ہیں سب کی بنیاد خوف ہے، مثلاً خوشامد (لایہ) مکاری، عیاری، کینہ، جھوٹ، فریب و ضمیر فروشی یہ تمام برائیاں خوف سے پیدا ہوتی ہیں۔

یہ آخری شعر تو ایسا ہے کہ سونے کے حرفوں سے لکھنے کے قابل ہے۔

کہتے ہیں کہ جو شخص تعلیمات نبوئی کی وجہ سے روح سے آشنا ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ جو شخص غیر اللہ سے ڈرتا ہے وہ دراصل مشرک ہے۔

۱؎ افسوس ہے کہ قلتِ صفحات کی وجہ سے میں پوری تاریخ یہاں نقل نہیں کر سکتا لیکن اربابِ فہم کے لئے اتنا اشارہ کافی سمجھتا ہوں کہ انقلاب ۱۸۵۷ء کی ناکامی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ہندوستانی فوجیں انگریزوں سے خائف ہوگئی تھیں۔ مثلاً جب ان ملاعنہ کی فوجیں سکندر باغ (لکھنؤ) میں داخل ہوئیں تو تمام ہندوستانی سپاہی (ہندو مسلمان) اس قدر خوف زدہ ہو گئے کہ ہتھیار چلانا بھول گئے۔ چنانچہ تین ہزار آدمیوں میں سے ایک متنفس بھی زندہ نہیں بچا۔ مٹھی بھر انگریزوں نے سب کا صفایا کر دیا۔ ۱۲

اس کی وضاحت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ انسانوں سے مت ڈرو بلکہ تم مجھ سے ڈرو کیونکہ میرے سوا کسی میں کوئی طاقت ہی نہیں ہے۔ فاعل حقیقی میں ہوں نفع و نقصان، موت و زیست، رنج و راحت، عزت و دولت سب میرے اختیار میں ہے۔ اگر میں نہ چاہوں تو کوئی شخص خواہ وہ کتنی ہی آرزو کیوں نہ کرے، تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔ اور اگر میں تمہیں کوئی چیز عطا کرنی چاہوں تو ساری دنیا کے لوگ مل کر بھی تمہیں اس شئے سے محروم نہیں کر سکتے[۱]۔ پس جو شخص انسانوں سے ڈرتا ہے، وہ ان کو خدائی میں شریک قرار دیتا ہے اور یہ کھلا ہوا شرک ہے۔

---

[۱] اکبر الہ آبادی نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

دل میں تو ضعفِ عقیدت کو کبھی راہ نہ دے
کوئی کچھ دے نہیں سکتا اگر اللہ نہ دے

محاورہ تیر و شمشیر

سرِّ حق تیر از لبِ سوفار گفت
تیغ را در گرمیٔ پیکار گفت

اے پریہا جوہر اندر قافِ تو
ذوالفقارِ حیدرؓ از اسلافِ تو

قوّتِ بازوئے خالدؓ دیدۂ
شام را بر سر شفق پاشیدۂ

آتشِ قہرِ خدا سرمایہ ات
جنّت الفردوس زیرِ سایہ ات

در ہوا ایم با میانِ ترکشم
ہر کجا باشم سراپا آتشم

از کماں آیم چو سوئے سینہ من
نیک می بینم بہ توئے سینہ من

گر نباشد در میاں قلبِ سلیم
فارغ از اندیشہ‌ہائے یاس و بیم

چاک چاک از نوکِ خود گردانمش
نیمہ از موجِ خوں پوشانمش

در صفائے او ز قلبِ مومن است
ظاہرش روشن ز نورِ باطن است

از تفِ او آب گردد جانِ من
ہمچو شبنم می چکد پیکانِ من

حکایت شیر و شہنشاہ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ

شاہِ عالمگیرِ گردوں آستاں — اعتبارِ دودمانِ گورگاں
پایۂ اسلامیاں برتر ازو — احترامِ شرعِ پیغمبرؐ ازو
درمیانِ کارزارِ کفر و دیں — ترکشِ ما را خدنگِ آخریں
تخمِ الحادے کہ اکبر پرورید — باز اندر فطرتِ دارا دمید
شمعِ دل در سینہ ہا روشن نبود — ملتِ ما از فساد ایمن نبود
حق گزید از ہند عالمگیر را — آں فقیرِ صاحبِ شمشیر را
از پئے احیائے دیں مامور کرد — بہرِ تجدیدِ یقیں مامور کرد
برقِ تیغش خرمنِ الحاد سوخت — شمعِ دیں در محفلِ ما بر فروخت
کور ذوقاں داستاں ہا ساختند — وسعتِ ادراکِ او نشناختند
شعلۂ توحید را پروانہ بود — چوں براہیمؑ اندریں بتخانہ بود

در صفِ شاہنشہاں یکتاستے
فقرِ او از ترکشش پیداستے

روزے آں زیبندۂ تاج و سریر — آں سپہدار و شہنشاہ و فقیر
صبحگاہاں شد بہ سیرِ بیشۂ — با پرستارِ وفا اندیشۂ
سرخوش از کیفیتِ بادِ سحر — طائراں تسبیح خواں بر ہر شجر

شاہِ رمز آگاہ شد محوِ نماز — خیمہ بر زد در حقیقت از مجاز
شیرِ ببر آمد پدید از طرفِ دشت — از خروشِ او فلک لرزندہ گشت
بوئے انسانی دادش از انساں خبر — پنجہ عالمگیر را زد بر کمر
دستِ شہ نادیدہ خنجر برکشید — شرزہ شیرے شکم از ہم درید
دل بخود راہے نداد اندیشہ را — شیرِ قالیں کرد شیرِ بیشہ را
باز سوئے حق رمید آں ناصبور — بود معراجش نمازِ باحضور
ایں چنیں دل خود نما و خود شکن — دارد اندر سینۂ مومن وطن
بندۂ حق پیشِ مولے لاستے — پیشِ باطل از نعم برجاستے
تو ہم اے ناداں دلے آور بدست — شاہدے را محملے آور بدست
خویش را در باز و خود را باز گیر — دام گستر از نیاز و ناز گیر
عشق را آتش زنِ اندیشہ کن — روبہ حق باش و شیری پیشہ کن

خوفِ حق عنوانِ ایمان است و بس
خوفِ غیر از شرکِ پنہاں است و بس

(فصل پنجم)

تمہید:- یاس و حزن و خوف کی مذمت کے بعد اقبال نے دو حکایتیں بیان کی ہیں۔ پہلی حکایت ایک تمثیل ہے اور دوسری ایک تاریخی واقعہ ہے۔

پہلی حکایت کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دن تیر نے تلوار سے یہ بات کہی اور جو کچھ

کہا وہ بلا شبہ حق ہے کہ اے تلوار! تیری ذات میں بڑی خوبیاں مضمر ہیں۔ جس طرح کوہ قاف میں پریاں۔ اور تو ذوالفقار حیدری کی نسل سے ہے۔ تونے حضرت خالدؓ جانباز کے بازوؤں کی قوت کا مشاہدہ کیا ہے[1]۔ اور تونے اپنی چمک سے رات کی تاریکی کو دور کردیا ہے۔ تو واقعی قہرِ خدا ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں ہے کہ جنت تیرے سایہ کے نیچے ہے[2]۔ میں بھی تیری طرح سراپا آتش ہوں اور جب کمان سے نکل کر کسی کے سینہ کی طرف آتا ہوں تو پہلے اس کا اچھی طرح معائنہ کرلیتا ہوں اگر وہ قلبِ سلیم نہیں ہے، تو میں اس کو اپنی نوک سے پارہ پارہ کرکے خون میں تر کردیتا ہوں (خون

---

[1] حضرت خالد ابن ولیدؓ جن کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے "سَیْفٌ مِّنْ سُیُوْفِ اللّٰہِ" کا قابلِ رشک لقب عطا فرمایا تھا۔ دنیا کے نامور سپہ سالاروں میں سے ہیں جن کے کارنامے اظہر من الشمس ہیں، اور ذاتی شجاعت کے لحاظ سے ہنی بال، سکندر اور نپولین بھی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ اس مصرع میں تلمیح ہے جنگِ موتہ کی طرف جب کہ حضرت خالدؓ نے تین ہزار کو ایک لاکھ بیس ہزار سے ٹکرا دیا تھا۔ اس معرکہ میں انہوں نے اپنی جسمانی قوت، جنگی قابلیت اور قلبی شجاعت کا بے نظیر مظاہرہ کیا تھا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ اس دن آٹھ تلواریں یکے بادیگرے ان کے ہاتھ میں ٹوٹی تھیں۔ جب ایک سپاہی کی یمنی تلوار ان کے ہاتھ میں آئی جس کا پھل ڈیڑھ بالشت چوڑا تھا تو وہ ان کے ہاتھ میں ٹھہری۔ ۱۲

[2] اَلْجَنَّةُ تَحْتَ ظِلَالِ السُّیُوْفِ ۱۲۔

کی واسکٹ پہنا دیتا ہوں)۔

لیکن اگر کسی کے سینے میں قلبِ سلیم موجود ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کا ظاہری حصہ بھی روشن ہو جاتا ہے تو اس قلب کی گرمی سے میری رُوح پگھل جاتی ہے اور میرا پیکان بیکار ہو جاتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مومن کا دل چونکہ خوف سے پاک ہوتا ہے، اس لئے اس پر نہ تیر کارگر ہوتا ہے، نہ تلوار اثر کرتی ہے۔

دوسری حکایت میں اقبالؔ نے حضرتِ عالمگیرؒ کی زندگی کا ایک واقعہ بیان کیا ہے تاکہ اس زمانہ کے مسلمانوں کے دل میں اس تعلیم کی صداقت کا نقش قائم ہو سکے جو انہوں نے قبل ازیں بیان کی ہے۔

پہلے بند میں حضرت علامہ نے حضرت عالمگیرؒ کی شخصیت پر ایک جامع اور بصیرت افروز تبصرہ سپردِ قلم کیا ہے۔ اور جس زمانہ میں انہوں نے یہ اشعار لکھے تھے اس زمانہ میں ہندوؤں کا قلم حضرت عالمگیرؒ کے خلاف مُسلسل زہر چکانی میں مصروف تھا۔ چنانچہ عالمگیر اور دینِ اسلام دونوں کے بدخواہ یعنی سر جادو ناتھ سرکار سی آئی ای نے سنہ ۱۹۱۲ء میں اپنی مشہور تالیف "حیاتِ اورنگ زیب" کی پہلی جلد شائع کی تھی [۱]

سنہ ۱۹۲۲ء میں اس کتاب کی پانچویں یعنی آخری جلد شائع ہوئی۔ دوسری جلد میں

---

[۱] راقم الحروف اس زمانہ میں فسٹ ایر کا طالب علم تھا۔ اور چونکہ "اورنگ زیب کا تفصیلی مطالعہ" داخلِ نصاب تھا اس لئے اس کتاب کو بھی پڑھتا تھا۔ ۱۲

اُس نے اپنی اسلام دشمنی کا ایسا مظاہرہ کیا کہ اس پر دیانند بانی آریہ سماج کے شاگرد رشید کا دھوکہ ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس نے اورنگ زیبؒ کے سوانح حیات نہیں لکھے ہیں، بلکہ اس کے پردہ میں دینِ اسلام کو اپنے مطاعن کا نشانہ بنایا ہے۔ مسلمانوں کی بے حسی اور ملی بے حمیتی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ابھی تک کسی مسلمان نے اس ناپاک کتاب کا جواب نہیں لکھا ہے۔

اندریں حالات اقبالؒ نے اس بصیرت افروز نظم کے ذریعہ سے اپنے دعوےٰ ہی کا اثبات نہیں کیا ہے، بلکہ ملت کی طرف سے "فرض کفایہ" بھی ادا کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:۔

حضرتِ عالمگیرؒ کی ذات سے ہندوستان میں اسلام اور پیروانِ اسلام دونوں کا مرتبہ بلند ہو گیا۔ اور انہوں نے اس ملک میں شریعت نبویؐ کا احترام دوبارہ قائم کیا۔

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اُس جنگ میں جو ہندوستان میں کفر اور دین کے درمیان صدیوں تک جاری رہی، عالمگیرؒ کا وجود اسلام کے ترکش کا آخری تیر تھا۔

ع ترکشِ مارا خدنگِ آخریں

یہ مصرع اپنی بلاغت کے اعتبار سے بے نظیر ہے۔ اگر کوئی شخص ۱۷۰۷ء سے لے کر ۱۹۲۷ء تک کی ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کرے، تو اس پر اس شعر کی صداقت بخوبی آشکارا ہو سکتی ہے۔

اکبر مرتد نے کفر و الحاد کا جو تخم ہندوستان میں بویا تھا۔ دارا شکوہ نے دوبارہ اس کی آبیاری کی کوشش کی، اس لئے ملتِ اسلامیہ کی بقاء کے لئے بہت سے خطرات پیدا ہو گئے تھے۔ اگر دارا شکوہ ہندوستان کا بادشاہ ہو جاتا، تو اس ملک میں اسلام کا خاتمہ

یقینی تھا۔

ایسے نازک موقع پر اللہ تعالیٰ نے اسلام کی بقاء کے لئے عالمگیر کو منتخب فرمایا۔ کون عالمگیر؟ وہ جو فقراور سلطنت دونوں کا جامع تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس مردِ مومن کو احیائے دین اور تجدیدِ یقین کے لئے مامور فرمایا، اور اسی کی تائید اور توفیق سے عالمگیرؒ نے داراشکوہ کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ یعنی کفر و الحاد کو مغلوب کر دیا۔ اور ہندوستان میں دین کا چراغ دوبارہ روشن کر دیا۔

متعصب اور کور ذوق مؤرخوں نے حضرتِ عالمگیرؒ کو بدنام کرنے کے لئے جھوٹی داستانیں تاریخ میں درج کر دیں اور اس مردِ مومن کی سیرت کو ایسے انداز میں پیش کیا کہ عامتہ الناس اُس سے بدظن ہو گئے۔ بقولِ شبلیؔ مرحوم ؎

انہیں لے دے کے ساری ہسٹری میں یاد ہے اتنا
کہ عالمگیرؒ ہندو کش تھا ظالم تھا ستمگر تھا

غیر مسلم مؤرخین عالمگیر کی دُور اندیشی، انتظامی قابلیت اور پاکیزگی سیرت (وسعتِ ادراک) کا صحیح اندازہ ہی نہ کر سکے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک سچا مسلمان تھا، شمع توحید کا پروانہ تھا اور اسلام کا عاشق تھا۔ اُس نے اپنی ساری عمر ایک سچے مسلمان کی طرح تبلیغ و اشاعتِ اسلام میں بسر کر دی۔ مسلمان کا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ کفر کو مٹائے اور اسلام کو بلند کرے۔ اور عالمگیرؒ نے مرتے دم تک اس فرض کو بوجوہ احسن انجام دیا۔

غیر مسلم مؤرخین سب سے بڑا اعتراض حضرتِ عالمگیرؒ کی ذات پر یہ عائد کرتے ہیں کہ اُس نے ہندوؤں کو ناراض کر کے سلطنت مغلیہ کو کمزور کر دیا۔ چنانچہ اس کی وفات

کے بعد تیس سال کی قلیل مدت میں اتنی بڑی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

اس اعتراض کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ جس قماش کے جانشین حضرت عالمگیرؒ کو میسر آئے، اگر اکبر مرتد کو میسر آجاتے تو سلطنتِ مغلیہ ۱۷۳۸ء میں ختم ہونے کے بجائے ۱۶۳۸ء ہی میں ختم ہو جاتی۔

دوسرا اور تحقیقی جواب یہ ہے کہ ان معترضین کو یہی معلوم نہیں کہ مسلمان کی پہلی اور آخری وفاداری کا مرکز اسلام ہے نہ کہ سلطنت یا وطن یا قوم یا قبیلہ۔ بیشک حضرت عالمگیرؒ نے اسلام کی اشاعت اور حمایت کی بنا پر ہندوؤں کو اپنا دشمن بنا لیا۔ لیکن یہی تو ان کے نامۂ اعمال میں سب سے زیادہ درخشاں کارنامہ ہے کہ انھوں نے اسلام کی بقاء کے سامنے نہ اپنی سلطنت کی پرواہ کی نہ اپنے خاندان کے مفاد کو مدِ نظر رکھا۔ ہم کہتے ہیں کہ بیشک سلطنت ختم ہو گئی۔ لیکن اسلام تو باقی رہ گیا۔ بلاشبہ حکومت خاندان سے جاتی رہی لیکن مسلمان تو کفر کی آغوش میں چلے جانے سے محفوظ ہو گئے۔ لاریب کہ ہندو اس مردِ مومن سے ناراض ہو گئے۔ لیکن اس نے تاجدارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی تو حاصل کر لی۔ اور ہر وہ شخص جو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے واقف ہے، اس بات کا اعتراف کرے گا کہ عالمگیرؒ اپنے مقصدِ حیات میں کامیاب ہو کر دنیا سے رخصت ہوا۔ اسلام میں مسلمان کی کامیابی کا معیار، حکومت نہیں ہے بلکہ اطاعت و اشاعتِ قانونِ الٰہی ہے۔

اسی لئے اقبال نے اس بند کو اس شعر پر ختم کیا ہے کہ ہندوستان کے بادشاہوں کی طویل فہرست میں عالمگیرؒ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کی جس قدر خدمت اس مردِ مومن نے انجام دی، مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں اس کی نظیر

نہیں مل سکتی۔ جس طرح اس کی زندگی مومنانہ فقر کی مظہر تھی، اسی طرح اس کی تربت سے بھی شانِ فقر آشکارا ہے۔ کیونکہ اُس نے وصیّت کر دی تھی کہ میری قبر کو پختہ نہ بنایا جائے۔

عالمگیرؒ کی اسلامی سیرت کے بعض پہلوؤں کی وضاحت کے بعد اقبال نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک دن نمازِ فجر سے پہلے حضرت عالمگیرؒ جنگل کی طرف سیر کے لئے نکل گئے۔ جب نماز کا وقت آیا تو نیت باندھ لی۔ اتفاقاً ایک شیر جھاڑی سے نکل کر اُن پر حملہ آور ہوا۔ عالمگیر کی جگہ کوئی اور ہوتا تو خدا معلوم اس کا کیا حال ہوتا، لیکن اس مردِ مومن نے معاً خنجر نکال کر شیر کا پیٹ چاک کر دیا، اور اس کام سے فارغ ہو کر پھر بدستور نماز میں مشغول ہو گیا۔

اقبال نے اس واقعہ سے یہ سبق حاصل کیا، بلکہ یہ نکتہ سیکھا کہ ایسا دل جو دشمن کے مقابلہ میں خود نما اور خدا کے سامنے خود شکن ہو، صرف مومن کے سینہ میں پایا جاتا ہے۔

بات یہ ہے کہ مردِ مومن اللہ تعالیٰ کے سامنے تو اپنی ہستی کو مٹا دیتا ہے۔ لیکن دشمن (باطل) کے سامنے اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔

اے مسلمان! اگر ہو سکے، تو تو بھی اپنے سینہ میں ایسا ہی دل پیدا کر۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ

خویش را در باز و خود را باز گیر
دام گستر از نیاز و ناز گیر

اقبال نے اس شعر میں اپنا فلسفہ تمام و کمال بیان کر دیا ہے گویا دریا کو

ایک کوزے میں بند کر دیا ہے۔

(۱) خویش را در باز یعنی عشقِ الٰہی اختیار کرو۔

(۲) خود را باز گیر یعنی عشق کی بدولت اپنی خودی کو مستحکم کر لے۔ بالفاظِ دگر اپنے اندر شانِ فقر پیدا کر لے۔

(۳) دام گستر از نیاز یعنی پہلے تو اللہ سے محبت کر۔

(۴) ناز گیر یعنی اس محبت کا ثمرہ یہ ملے گا کہ معشوق خود تیرا عاشق بن جائے گا۔

بس یہی اقبالؔ کا سارا فلسفہ ہے جس کو انہوں نے اسرارؔ اور رموز سے لے کر ارمغانِ حجازؔ تک اپنی تمام تصانیف میں مختلف صورتوں سے بیان کیا ہے۔

اگلے شعر میں اسی پروگرام کی مزید تشریح کرتے ہیں کہ

جبتک تو عقل کی غلامی (اتباع) کرے گا، عشق اختیار نہیں کر سکتا۔ اس لئے پہلے عقل کو عشق کی آگ میں فنا کر دے۔ پھر کھلے بندوں مسلکِ عشق پر گامزن ہو جا یہ عشق تجھے اللہ کا غلام بنا دے گا۔ اور اس غلامی کا نتیجہ یہ برآمد ہو گا کہ کائنات تیری غلام ہو جائے گی۔ بس یہی اسلام ہے اور یہی اقبالؔ کا پیغام ہے۔

آخری شعر میں رجوع الی المطلوب کرتے ہیں کہ

(۱) خوفِ حق، ایمان کی نشانی ہے۔

(۲) خوفِ غیر، ایمان کی نفی ہے۔ کیونکہ غیر سے وہی ڈرتا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتا۔

رُکنِ دوم

رِسالت

تارکِ آفل براھیم خلیلؑ (۱) انبیا را نقشِ پائے او دلیل
آں خدائے لم یزل را آیتے (۲) داشت در دِل آرزوئے ملّتے
جوئے اشک از چشمِ بیخوابش چکید (۳) تا پیامِ طَھّرا بیتی شنید
بہرِ ما ویرانہ آباد کرد (۴) طائفاں را خانہ بنیاد کرد
تا نہالِ تُبْ عَلَیْنَا غنچہ بست (۵) صورتِ کارِ بہارِ ما نشست
حق تعالےٰ پیکرِ ما آفرید وز رسالت در تنِ ما جاں دمید

لہ آفل: غروب ہونیوالا۔ زوال پذیر۔ تلمیح ہے آیۂ شریفہ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ کی طرف ۱۳
لہ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ (آیہ شریفہ)
سہ وَعَھِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَھِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ ۝ (آیہ شریفہ)
سہ رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ ۝ (آیہ شریفہ)
ھہ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۝ (آیہ شریفہ)

حرفِ بے صوت اندریں عالم بدیم — از رسالت مصرعِ موزوں شدیم

از رسالت در جہاں تکوینِ ما — از رسالت دینِ ما آئینِ ما

از رسالت صد ہزارِ ما یک است — جزوِ ما از جزوِ ما لاینفک است

آں کہ شانِ اوست یہدی من یرید — از رسالت حلقہ گردِ ما کشید

حلقۂ ملت محیط افزا ستے — مرکزِ او وادیٔ بطحا ستے

ما ز حکمِ نسبتِ او ملتیم — اہلِ عالم را پیامِ رحمتیم

از میانِ بحرِ او خیزیم ما — مثلِ موج از ہم نمی ریزیم ما

امتش در حرزِ دیوارِ حرم — نعرہ زن مانندِ شیراں در اجم

معنیٔ حرفم کنی تحقیق اگر — بنگری با دیدۂ صدیق اگر (۱) حضرت ابوبکرؓ

قوتِ قلب و جگر گردد نبی — از خدا محبوب تر گردد نبی

قلبِ مومن را کتابش قوت است — حکمتش حبل الورید ملت است

دامنش از دست دادن مردن است — چوں گل از بادِ خزاں افسردن است

زندگی قوم از دمِ او یافت است — ایں سحر از آفتابش تافت است

فرد از حق ملت از وے زندہ است — از شعاعِ مہرِ او تابندہ است

از رسالت ہم نوا گشتیم ما — ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما

کثرتِ ہم مدعا وحدت شود — پختہ چوں وحدت شود ملت شود

زندہ ہر کثرت ز بندِ وحدت است — وحدتِ مسلم ز دینِ فطرت است

۱؎ احلَّ اُمّتَہ فی حرزِ ملّتِہ — کاللیثِ حلَّ مع الاشبالِ فی اَجَمٖ

(قصیدہ بردہ)

دینِ فطرت از نبی آموختیم
در رہِ حق مشعلے افروختیم

این گہر از بحرِ بے پایانِ اوست
ما کہ یکجائیم از احسانِ اوست

تا نہ این وحدت ز دست ما رود
ہستیٔ ما با ابد ہمدم شود

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولِ ما رسالت ختم کرد

رونق از ما محفلِ ایام را
او رسل را ختم و ما اقوام را (۱)

خدمتِ ساقی گری با ما گذاشت
دادِ ما را آخریں جامے کہ داشت

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ ز احسانِ خداست
پردۂ ناموسِ دینِ مصطفےٰ است

قوم را سرمایۂ قوّت ازو
حفظِ سرِّ وحدتِ ملّت ازو

حق تعالیٰ نقشِ ہر دعویٰ شکست
تا ابد اسلام را شیرازہ بست

دل ز غیر اللہ مسلماں بر کند
نعرۂ لَا قَوْمَ بَعْدِیْ می زند

(فصل ششم)

تمہید:۔ اس فصل میں اقبالؔ نے یہ بتایا ہے کہ ہماری قومیت کی بنیاد، وطن یا کوئی جغرافیائی خطہ یا نسل یا رنگ یا زبان نہیں ہے بلکہ رسالت ہے یعنی ہمیں حضرت ابراہیمؑ نے توحید کا سبق پڑھا کر ایک ملّت (قوم) بنا دیا۔

لے لسما دھا اللہ دا عینا الطاعتہ   یا اکرم الرسل کنا اکرم الامم (بصیری)؟

پہلا اور دوسرا شعر — حضرت ابراہیمؑ نے تمام فانی چیزوں سے قطع تعلق کر لیا تھا اور ایک خدا کو اپنا مقصود بنا لیا تھا اسی لئے تمام انبیاء انہی کے نقشِ قدم پر چلے اور ان کا وجود بلا شبہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا ایک زبردست نشان تھا۔

ان تین صفات کا بیان کرنے کے بعد اقبال کہتے ہیں کہ حضرت موصوفؑ اپنے دل میں آرزو رکھتے تھے کہ میں ایک قوم بناؤں ایسی قوم جو بتوں کے بجائے خدائے واحد کی پرستار ہو۔

اقبال نے اس بحث کو "تارک آفل" سے شروع کیا ہے اور اس میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ اگر حضرت ابراہیمؑ بت پرستی سے نفور نہ ہوتے تو اُن کے دل میں قوم سازی کا داعیہ ہی پیدا نہ ہوتا۔

حضرت ابراہیمؑ کو حنیف بھی کہا گیا ہے یعنی باطل کو چھوڑ کر حق کی طرف مائل ہونے والا۔ اس لقب سے بھی یہی نکتہ مستفاد ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ چونکہ باطل اور باطل پرستی دونوں سے متنفر تھے اس لئے اس کی بیخ کنی اور حق کی اشاعت کے لئے ایک قوم بنانی چاہتے تھے۔

تارک آفل کی ترکیب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ملت ابراہیمی میں داخلہ کے لئے غروب ہو جانے والوں (آفلین) سے قطع تعلق کرنا پہلی شرط ہے۔ یعنی مسلمان وہ ہے جو کسی فانی شئے کو محبوب نہ بنائے اور چونکہ کائنات میں ہر شئے فانی ہے اس لئے وہ کسی شئے کو محبوب نہیں بنا سکتا۔ بالفاظِ دگر غیر اللہ سے محبت کرنے والا مسلمان نہیں ہو سکتا۔

تیسرا شعر:۔ کسی عظیم الشان کام میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے صرف "آرزو" کافی نہیں ہے۔ اس کے لئے انتہائی والہانہ جذبہ کی ضرورت ہے اس جذبہ کو اقبال نے یوں واضح کیا ہے۔

ع جوئے اشک از چشم بیخوابش چکید

یعنی وہ رات دن اللہ تعالیٰ کے درگاہ میں اپنا دردِ دل (آرزو) بیان کرتے رہتے تھے بلکہ آنسوں کو اٹھ اٹھ کر اس کی بارگاہ میں ہدیۂ اشک پیش کرتے تھے۔

جب حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے جذبِ صادق اور عزمِ بالجزم کا اظہار ہوا تو سنۃ اللہ کے مطابق دریائے رحمت جوش میں آگیا۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کی عادت شریفہ یہ ہے کہ پہلے بندہ کی طرف سے شدید آرزو (طلب صادق) کا اظہار ہونا چاہیئے۔ جب وہ اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں انقلاب برپا کرے گا تو اللہ تعالیٰ خارج میں انقلاب برپا کرنے کی توفیق اور طاقت عطا فرمائے گا۔

میں نے اس نکتہ کی صراحت اس لئے کردی کہ شومئی قسمت سے ہم مسلمان اللہ تعالیٰ کے اس قانون سے بالکل بیگانہ ہو چکے ہیں کہ

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ

اس کا ترجمہ محترمی مولینا ظفر علی خاں صاحب نے یوں کیا ہے:۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

یعنی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت میں انقلاب پیدا نہیں کرتا جب تک

وہ قوم پہلے خود اپنے اندر، انقلاب پیدا نہ کرلے ۔ اسی فلسفہ کو مرشد رومیؒ نے یوں بیان فرمایا ہے :۔

تا نگرید کودکِ حلوہ فروش

بحرِ رحمت ۔۔ کے ہمی آید بجوش

قصہ مختصر جب حضرت ابراہیم کی طرف سے طلبِ صادق کا اظہار ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو قوم سازی کا عملی طریقہ بتا دیا ۔ اور وہ طریقہ اس میں مذکور ہے :۔

وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ (۲ : ۱۲۵)

اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کی طرف حکم بھیجا کہ میرے (اس) گھر کو خوب پاک و صاف رکھا کرو بیرونی اور مقامی لوگوں کی عبادت کے لئے اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے واسطے ۱۲

اس آیت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو یہ حکم دیا کہ ، میرے گھر کو پاک کرو ، یعنی مسجد کو اپنی جدوجہد کا مرکز بناؤ یا بالفاظِ دگر میرے نام پر قوم کی بنیاد رکھو ۔

چوتھا شعر :۔ یہ حکم پا کر حضرت ابراہیمؑ نے قوم سازی کے لئے وہ جگہ اختیار کی جو غیر آباد تھی یعنی

ع بہرِ ما ویرانہ آباد کر

اور وہاں اللہ کی عبادت کرنے والوں کے لئے ایک گھر بنایا ۔ جیسا کہ اس آیت سے واضح ہوتا ہے :۔

رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ ۙ (۱۴: ۳۷)

اے میرے رب! میں اپنی اولاد کو آپ کے معظم گھر کے قریب ایک کفِ دست میدان میں جو زراعت کے قابل بھی نہیں ہے، آباد کرتا ہوں۔

وادیٔ غیرِ ذی زرعٍ کے انتخاب میں یہ حکمت پوشیدہ تھی کہ وہاں تنازع للبقا اور جدوجہد کے لئے تو کافی مواقع حاصل ہو سکتے تھے لیکن غیر معروف اور غیر آباد ہونے کی وجہ سے ابتدائی مراحل میں مخالفت کے امکانات بہت کم تھے اور یہ وہ نکتہ ہے جو ہر زمانہ میں کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اگر ابتدا ہی میں مخالفت کا بازار گرم ہو جائے تو کامیابی بہت دشوار ہو جاتی ہے۔

پانچواں شعر:۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ تعمیر کر کے قوم کی بنیاد رکھدی تو اب روحانیت کی آخری منزل آگئی یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ اے مولا کریم! میں نے تجھ پر بھروسہ کر کے قوم کی بنیاد تو رکھدی ہے لیکن جب تک تو ہمارے حال پر نگاہِ کرم مبذول نہ فرمائے ہم کامیاب نہیں ہو سکتے یعنی جب تک تو اسباب مہیا نہ فرمائے قوم بقا نصیب نہیں ہو سکتی۔

رَبَّنَا وَاجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَیۡنِ لَکَ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّۃً مُّسۡلِمَۃً لَّکَ ۪ وَتُبۡ عَلَیۡنَا ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ (۲: ۱۲۸)

اے ہمارے رب! ہمیں اپنا مطیع بنا لیجئے اور ہماری اولاد میں سے ایک جماعت ایسی پیدا کر دیجئے جو آپ کی فرمانبردار ہو اور ہمارے حال پر توجہ رکھئے اور بلاشبہ آپ ہی ہیں توجہ فرمانے والے اور مہربانی کرنے والے۔ (۲- ۱۲۸)

یعنی حضرت ابراہیمؑ اللہ تعالیٰ سے یہ التجا کرتے ہیں کہ ہمیں مقبول التوبہ (وہ شخص جس کی توبہ قبول ہو سکے) بنا دیجئے۔

واضح ہو کہ توبہ کی قبولیت کی شرائط حسب ذیل ہیں:۔

(۱) سب سے پہلے رجوع الی اللہ کا جذبہ پیدا ہونا چاہیئے۔

(۲) پھر اس پر استقامت ہونی چاہیئے۔

(۳) اس مقام کے بعد اللہ تعالیٰ اصلاح کا سامان پیدا کر دیتا ہے وہ اس طرح کہ یا تو کوئی مربی مل جاتا ہے یا خود انابت الی اللہ کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

(۴) تربیت یا انابت سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔

(۵) تقویٰ سے تزکیۂ نفس ہو جاتا ہے۔

(۶) تزکیۂ نفس کے بعد انسان مقبول التوبہ ہو جاتا ہے۔ یعنی مقرب بارگاہِ الٰہی بن جاتا ہے۔

نوٹ:۔ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس کے ابتدائی افراد میں یہ سب خوبیاں جمع کر دیتا ہے۔

چنانچہ مَاشَاءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کا یہی مفہوم ہے۔

اب اس شعر کا مطلب واضح ہو گیا کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوتِ قدسی کی بنا پر (جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوئی تھی) قوم کے افراد کا تزکیہ نفس کر دیا تو "تُبْ عَلَيْنَا" کے نہال میں کلیاں کھلنے لگیں یعنی قوم مقرب بارگاہِ ایزدی ہو گئی۔ یعنی ترقی کی راہ پر گامزن ہو گئی اور اسی ترقی کو اقبال نے "صورتِ کارِ بہار ما" سے تعبیر کیا ہے۔

واضح ہو کہ ان ابتدائی پانچ شعروں میں اقبال نے ملّتِ اسلامیہ کی پیدائش کا فلسفہ بیان کیا ہے چونکہ قرآنِ حکیم کے مطالعہ کی بدولت ان کی نگاہ حقیقت رس ہو گئی تھی اس لئے انھوں نے قوم کا فلسفہ بالکل صحیح سمجھا کہ قرآن کی رُو سے ملّتِ اسلامیہ کی بنیاد، دینِ اسلام یا عقیدہ توحید ہے نہ کہ وطن۔ سچی بات یہ ہے کہ وطن نہ تو مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ تعلیم قرآن کی رُوح کے سراسر خلاف ہے۔

کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے ملّتِ اسلامیہ کا پیکر تیار کیا۔ اور رسالت کے ذریعہ سے اس میں رُوح پھونکی، یعنی ملّت کا وجود رسول کے دم سے ہے۔ رسول نہ ہو تو ملّت بھی موجود نہیں ہو سکتی۔

رسول نے ہمیں وجود بھی عطا کیا، دین بھی اور آئین بھی اور آپ ہی کے سبب سے ہماری کثرت میں وحدت کی شان پیدا ہوئی اور آپ ہی وہ رابطہ ہیں جس کی بدولت ہمارے اجزاء (افراد) لاینفک ہو گئے ہیں۔ یعنی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔

اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور مشیت کی بنا پر، رسالت کو ہمارے وجود کی حفاظت کے لئے حلقہ بنا دیا۔

یہاں اس مصرع میں حلقہ سے حدِ فاصل مراد ہے یعنی حضورؐ کا وجود، کفر اور اسلام کے لئے ما بہ الامتیاز ہے۔ جو شخص آپؐ پر ایمان لاتا ہے مومن ہے اور جو شخص آپؐ کی رسالت اور خاتمیّت کا انکار کرتا ہے کافر ہے۔

حلقۂ ملت محدود نہیں ہے۔ بلکہ ترقی پذیر ہے اس میں بڑھنے اور پھیلنے کی صلاحیت ہے اور وادیٔ بطحا اس دائرہ کا مرکز ہے۔ ہم اسی وادی (مکہ مکرمہ) کی نسبت سے ایک ملت ہیں اور ہمارا وجود اسی مقدس شہر بلکہ بیت الحرام سے وابستہ ہے۔ خانہ کعبہ کو سمندر قرار دیا جائے تو ہم مسلمان اس سمندر کی موجیں ہیں اور جس طرح موجیں سمندر سے جدا نہیں ہو سکتیں ہم خانہ کعبہ سے جدا نہیں ہو سکتے۔ اگر ہم حرم کعبہ سے اپنا تعلق منقطع کرلیں تو ملتِ اسلامیہ کی حیثیت سے ہمارا وجود ختم ہو جائے گا۔

مسلمانانِ عالم، حرمِ کعبہ کی دیوار کی حفاظت میں ساری دنیا میں اس طرح نعرہ زن ہیں۔ جس طرح شیر اپنی کچھار میں ڈکارتا ہے۔

اقبال نے اس شعر کا مضمون قصیدہ بردہ کے اس شعر سے لیا ہے:۔

اَحَلَّ اُمَّتَہٗ فِی حِرْزِ مِلَّتِہٖ
کَاللَّیْثِ حَلَّ مَعَ الْاَشْبَالِ فِی اَجَمٖ

آپؐ نے اتارا اپنی قوم کو اپنے دین کے مضبوط قلعہ میں جیسے شیر اپنے بچوں کو ساتھ لے کر اپنی کچھار میں فروکش ہوتا ہے۔

اس کے بعد اقبال ہمیں عشقِ رسولؐ کا درس دیتے ہیں۔ یہ اشعار بہت غور طلب ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنی ساری عمر انہی اشعار کی تشریح د توضیح میں بسر کردی۔ کہتے ہیں کہ اے مخاطب! اگر تو میری بات کا مطلب سمجھ سکے اور حضرت صدیق اکبرؓ کی نگاہ سے دیکھ سکے تو حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی تیرے قلب و جگر کی تقویت کا موجب بن سکتی ہے۔ یعنی حضورؐ کا نام

نامی تیری زیست کا سہارا بن سکتا ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ

از خدا محبوب تر گردد نبی

یعنی اگر کوئی مسلمان صدیقِ اکبرؓ کا سا ایمان پیدا کرے تو سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی نظر میں اللہ تعالیٰ سے بھی زیادہ محبوب ہو جائیں گے۔

نوٹ:۔ اگر کوئی شخص اس زمانہ میں دیدۂ صدیقؓ پیدا کرنے کا آرزو مند ہو تو اس کی صورت یہ ہے کہ مرشد کی صحبت میں بیٹھ کر اس مقام صدیقیت تک پہنچنے کا طریقہ سیکھ لے۔

واضح ہو کہ صدیقیت سلوک میں وہ مقام ہے جس کو حاصل کئے بغیر کوئی شخص حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچ سکتا۔

علامہ اقبالؔ نے اس مصرع میں شاعری نہیں کی ہے بلکہ اپنا عقیدہ بیان کر دیا ہے۔ میں اپنے ذاتی علم کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ مرحوم، سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ محبوب رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ انھوں نے مجھ سے کہا تھا:

"میں نے اللہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے فرمانے سے اللہ تسلیم کیا ورنہ انسانی عقل نہ اللہ تک پہنچ سکتی ہے اور نہ اسے اللہ (خالق) تسلیم کر سکتی ہے، عقل کا منتہائے پرواز تشکیک کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔"

نیز پیامِ مشرق میں لکھتے ہیں:۔

با خدا در پردہ گویم با تو گویم آشکار
یا رسول اللہ! او پنہاں و تو پیدائے من

یعنی اللہ کو نہ میں نے دیکھا ہے نہ کسی اور نے، لیکن آپؐ کو میں نے دیکھا ہے اس لئے میں اللہ سے تو بالواسطہ ہی عرض کرتا ہوں ہاں آپؐ سے بلا واسطہ (بالمشافہ) اپنا حال دل بیان کرتا ہوں۔

آپؐ نے جو کتاب دنیا کو عطا فرمائی ہے وہ مومن کے دل کے لئے بلا شبہ موجبِ تقویت ہے اور اس کی "حکمت" ملتِ اسلامیہ کے حق میں وہی حیثیت رکھتی ہے جو شہ رگ انسان کے حق میں۔ یعنی اس کی حکمت، ملتِ اسلامیہ کی زندگی کا سبب ہے۔

حکمت کا لفظ اس آیت سے ماخوذ ہے:۔

یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۚ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے ایک عظیم الشان رسول کو مبعوث کیا ہے جو انسانوں کو ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور اُن کا تزکیہ کرتا ہے۔ اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔

اس آیت میں کتاب اور حکمت دو لفظ آئے ہیں۔ کتاب سے قرآنِ حکیم مراد ہے اور حکمت سے سنّتِ نبویؐ مراد ہے۔ اس لئے اس مصرع کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر ملتِ اسلامیہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سُنّت کو ترک کر دے تو فنا ہو جائے گی۔ چنانچہ اگلے شعروں میں اقبالؔ نے خود اس مصرع کی تشریح کر دی ہے کہ اگر ملتِ اسلامیہ آپؐ کا دامن چھوڑ دے تو فنا ہو جائے گی۔ قوم کو آپؐ ہی کے دم سے زندگی نصیب ہوئی ہے۔ کہتے ہیں کہ فرد تو اللہ کے حکم سے یا اس کی صفت قیومیت کی بدولت زندہ ہے، لیکن ملت (قوم) اسلامیہ محض آپؐ کے وجود باجود کے

سہارے قائم ہے۔ آپ نہ ہوتے، تو ملتِ اسلامیہ کہاں ہوتی۔

نوٹ:۔ اس شعر کو منطقی پیمانہ سے نہیں ناپنا چاہیئے۔ کیونکہ اقبال ہم سے بہتر جانتے تھے کہ فرد اور ملت دونوں کی زندگی اللہ تعالیٰ ہی کی صفتِ خالقیت ربوبیت اور قیوسیت پر منحصر ہے۔ یہاں جو انہوں نے تفریق کی ہے، وہ شاعرانہ اندازِ بیان پر مبنی ہے۔ یعنی انہوں نے اس حقیقت کو کہ اگر آپؐ نہ ہوتے تو ملت بھی نہ ہوتی۔ اور آج بھی اگر ملت زندہ ہے تو آپؐ ہی کے دم سے زندہ ہے۔ اس انداز سے بیان کیا کہ اس میں بڑی دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔

اب اقبالؔ تیسری بات کہتے ہیں۔ اس سے پہلے وہ دو باتیں کہہ چکے ہیں۔ (۱) ملتِ اسلامیہ کی پیدائش (۲) حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ۔ وہ تیسری بات یہ ہے کہ۔

ہم مسلمان جو ایک قوم ہیں وہ محض اس لئے کہ ہم سب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا ہیں۔ ہمارے اندر جو یہ وحدت پائی جاتی ہے (یعنی ہم سب ہمنوا ہیں، ہم نفس ہیں اور ہم مدعا ہیں) اس کا سبب یہ ہے کہ ہم سب ایک ہی آقاؐ کے غلام ہیں۔

اگر بہت سے افراد ہم مدعا ہو جائیں، تو اُن میں وحدت پیدا ہو جاتی ہے اور اگر اس وحدت میں پختگی پیدا ہو جائے تو پھر وہ سب ایک قوم بن جاتے ہیں۔

ہر کثرت یعنی ہر جماعت (قوم) وحدتِ افکار و کرداری کی بدولت زندہ رہ سکتی ہے۔

مسلمانوں کی وحدت کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ وہ سب دینِ فطرت

کے پیرو ہیں، اور اس دینِ فطرت نے ان میں وحدتِ افکار و کردار پیدا کر دی ہے۔

اور دینِ فطرت کی تعلیم جو نعمتِ کبریٰ ہے، ہمیں سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت نصیب ہوئی۔ یہ موتی ہمیں حضورؐ ہی کی مہربانی کی بدولت حاصل ہوا۔ اور یہ آپؐ ہی کا احسان ہے کہ ہم ایک قوم ہیں۔

آخر میں اقبالؔ نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ جس طرح حضورؐ خاتم الانبیاء ہیں، اسی طرح آپؐ کی قوم خاتم الاقوام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہم پر شریعت ختم کر دی یعنی اب کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اب قیامت تک دُنیا کی رونق ہمارے ہی دم سے ہے۔

ع   او رسل را ختم و ما اقوام را

یعنی آپؐ پر رسولوں کا خاتمہ ہو گیا، اور ہم پر قوموں کا۔

نوٹ:۔ یہ شعر قصیدہ بردہ کے اس شعر سے ماخوذ ہے:۔

لَمَّا دَعَا اللّٰہُ دَاعِیْنَا لِطَاعَتِہٖ   بِاَکْرَمِ الرُّسْلِ کُنَّا اَکْرَمَ الْاُمَمٖ

جب اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو جو ہمیں اللہ کی اطاعت کی طرف بلاتے ہیں، سب رسولوں کا سردار (اکرم الرسل) کہہ کر پکارا تو ہم (قدرتی طور پر) سب قوموں کے سردار ہو گئے۔ ۱۲

اللہ نے اپنے میخانہ کا آخری جام ہمیں عطا فرما دیا۔ اب ہم ہی قیامت تک ساری دُنیا کو اس جام (شریعتِ محمدیہ) سے سیراب کرتے رہیں گے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ ارشاد فرمایا کہ:۔
"اَنَا خَاتِمُ النَّبِیِّیْنَ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ"
میں سلسلہ انبیاء کا ختم کرنے والا ہوں۔ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔
یہ ارشاد حضورؐ کے دین کی عزت کا محافظ ہے۔ یعنی قیامت تک کوئی شخص آپؐ کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

اللہ تعالیٰ نے ہر مدعی نبوت کے دعویٰ کو باطل کر دیا۔ اس لئے قیامت تک دینِ اسلام ہی کا سکہ رواں رہے گا۔

یہ مصرع اس آیت سے ماخوذ ہے:۔
مَاکَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ
یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ بلکہ آپؐ تو اللہ کے رسول ہیں اور انبیاء کے ختم کرنے والے ہیں۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی آیت کی تفسیر میں "لا نبی بعدی" فرمایا۔ یعنی میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

نوٹ:۔ جو مسلمان، حضورِ انورؐ کے بعد کسی شخص کو نبی تسلیم کرے۔ ظلی یا بروزی، حقیقی یا مجازی، تشریعی یا غیر تشریعی مستقل یا غیر مستقل۔ وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

در معنیٔ این کہ مقصودِ رسالتِ محمدیّہ تشکیل و تاسیسِ حرّیت و مساوات و اخوّتِ بنی نوعِ آدم است

بود انساں در جہاں انساں پرست — ناکس و نابود مند و زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش — بندہا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر — بہرِ یک نخچیر صد نخچیر گیر
صاحبِ اورنگ و ہم پیرِ کنشت — باج بر کشتِ خرابِ او نوشت
در کلیسا اسقفِ رضواں فروش — بہرِ ایں صیدِ زبوں دامے بدوش
برہمن گل از خیابانش ببرد — خرمنش مغ زادہ با آتش سپرد
از غلامی فطرتِ او دوں شدہ — نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ
تا امینے حق بحق داراں سپرد — بندگاں را مسندِ خاقاں سپرد
شعلہ ہا از مردہ خاکستر گشاد — کوہکن را پایۂ پرویز داد
اعتبارِ کار بنداں را فزود — خواجگی از کار فرمایاں ربود
قوتِ او ہر کہن پیکر شکست — نوعِ انساں را حصارِ تازہ بست

تازہ جاں اندر تنِ آدم دمید — بندہ را باز از خداونداں خرید
زادنِ او مرگِ دنیائے کہن — مرگِ آتش خانہ و دیر و شمن
حرّیت زاد از ضمیرِ پاکِ او — ایں مئے نوشیں چکید از تاکِ او
عصرِ نو کایں صد چراغ آوردہ است — چشم در آغوشِ او وا کردہ است
نقشِ نو بر صفحۂ ہستی کشید — اُمّتے گیتی کشائے آفرید
اُمّتے از ما سوا بیگانۂ — بر چراغِ مصطفیٰ پروانۂ
اُمّتے از گرمیِ حق سینہ تاب — ذرّہ اش شمعِ حریمِ آفتاب
کائنات از کیفِ او رنگیں شدہ — کعبہ ہا بتخانہ ہائے چیں شدہ
مرسلان و انبیا آبائے او — (۱) اکرمِ او نزدِ حق اتقائے او
کلّ مؤمنٍ اخوۃٌ اندر دلش — حرّیت سرمایۂ آب و گلش
ناشکیب از امتیازات آمدہ — در نہادِ او مساوات آمدہ
ہمچو سرو آزاد فرزندانِ او — (۲) پختہ از قالوا بلیٰ پیمانِ او

سجدۂ حق گل بسیمایش زدہ
ماہ و انجم بوسہ بر پایش زدہ

(فصل ہفتم)

غایتِ رسالتِ محمّدیہ

تمہید:- یہ فصل اس لحاظ سے ساری کتاب کی جان ہے کہ اس میں اقبال نے رسالت محمّدیہ کی غایت بیان کی ہے۔ یعنی حضور اکرم صلی اللہ

---

(۱) اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (آیہ شریفہ) (۲) اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی (آیہ شریفہ) ۱۲-

علیہ وسلّم کی بعثت کا مقصود یہ ہے کہ انسان کو وہ تین نعمتیں حاصل ہو جائیں جن کی بدولت وہ اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک پہنچا سکے۔ وہ نعمار حسبِ ذیل ہیں:۔

حُرّیت، اخوّت اور مساوات۔

خودی کے دو پہلو ہیں:۔ (۱) انفرادی خودی (۲) اجتماعی خودی۔

انفرادی خودی کی تکمیل حُرّیت سے، اور

اجتماعی خودی کی تکمیل اخوت اور مساوات سے ہوتی ہے۔

انسان کی تخلیق کی غایت یہ ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے۔ لیکن اگر وہ کسی اعتبار سے بھی دوسروں کا غلام ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں کر سکتا۔ اس لئے حُرّیت حصولِ مقصد کے لئے شرطِ اوّلین ہے۔

چونکہ اسلام فرد کے علاوہ جماعت کی تربیت کا بھی ضامن ہے۔ اور ہیئتِ اجتماعیہ کی نشو و نما اور ترقی، اخوت اور مساوات کے بغیر ناممکن ہے۔ اس لئے اسلام نے انسان کو نعمائے سہ گانہ سے مالامال فرمایا ہے۔

قرآنِ حکیم کے علاوہ دُنیا میں جس قدر مذہبی کتابیں موجود ہیں، ان میں سے کسی کتاب میں حرّیت کی تعلیم نہیں ملتی۔ بعض کتابوں میں اخوّت یا مساوات کی تعلیم ضرور موجود ہے لیکن وہ بھی ناقص اور مبہم ہے۔

قرآنِ حکیم کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس زندہ کتاب نے دنیا کو پہلی مرتبہ حقیقی حُرّیت، اخوت اور مساوات کی تعلیم سے آشنا کیا۔ اور اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ وہ قوانین بھی نافذ فرمائے جن کی بدولت

یہ اصولِ سہ گانہ زندہ رہ سکتے ہیں۔ اور یہی وہ خصوصیت ہے جو قرآنی تعلیمات کو تمام مذاہبِ عالم کی تعلیمات پر تفوّق عطا کر دیتی ہے۔

اس کی تشریح یہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے صرف اس بات کے اعلان پر اکتفا نہیں کیا کہ انسان کو حُریّت کی نعمت عطا کی جاتی ہے۔ بلکہ اُن تمام مفاسد کا بھی سدِّباب کر دیا جو انسان کو حُریّت سے محروم کر سکتے ہیں۔ مثلاً

(۱) تعدادِ الٰہ یا شرک کی مختلف صورتیں انسان کو حُریّت سے محروم کر دیتی ہیں۔ اس لئے قرآنِ حکیم نے شرک کی تمام صورتوں کو باطل قرار دے دیا۔

(۲) ملوکیّت اور اس کی مختلف صورتیں انسان کو حُریّت سے محروم کر دیتی ہیں۔ چنانچہ سب جانتے ہیں کہ سلاطین، بنی آدم کو اپنا مطیع بنانا چاہتے ہیں۔ اور کوئی شخص دو آقاؤں کو خوش نہیں رکھ سکتا۔ اس لئے قرآن نے ملوکیّت اور اس کی تمام صورتوں کو باطل قرار دیدیا۔ چنانچہ اسلام کا ہر طالب علم اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ:۔

"لَا مُلُوْکِیَّتَ فِی الْاِسْلَامِ"

(۳) مذہبی پیشوا، تارکینِ دُنیا (راہب) کاہن اور نجومی، احبار، اور اغنیار بھی انسانوں کو حرّیت سے محروم کر دیتے ہیں۔ اس لئے اسلام نے ان تمام گروہوں کی مذمّت فرمائی ہے۔ چنانچہ اُس نے بزرگی اور فضیلت کا معیّار یہ قرار دیا کہ:۔

"اَکْرَمُکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ"

یعنی مسلمانوں میں سب سے زیادہ مکرم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔

مذاہبِ عالم کی تاریخ شاہد ہے کہ ان گروہوں نے مختلف طریقوں سے انسانوں کو خدا کی اطاعت کے بجائے اپنی اطاعت پر مجبور کیا۔ ہنود میں پنڈتوں اور پروہتوں کا طبقہ، یہود میں احبار کا طبقہ، نصاریٰ میں پادریوں کا طبقہ، اور مجوسیوں میں موبدوں کا طبقہ، ہر زمانہ میں اپنے پیروؤں کے دل و دماغ پر حکمراں رہا ہے۔ اسلام چونکہ انسان کو صرف اللہ کا غلام بنانا چاہتا ہے۔ اس لئے اُس نے بنی آدم کو ان تمام طبقات کی غلامی سے رہائی عطا کی، اور انہیں دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ حریت کی نعمت سے مالا مال کیا۔

یورپ نے جس نعمت سے انسانوں کو اٹھارویں صدی عیسوی میں آشنا کیا، اسلام نے وہ نعمت ساتویں صدی میں عام کردی تھی۔ اور اگر انقلاب فرانس کا موازنہ اُس انقلاب سے کیا جائے جو نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتویں صدی میں پیدا کیا تھا، تو معلوم ہوگا کہ جس جامعیت کے ساتھ حضورؐ نے حرّیت، اخوت اور مساوات کی تعلیم دنیا کو دی، اُس کی نظیر یورپ باایں ہمہ ادعائے ترقی آج بھی پیش نہیں کر سکتا۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ یورپ نے دُنیا کو صرف سیاسی حریت سے آشنا کیا۔ لیکن اسلام نے انسان کو حریت کی جملہ اصناف سے مالا مال کیا ہے۔ مثلاً

(۱) حریتِ نفس۔ یعنی ہر انسان اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوتا ہے۔

(۲) حریتِ ضمیر۔ یعنی دین کے معاملہ میں ہر شخص آزاد ہے۔ کوئی کسی پر جبر

نہیں کر سکتا۔

(۳) حُرّیت علم۔ یعنی ہر شخص حصولِ علم میں آزاد ہے۔ کوئی شخص کسی پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کر سکتا۔ مثلاً ہندو دھرم میں شودر وید کا علم حاصل نہیں کر سکتا۔

(۴) حریتِ عقل۔ یعنی ہر شخص کو غور و فکر اور اپنے خیالات کے اظہار کی آزادی حاصل ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کوئی بات دوسروں سے زبردستی نہیں منواتا۔ وہ خود بھی دلائل پیش کرتا ہے اور مخالفین سے بھی اسی چیز کا مطالبہ کرتا ہے۔

(۵) حریتِ عمل۔ یعنی ہر شخص کو عمل اور ترقی کی آزادی حاصل ہے۔

(۶) حریتِ وطن۔ یعنی ہر شخص جس خطۂ زمین کو چاہے اپنا وطن بنا سکتا ہے۔

اِن تصریحات پر غور کرنے سے یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اسلام دنیا میں حُرّیت کا سب سے بڑا علمبردار ہے اور اس نے انسان کو اس نعمت سے اسی لئے مالا مال کیا ہے کہ وہ دلجمعی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر سکے۔ اور اس طرح اپنی خودی کی تربیت کر کے اُسے مرتبۂ کمال تک پہنچا سکے۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ حریت، توحید الٰہی کے عقیدہ کی لازمی فرع ہے۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا مطلب ہی یہ ہے کہ کائنات میں اللہ کے سوا اور کوئی ہستی مجھ پر حکمراں نہیں ہے۔ اور جب یہ بات مسلّم ہو گئی تو لامحالہ انسان کو حریت کی نعمت حاصل ہو جائے گی۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ

(۱) توحید سے حریت پیدا ہوتی ہے۔

(۲) حریت کا منطقی نتیجہ مساواتِ نسلِ انسانی ہے، کیونکہ جب تمام انسان ایک خدا کے بندے ہیں، اور کوئی انسان کسی دوسرے کا غلام نہیں ہے تولامحالہ سب انسان برابر ہیں۔

(۳) مساوات کا منطقی نتیجہ اخوت ہے۔ کیونکہ اگر تمام انسان ہم رتبہ ہیں، تو سب آپس میں بھائی ہیں۔

نوٹ:۔ قرآنِ حکیم نے اخوت کے لئے ایمان کی قید عائد کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ایک شخص اللہ اور اُس کے رسولؐ پر ایمان نہ لائے، تو وہ خود اپنے آپ کو حریتِ کاملہ سے محروم کر دیتا ہے، اور جب وہ حریت سے محروم ہوگیا، تو مساوات اور اخوت سے لازمی طور پر محروم ہو جائے گا۔

اِس مختصر تمہید کے بعد اب اس فصل کا مطلب بیان کرتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ بعثتِ نبویؐ سے پہلے انسان خدا پرستی کے بجائے کسی نہ کسی شکل میں انسان پرستی کرتا تھا۔

(۲) یا تو کسریٰ و قیصر (بادشاہوں) کا غلام تھا۔

(ب) یا کاہنوں، نجومیوں، جوتشیوں اور رمّالوں کے طلسم میں گرفتار تھا۔

(ج) یا پوپوں، پادریوں، راہبوں، پنڈتوں، پروہتوں، برہمنوں، سنیاسیوں کے پھندے میں پھنسا ہوا تھا۔

مختصر یہ کہ خدا کے بجائے انسانوں کی غلامی کرتا تھا۔ اور اس غلامی کی وجہ سے اس کی فطرت مسخ ہو چکی تھی۔

ساتویں صدی عیسوی میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بنی آدم کو انسانوں کی غلامی سے رہائی عطا فرمائی اور ان لوگوں کو جو کل تک بادشاہوں کے غلام تھے، خود حکمراں بنا دیا۔

"آپؐ کی تعلیم نے مُردوں کو زندہ کر دیا۔ اور مزدوروں، غلاموں، مسکینوں اور ادنیٰ درجے کے لوگوں کو بادشاہوں (پرویز) کا ہم پلّہ بنا دیا۔ بادشاہوں کو بادشاہی سے معزول کر دیا۔ یعنی آپؐ نے اعلان فرمایا کہ:۔ کوئی شخص کسی انسان کو اپنا غلام نہیں بنا سکتا (خواجگی از کار فرمایاں ربود) اور اس طرح غلاموں (کارندیاں) کا مرتبہ بڑھایا۔

آپؐ کی ولادت (بعثت) سے دُنیائے کہن کے فرسودہ نظام کا خاتمہ ہو گیا۔ اور آپ کا پیغام مجوسیت (آتش خانہ) بُت پرستی (دیر) اور بتوں (شمن) کے حق میں پیامِ موت بن گیا۔ یعنی آپؐ نے دُنیا سے کفر، شرک اور بُت پرستی کا خاتمہ کر دیا۔

شمن سنسکرت کا لفظ ہے جو قدیم فارسی میں بُت پرستی اور بُت دونوں معنوں میں مستعمل ہے۔

حریت (حقیقی آزادی) آپؐ ہی کی تعلیمات کا ثمرِ نورس ہے۔ عقیدۂ توحید الٰہی انسان کو حریت کی دولت عطا کر دیتا ہے۔ کافر اور مشرک کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے حریت سے متمتع ہونا عقلاً محال ہے۔ چنانچہ تمہید میں اس کی تشریح ہدیۂ ناظرین کر چکا ہوں۔

عصرِ حاضر میں جس قدر روشنی پائی جاتی ہے۔ یہ سب حضورِ اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کی روشن کردہ شمع کا فیض ہے۔ یعنی علوم و فنون میں جو کچھ ترقی ہوئی ہے یہ سب اسلامی تعلیمات کا بالواسطہ ثمرہ ہے۔

آپؐ نے دنیا کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ فرمایا یعنی آپؐ نے ایک ایسی امت (قوم) پیدا کردی جو گیتی کشا ہے۔ ماسوا سے بیگانہ ہے جس کا سینہ خدا کی محبت سے منوّر ہے اور جس نے دنیا کو عشقِ الٰہی کا پیغام سنایا۔ جس کی مستی نے اس کائنات کو رنگین بنادیا۔ اور بتخانوں کو "کعبہ" یعنی اللہ کے گھروں میں تبدیل کردیا جس نے دُنیا کو مجد و شرف کا نیا معیار عطا کیا۔ یعنی عزت کے لائق وہ انسان نہیں ہے جو صاحبِ تاج و نگیں ہو، یا وہ دولت مند ہو، یا پیرزادہ ہو، یا برہمن زادہ ہو، یا سفید فام ہو، یا عرب کا باشندہ ہو، یا کسی نبی کی اولاد ہو، یا کسی قبیلہ کا سردار ہو، یا بڑا فلسفی اور منطقی ہو۔ بلکہ حقیقی معنوں میں عزت اور احترام کے قابل وہ انسان ہے جو متّقی ہو بالفاظِ دگر جو شخص سب سے زیادہ متقی ہے، وہی سب سے زیادہ واجب الاحترام ہے۔ اسلام میں بزرگی کا معیار تقویٰ ہے، نہ کہ ذات یا خاندان یا دولت۔

آپؐ نے یہ تعلیم دی کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ یعنی سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

اب رہی حریت تو مسلمان کا خمیر ہی حریت سے تیار ہوا ہے۔ یعنی حُریت تو اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ مسلمان اپنی ماں کے پیٹ سے حریّت کی نعمت ساتھ لے کر آتا ہے۔ (اگر وہ کفر اختیار کر کے اس نعمت کو زائل کردے تو یہ اس کا قصور ہے جس کے لئے وہ خود ذمہ دار ہے)

مسلمان کسی قسم کے امتیاز کو جو کافروں نے اپنا رکھے ہیں برداشت نہیں کر سکتا کیونکہ وہ حریت سے متمتع ہے اور حریت کا منطقی نتیجہ مساوات کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

جب مسلمان نے اللہ تعالیٰ کو اپنا "رب" یعنی خالق، رازق، مالک اور حاکم تسلیم کرلیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اس اطاعت کے صلہ میں حریت کی نعمت سے سرفراز فرمادیا۔ (پختہ از قالوبلیٰ پیمانِ او)

یعنی حریت اسلام لانے کا انعام ہے، جو ہر مسلمان کو بارگاہِ ایزدی سے عطا ہوتا ہے۔

حکایت بوعبیدہ و جابان در معنیٔ اخوتِ اسلامیہ

شد اسیرے مسلمے اندر نبرد (۱، ۲) قائدے از قائدانِ یزدجرد
گبر باراں دیدہ و عیار بود حیلہ جو و پُرفن و مکار بود
از مقامِ خود خبردارش نہ کرد ہم ز نامِ خود خبردارش نہ کرد
گفت میخواہم کہ جاں بخشی مرا چوں مُسلماناں اماں بخشی مرا
کرد مُسلم تیغ را اندر نیام گفت خونت ریختن بر من حرام
چوں درفشِ کاویانی چاک شد (۳) آتشِ اولادِ ساساں خاک شد
آشکارا شد کہ جاباں است او میرِ سر بازانِ ایران است او
قتلِ او از میرِ عسکر خواستند از فریبِ او سخن آراستند
بوعبید آں سیدِ فوجِ حجاز در دغا غرّش ز لشکر بے نیاز
گفت اے یاراں مسلمانیم ما تارِ چنگیم و یک آہنگیم ما
نعرۂ حیدرؓ نوائے بوذرؓ است گرچہ از حلقِ بلالؓ و قنبرؓ است
ہر یکے از ما امینِ ملت است صلح و کینش صلح و کینِ ملت است

(۱) قائد: سپہ سالار ۱۲ ۔ (۲) یزدجرد: نام شہنشاہِ ایران ۔ (۳) درفش کاویانی: ایرانی علم کا نام ۱۲۔

ملّت ار گردد اساسِ جانِ فرد
عہدِ ملّت می شود پیمانِ فرد

گرچہ جاباں دشمنِ ما بودہ است
مسلمے اورا اماں بخشودہ است

خونِ او اے معشرِ خیرالانام
بر دمِ تیغِ مسلماناں حرام

(فصل ہشتم)

تمہید:۔ مذکورہ بالا اصولِ سہ گانہ کی تفصیل کے بعد اقبالؔ نے اسلامی تاریخ سے تین واقعات منتخب کرکے درج کئے ہیں۔ تاکہ ناظرین کو یہ معلوم ہوسکے کہ حریت، مساوات اور اخوت کے اصول محض قیاسی یا نظری نہیں ہیں بلکہ قابلِ عمل ہیں اور ملّت نے اُن پر عمل کرکے دُنیا والوں پر اُن کی قدر و قیمت واضح کر دی ہے۔

پہلی حکایت

ایرانیوں سے جنگ کے سلسلہ میں[1] ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ایک مسلمان

---

[1] یہ واقعہ معرکۂ نمارق میں پیش آیا تھا۔ نمارق ملکِ عراق میں ایک مقام تھا۔ جہاں سنہ ۱۳ھ میں مسلمانوں اور ایرانیوں کے درمیان جنگ ہوئی تھی۔ حضرت ابوعبید ثقفی اس معرکہ میں سپہ سالار تھے۔ جابان نے اس مسلمان سپاہی سے یہ کہا تھا کہ اگر تم میری جان بخشی کر دگے تو میں تمہیں خوں بہا بھی دُوں گا اور دو جوان غلام بھی ۱۲۔

سپاہی نے ایرانی سردار کو گرفتار کرلیا۔ اس سردار نے یہ عیّاری کی کہ اس مسلمان کو اپنے مرتبہ سے آگاہ نہیں کیا اور بہت معصومانہ انداز میں اُس سے التجا کی کہ میری جاں بخشی کردو۔

یہ سُنکر اُس مُسلمان نے اپنی تلوار نیام میں کرلی۔ اور کہا کہ تیرا خون مجھ پر حرام ہے۔

جب ایرانیوں کو شکست ہوگئی، تو معلوم ہوا کہ یہ شخص تو شہنشاہِ ایران کی فوجوں کا سپہ سالار ہے۔ اور اس کا نام جابان ہے۔ مسلمانوں نے اپنے امیر سے درخواست کی کہ اس کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن حضرت ابوعبید ثقفی نے جو حجازی فوج کے سردار تھے، یہ فرمایا کہ اے دوستو! ہم مسلمان ہیں۔ اور اس لئے ہم سب ایک خیال و یک آہنگ و یک آواز و یک مقصد ہیں۔

اگر ہماری جماعت میں سے کوئی شخص، خواہ وہ اپنی اصل (سابقہ زندگی) کے لحاظ سے بلالؓ یا قنبرؓ ہی کیوں نہ ہو، یعنی قبل از اسلام غلام ہی کیوں نہ رہا ہو، کوئی بات کہدے یا کسی سے کوئی وعدہ کرلے یا کسی کو اپنا قول دیدے تو پھر اس کا قول ہمارے لئے اتنا ہی واجب الاحترام ہے۔ جتنا حضرت علیؓ یا حضرت ابوذر غفاریؓ کی زبان سے نکلا ہوا قول۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم سب برابر ہیں اور ہم سب ملّت کے امین (ذمہ دار) ہیں۔ اور اگر ہم میں سے ایک شخص کسی قوم سے صلح کرلے، تو ساری اُمتِ اسلامیہ کی اس قوم سے صلح ہو جائے گی۔ اور اسی طرح اگر ہماری جماعت کا کوئی فرد کسی قوم سے برسرِ پیکار ہو جائے تو پھر ساری ملّتِ محمدیہ اس قوم کے خلاف صف آرا ہو

جائے گی۔

اگر یہ صحیح ہے اور تمہیں مسلم ہے کہ ملّتِ اسلامیہ فرد کی جان کی بنیاد ہے یعنی فرد کی زندگی ملّت کی زندگی پر منحصر ہے، تو پھر فرد کا عہد، پوری ملّت کا عہد قرار پائے گا۔

بیشک جاپان ہمارا دشمن ہے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ایک مسلمان سپاہی نے اُسے امان دیدی ہے۔ لہٰذا اے اُمتِ خیرالانامؐ! اس کا خون مسلمانوں کی تلوار پر حرام ہے۔

حکایت سلطان مُراد و معمار در معنیٔ مساواتِ اسلامیہ

بود معمارے ز اقلیمِ خجند — در فنِ تعمیر نامِ او بلند
ساخت آں صنعت گرِ فرہاد زاد — مسجدے از حکمِ سلطانِ مُراد
خوش نیامد شاہ را تعمیرِ او — خشمگیں گردید از تقصیرِ او
آتشِ سوزندہ از چشمش چکید — دستِ آں بیچارہ از خنجر بُرید
جوئے خوں از ساعدِ معمار رفت — پیشِ قاضی ناتواں و زار رفت
آں ہنرمندے کہ دستش سنگ سُفت — داستانِ جورِ سلطاں باز گفت
گفت اے پیغامِ حق گفتارِ تو — حفظِ آئینِ محمدؐ کارِ تو
سفتہ گوشِ سطوتِ شاہاں نیم — قطع کن از روئے قرآں دعویم
قاضیٔ عادل بدنداں خستہ لب — کرد شہ را در حضورِ خود طلب
رنگِ شہ از ہیبتِ قرآں پرید — پیشِ قاضی چوں خطاکاراں رسید
از خجالت دیدہ بر پا دوختہ — عارضِ او لالہ ہا اندوختہ
یک طرف فریادیٔ دعویٰ گرے — یک طرف شاہنشہِ گردوں فرے
گفت شہ از کردہ خجلت بردہ ام — اعتراف از جرمِ خود آوردہ ام
گفت قاضی فی القصاص آمد حیوٰۃ (۱) — زندگی گیرد بایں قانوں ثبات

---

(۱) وَلَکُمۡ فِی الۡقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّاُولِی الۡاَلۡبَابِ (آیہ شریفہ)

عبدِ مسلم کمتر از احرار نیست | خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست
چوں مُراد ایں آیۂ محکم شنید | دستِ خویش از آستیں بیروں کشید
مدعی را تابِ خاموشی نماند | آیۂ بالعدلِ والاحسان خواند (۱)
گفت از بہرِ خدا بخشیدمش | از برائے مصطفےٰ بخشیدمش
یافت مورے بر سلیمانے ظفر | سطوتِ آئینِ پیغمبر نگر

پیشِ قرآں بندہ و مولا یکے است
بوریا و مسندِ دیبا یکے است

دوسری حکایت

کہتے ہیں کہ ولایتِ خجند[1] میں ایک صاحبِ فن معمار رہتا تھا۔ اس ولایت کے حکمراں سلطان مراد نے اُسے مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ اُس نے مسجد بنائی۔ لیکن بادشاہ کو پسند نہ آئی، اور اُس نے غصہ میں آکر اُس معمار کے ہاتھ کٹوا دیئے۔

---

[1] خجند، ترکستان میں ایک شہر ہے جس کو روس نے ۱۸۶۶ء میں فتح کیا تھا۔ اس وقت اس میں تاجیک قبیلہ کے ترک آباد ہیں۔ قوقند سے ۷۵ میل کے فاصلے پر ہے۔ آبادی ۳۷ ہزار نفوس ہے۔ ریشم اور ظروفِ چینی کی تجارت ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں علم و فن کا مرکز تھا ۱۲۔

---

(۱) اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ط (آیہ شریفہ)

غریب معمار اسی حالت میں قاضی شہر کی عدالت میں حاضر ہوا اور کہا کہ اے قاضی! تیرا فرض منصبی یہ ہے کہ تو سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے آئین کی حفاظت کرے۔

چونکہ میں مسلمان ہوں اس لئے کسی بادشاہ کا غلام ہو کر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ (اسلام اور غلامی تو ایک دوسرے کی ضد ہیں) اس لئے میں تیری عدالت میں آیا ہوں، تو قرآن کی رُو سے فیصلہ کر دے کہ سُلطان مجرم ہے یا نہیں ہے؟

یہ سُن کر قاضی نے سُلطان کو عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ جس وقت طلبی کا حکم سلطان کے پاس پہنچا، تو

رنگِ شہ از ہیبتِ قرآں پرید

بادشاہ کا مُنہ فق ہو گیا، اور وہ مجرموں کی طرح عدالت میں حاضر ہوا۔ شرم کے مارے بادشاہ کی نظریں نیچی تھیں اور آنسوؤں کی شدت سے اُس کے رُخسار سُرخ ہو گئے تھے۔

قاضی کے سامنے ایک طرف دست بریدہ معمار کھڑا تھا۔ دوسری طرف، رنگ پریدہ تاجدار۔ جب آسمان نے مساوات کا یہ منظر دیکھ لیا، تو قاضی نے ملزم سے دریافت کیا کہ تم اپنی صفائی پیش کرو۔ بادشاہ نے کہا۔ میں اپنے جرم کا اقبال کرتا ہوں۔

قاضی نے کہا۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ:۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَّا أُولِي الْأَلْبَابِ۔

اے عقل والو! اگر تم غور کرو گے تو تمہیں نظر آجائے گا کہ قصاص کے قانون میں

تمہارے لئے زندگی کا راز مخفی ہے۔ یعنی اگر تم ظالم سے انتقام نہ لوگے تو سلسلۂ حیات ختم ہو جائے گا۔

چب سلطان نے یہ آیۂ محکم سنی تو

دستِ خویش از آستیں بیروں کشید

یہ منظر دیکھ کر معمار کے دل میں اخوتِ اسلامیہ کا جذبہ موجزن ہوا، اور اس نے قاضی سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عدل کے ساتھ احسان کرنے کا بھی حکم دیا ہے۔ اس لئے میں اللہ کے اور اس کے رسولؐ کے لئے بادشاہ کو معاف کرتا ہوں۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ اے مسلمانوں! ذرا آئینِ پیغمبرؐ کی شوکت اور طاقت تو دیکھو کہ اس کی بدولت ایک چیونٹی نے سلیمان (بادشاہ) پر فتح حاصل کرلی۔ بات یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کی نگاہ میں غلام اور آقا، بادشاہ کا تخت اور فقیر کا بوریا، دونوں یکساں ہیں۔

در معنی حریتِ اسلامیه و سرِّ حادثۂ کربلا

هر کہ پیماں با ہوالموجود بست — گردنش از بندِ ہر معبود رست
مومن از عشق است و عشق از مومن است — عشق را ناممکنِ ما ممکن است
عقل سفاک است و او سفاک تر — پاک تر چالاک تر بیباک تر
عقل در پیچاکِ اسباب و علل — عشق چوگاں بازِ میدانِ عمل
عشق صید از زورِ بازو افگند — عقل مکار است و دامے می زند
عقل را سرمایہ از بیم و شک است — عشق را عزم و یقیں لاینفک است
آں کند تعمیر تا ویراں کند — ایں کند ویراں کہ آباداں کند
عقل چوں باد است ارزاں در جہاں — عشق کمیاب و بہائے او گراں
عقل محکم از اساسِ چون و چند — عشق عریاں از لباسِ چون و چند
عقل میگوید کہ خود را پیش کن — عشق گوید امتحانِ خویش کن
عقل با غیر آشنا از اکتساب — عشق از فضل است و با خود در حساب
عقل گوید شاد شو آباد شو — عشق گوید بندہ شو آزاد شو
عشق را آرامِ جاں حریت است — ناقہ اش را ساربان حریت است
آں شنیدستی کہ ہنگامِ نبرد — عشق با عقلِ ہوس پرور چہ کرد
آں امامِ عاشقاں پورِ بتولؓ — سروِ آزادے ز بستانِ رسولؐ

الله الله بائے بسم الله پدر (۱) — معنیٔ ذبح عظیم آمد پسر

بہر آں شہزادۂ خیر الملل (۲) — دوشِ ختم المرسلیں نعم الجمل

سرخ رو عشقِ غیور از خونِ او — شوخیٔ ایں مصرع از مضمونِ او

درمیانِ امت آں کیواں جناب — ہمچو حرفِ قُل ھُوَ اللّٰہ در کتاب

موسیٰؑ و فرعون و شبیرؓ و یزید — ایں دو قوت از حیات آید پدید

زندہ حق از قوتِ شبیری است — باطل آخر داغِ حسرت میری است

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت — حریت را زہر اندر کام ریخت

خاست آں سر جلوۂ خیر الاممؓ — چوں سحابِ قبلہ باراں در قدم

بر زمینِ کربلا بارید و رفت — لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت

تا قیامت قطعِ استبداد کرد — موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد

بہرِ حق در خاک و خوں غلطیدہ است — پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است (۳)

مدعائش سلطنت بودے اگر — خود نکردے با چنیں ساماں سفر

دشمناں چوں ریگِ صحرا لاتُعد (۴) — دوستانِ او بہ یزداں ہم عدد

سرِ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ بود — یعنی آں اجمال را تفصیل بود

---

(۱) وَفَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ (آیہ شریفہ)

(۲) نِعْمَ الجمل جملکما ونعم العدلان انتما (حدیث)

(۳) حقا کہ بنائے لا الہ ہست حسینؓ" (خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ) ۱۲

(۴) لاتُعد: بے شمار ۱۲

عزمِ او چوں کوہساراں استوار — پائدار و تند سیر و کامگار
تیغ بہرِ عزتِ دیں است و بس — مقصدِ او حفظِ آئین است و بس
ما سوا اللہ را مسلماں بندہ نیست — پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست
خونِ او تفسیرِ ایں اسرار کرد — ملتِ خوابیدہ را بیدار کرد
تیغِ لا چوں از میاں بیروں کشید — از رگِ اربابِ باطل خوں کشید
نقشِ الا اللہ بر صحرا نوشت — سطرِ عنوانِ نجاتِ ما نوشت
رمزِ قرآں از حسینؓ آموختیم — ز آتشِ او شعلہ ہا اندوختیم
شوکتِ شام و فرِ بغداد رفت — سطوتِ غرناطہ ہم از یاد رفت
تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز — تازہ از تکبیرِ او ایماں ہنوز

اے صبا اے پیکِ دور افتادگاں
اشکِ ما بر خاکِ پاکِ او رساں

تیسری حکایت

تمہید:۔ اس حکایت میں اقبال نے حادثۂ کربلا کی روشنی میں حریت کا مفہوم واضح کیا ہے۔ یعنی حضرت امام حسینؓ نے کربلا کے میدان میں شہادت حاصل کر کے ملتِ اسلامیہ پر اس حقیقت کو آشکار کر دیا کہ ملوکیت سے حریت کی نفی ہو جاتی ہے۔ اور اگر مسلمان حریت سے محروم ہو جائے، تو وہ اسلامی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ مسلمان وہ ہے، جو غیر اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرے۔

لیکن ملوکیت اس کو غیر اللہ کی اطاعت پر مجبور کر دیتی ہے

(۱) بالفاظ دگر، مسلمان وہ ہے۔ جو اللہ کے سوا کسی کے سامنے گردن نہ جھکائے۔

(۲) لیکن یہ بات اسی وقت ممکن ہے جب اسے حریت حاصل ہو۔

(۳) چونکہ ملوکیت انسان کو حریت سے محروم کر دیتی ہے۔

(۴) اس لئے اسلام ملوکیت کو برداشت نہیں کر سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت امام حسینؓ نے حریت کے اصول کو زندہ رکھنے کے لئے اپنی جان قربان کر دی۔

پہلا شعر:۔ اس شعر میں اقبالؔ نے اسلام کی اس بنیادی تعلیم کو واضح کیا ہے کہ جو شخص "ھُوَ الموجُود" سے پیمانِ محبت استوار کر لیتا ہے۔ وہ دُنیا میں کسی ہستی کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کر سکتا۔ یعنی وہ ماسوی اللہ کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے۔

اس شعر میں "ھُوَ المُوجُود" کی ترکیب لائق غور ہے۔ اس کا لفظی ترجمہ تو صرف یہ ہے کہ صرف وہی موجود ہے۔ لیکن مطلب یہ ہے کہ مسلمان صرف اللہ ہی کو حقیقی معنی میں موجود یقین کرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ کائنات بھی موجود ہے لیکن اس کا وجود حقیقی نہیں ہے بلکہ ظلی ہے۔ یعنی کائنات کی حقیقت وجود نہیں ہے بلکہ عدم ہے۔ وہ جو موجود نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے موجود کر دیا ہے۔ یعنی اس کی صفت خالقیت کی بدولت کائنات کو وجود سے ایک گونہ نسبت حاصل ہو گئی ہے۔ جس دن یہ نسبت

اس کائنات سے منفک ہو جائے گی۔ اُسی دن بلکہ اُسی لمحہ یہ کائنات فنا ہو جائے گی۔ اس کی وجہ اوپر بیان ہو چکی ہے کہ اس کائنات کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔ اگر یہ کائنات فی الحقیقت موجود ہوتی تو ہمیشہ موجود رہتی۔ کیونکہ جس شئے کی حقیقت وجود ہے، اُسے کوئی معدوم نہیں کر سکتا۔ دیکھ لو! اللہ تعالیٰ کی حقیقت وجود ہے (جس کی حقیقت وجود ہوتی ہے۔ اُسے منطقی اصطلاح میں واجب الوجود کہتے ہیں) اس لئے اُسے نہ کوئی معدوم کر سکتا ہے اور نہ وہ معدوم ہو سکتا ہے۔ اس کا معدوم ہونا عقلاً محال ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ موجود ہے۔ یہ معنی ہیں ہو الموجود کے۔

دوسرا شعر۔ جو شخص اللہ تعالیٰ سے پیمانِ محبت استوار کر لیتا ہے، اُسی کو ہم شریعت کی اصطلاح میں مومن کہتے ہیں۔ اس شعر کے پہلے مصرع میں مومن کی صفت بیان کی ہے کہ اس کی زندگی عشق پر موقوف ہے۔ اگر وہ عشق چھوڑ دے تو اس کی ہستی ختم ہو جائے گی۔ یعنی وہ مومن نہیں رہے گا۔ اور جس طرح مومن کا وجود عشق پر منحصر ہے، اسی طرح عشق کی ہستی مومن کے دم سے قائم ہے۔ اگر مومن نہ ہو تو عشق کا وجود ختم ہو جائے گا۔ مختصر یہ کہ مومن عشق کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اور عشق مومن کے لئے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ عشق کا وجود صرف مومن ہی کی بدولت برقرار رہ سکتا ہے اور مومن عشق ہی کی بدولت زندہ رہ سکتا ہے۔ بغیر عشق اس کی زندگی محال ہے۔

دوسرے مصرع میں عشق کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ عشق وہ محیّر العقول طاقت ہے کہ اس کی بدولت عاشق (مومن) وہ کام کر دکھاتا ہے، جو غیر مومن کی نظر میں ناممکن نظر آتا ہے۔

یہ دو شعر بطور تمہید لکھے ہیں۔ تیسرے شعر سے لے کر بارہویں شعر (عقل گوید شاد شو آباد شو الخ) تک اقبال نے عقل اور عشق میں موازنہ کیا ہے۔

واضح ہو کہ یہ موازنہ اقبال کا محبوب موضوع ہے۔ چونکہ وہ عقل پر عشق کی برتری کے قائل ہیں، اس لئے انہوں نے بانگِ درا سے لے کر ارمغانِ حجاز تک اپنی ہر کتاب میں عقل پر عشق کی برتری ثابت کی ہے۔

میں اس شرح میں اس موضوع پر مفصل گفتگو تو کر نہیں سکتا۔ صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ اقبال کا مسلک یہ ہے کہ عقل بھی انسان کے لئے بہت مفید اور کار آمد شئے ہے۔ لیکن وہ مطلوب (خدا) تک نہیں پہنچا سکتی "حریمِ ناز" تک رہنمائی کر سکتی ہے۔ لیکن پردہ نہیں اٹھا سکتی۔ کما قال

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

اس لئے انسان کو چاہیئے کہ عشق اختیار کرے۔ کیونکہ اس میں یہ طاقت ہے کہ

حاشیہ:۔ راقم الحروف کی رائے میں صرف طلبِ صادق ہی شرط ہے۔ کیونکہ اگر طلب صادق ہے تو اللہ تعالیٰ یا تو مرشد کا انتظام فرما دیتا ہے، یا خود مرشد بن جاتا ہے۔ بہر کیف بندہ کا فرض صرف اظہارِ عشق ہے۔ باقی سب کام وہ خود کر لیتے ہیں۔ اس نکتہ کی وضاحت کے لئے یہ آیت بالکل کافی ہے:۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط (۲۹ : ۶۹)

اور جو لوگ ہماری طلب میں محنت کرتے ہیں ہم ان کو اپنی راہ ضرور دکھا دیں گے۔ ۱۲

حریمِ ناز کا پردہ اُٹھا کر معشوقِ حقیقی کا جلوہ دکھا دیتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ عقل ہمارے اندر خدا کی ہستی پر یقین کی کیفیت پیدا نہیں کر سکتی۔ یہ کام صرف عشق کر سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس دُشوار کام کو اقلِ قلیل مدّت میں انجام دے سکتا ہے:-

وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے
طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے

بس اس کے لئے طلبِ صادق اور مرشدِ کامل صرف دو چیزیں درکار ہیں۔

اس تصریح کے بعد ذیل میں اِن تمام اشعار کا مطلب درج کرتا ہوں:-

(۱) عقل بیشک کہتے ہیں کہ خونریزی کرتی ہے۔ لیکن عشق اس سے بھی زیادہ خونریز ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ عقل کے مقابلہ میں زیادہ پاک، زیادہ مستعد اور زیادہ بیخوف ہے۔

(۲) عقل تو ہمیشہ علّت اور معلول کے پھندوں میں گرفتار رہتی ہے یعنی انسان کو یہ سوچنے پر راغب کرتی رہتی ہے کہ اگر میں میدانِ جنگ میں گیا تو ممکن ہے مارا جاؤں۔ یا اگر میں اپنی دولت راہ خدا میں دے دوں تو ممکن ہے کہ مفلسی سے دوچار ہو جاؤں۔ وغیرہ۔

لیکن عشق اِس "اگر مگر" میں نہیں پڑتا۔ وہ انسان کو سر بکف کر کے میدان جہاد میں لے آتا ہے۔ اور فائز المرام کر دیتا ہے۔

(۳) عقل حیلہ جو اور مکار ہے۔ اسی لئے وہ

ڈپلومیسی[1] سے کام لیتی ہے۔ لیکن عشق، تلوار کے زور سے کامیابی حاصل کرتا ہے۔

(۴) عقل انسان کے دل میں خوف اور شک یہ دو چیزیں پیدا کرتی ہے۔ خوف کا تعلق مادیات سے ہے۔ یعنی عقل انسان کو یہ بات سمجھاتی ہے کہ اگر تو سچ بولے گا تو حاکم ناراض ہو جائے گا۔ یا اگر تو جہاد کرے گا تو جان کا اندیشہ ہے۔ شک کا تعلق روحانیت سے ہے یعنی عقل ان تمام حقائق کے وجود میں شکوک و شبہات پیدا کرتی ہے، جو اس کے حواس خمسہ سے بالاتر ہیں۔ مثلاً خدائے تعالیٰ، روح

---

[1] چنانچہ انگریزوں نے سلطان ٹیپو شہید کے مقابلہ میں مکاری اور عیاری ہی سے کام لیا تھا اور شیر کو گرفتار کرنے کے لئے بڑی کوشش سے دام بچھایا تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ

(ا) نظام بدفرجام بدخواہِ اسلام نظام علی خاں کو ڈرا دھمکا کر اپنے ساتھ ملا لیا۔

(ب) مرہٹوں کو سبز باغ دکھا کر سلطان کی امداد سے باز رکھا۔

(ج) سلطان کی شیعہ رعایا کو یہ کہہ کر ورغلایا کہ ہم تمہیں عزاداری کے لئے بہت زیادہ سہولت بہم پہنچائیں گے بلکہ خود بھی ماتم میں شرکت کیا کریں گے۔

(د) سلطان کی ہندو رعایا کو یہ کہہ کر اکسایا کہ ہم تمہیں پھر حکمراں بنا دیں گے۔

(ہ) میر صادق، میر غلام علی، اور پورنیا کو جھوٹے وعدوں کی مدد سے اپنا ہمدرد اور رفیق کار بنا لیا۔ یہ وہی صادق ہے جس کے متعلق اقبال نے یہ شعر لکھا ہے:۔

جعفر از بنگال صادق از دکن
ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن

ملائکہ، حیات بعد الممات اور جنت و دوزخ۔

لیکن عشق اس کے مقابلہ میں عزم اور یقین یہ دو چیزیں عطا کرتا ہے:

عزم: یعنی ہمت، حوصلہ، پختہ ارادہ، جو خوف کی ضد ہے۔

یقین: اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایمان جو شک کی ضد ہے۔

یہ بہت اہم شعر ہے۔ کیونکہ اس سے عقل اور عشق کا بنیادی فرق واضح ہو سکتا ہے۔

(۵) عقل جو کچھ کرتی ہے، اس کا نتیجہ ویرانی، بربادی اور فنا ہے۔

اس کے مقابلہ میں عشق بظاہر انسان کو برباد کر دیتا ہے۔ لیکن دراصل اس کی بدولت اُسے ہمیشگی اور دوام کی صفت حاصل ہو جاتی ہے۔ چونکہ عشق بذاتِ خود غیر فانی ہے، اس لئے وہ عاشق کو بھی غیر فانی بنا دیتا ہے۔

(۶) کوئلہ ارزاں ہے اور با افراط ہے۔ لیکن الماس گراں قیمت اور کمیاب ہے۔

اسی طرح عقل چونکہ عشق کے مقابلہ میں فرومایہ ہے اس لئے فطرت نے ہر شخص کو اس سے کم و بیش بہرہ ور کیا ہے۔ لیکن عشق بہت قیمتی شئے ہے اس لئے بہت کمیاب ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

(۷) عقل ہمیشہ چون و چند سے بحث کرتی ہے۔ یعنی وہ مادیات ہی کی میں منہمک رہتی ہے۔ لیکن عشق مادیات اور مادی خیالات اور مادی نفع و نقصان سب سے بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اگر میں میدانِ جنگ میں اپنی جان

دے دُوں گا تو مجھ کو کس قدر دولت انعام میں ملے گی۔ اور کتنے مربعے جاگیر میں ملیں گے۔ یا حکومت میری اولاد کے ساتھ کیا برتاؤ کرے گی؟ میری بیوہ کی کتنے ہزار روپے ماہوار پنشن مقرر کرے گی۔؟ یہی مطلب ہے چون وچند کا۔

بلکہ وہ تو یہ دیکھتا ہے کہ اللہ نے مجھے اپنی راہ میں سرفروشی کا حکم دیا ہے۔ اس لئے میں اپنا سر اُس کی راہ میں کٹا دوں گا۔ کیونکہ یہ میرا فرض ہے۔

(۸) عقل انسان کو یہ مشورہ دیتی ہے کہ آگے بڑھنے، دولت حاصل کرنے، اور حکومت (اقتدار) حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

عشق انسان کو یہ حکم دیتا ہے کہ دولت، ثروت، شہرت اور حکومت یہ سب چیزیں عارضی اور فانی ہیں، تیرا مقصود نہیں ہیں اس لئے تو اِن سب سے قطع نظر کرلے۔ اور یہ دیکھ کہ تو مسلمان (عاشق) بھی ہے یا نہیں؟

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

(۹) اس شعر کی ترکیب یوں ہے:۔

عقل متعلق یا وابستہ غیر است و از اکتساب آشنا است
عشق موقوف بر فضل الٰہی است و متعلق بغیر نیست بلکہ پیوستہ باخود در حساب می باشد۔

اس شعر میں ایک کے بجائے دو باتوں میں موازنہ کیا ہے۔

(۲) عقل با غیر مشغول است لیکن عشق باخود مشغول (در حساب) است
(ب) عقل از اکتساب است لیکن عشق از فضل است۔

غالباً اب مطلب بالکل واضح ہو گیا ہوگا۔ یعنی

(۱) عقل کی مدد سے انسان ساری دنیا کا محاسبہ کر سکتا ہے۔ لیکن اپنا محاسبہ نہیں کر سکتا۔ ستاروں کو دیکھ سکتا ہے لیکن اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتا۔

اس کے مقابلہ میں عشق، دُنیا سے مطلب نہیں رکھتا۔ بلکہ عاشق کو خودی کی تربیت پر مائل کرتا ہے۔

(ب) عقل کی کمی بیشی انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔ وہ جس قدر محنت کرے گا، علوم و فنون کا مطالعہ کرے گا، علماء کی صحبت حاصل کرے گا، سیر و سیاحت کرے گا، اس کی عقل میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ یعنی عقل ایک اکتسابی چیز ہے۔ لیکن عشق تو عطیۂ الٰہی ہے۔ یہ نعمت صرف فضلِ الٰہی سے حاصل ہو سکتی ہے ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

(ج) عقل انسان کو یہ سکھاتی ہے کہ حتی المقدور راحت اور مسرت اور دنیاوی ترقی حاصل کرو۔ لیکن عشق اس کے برعکس یہ تلقین کرتا ہے کہ راحت و مسرت، عیش و عشرت اور دولت یہ سب ادنیٰ درجہ کی چیزیں ہیں، جو صرف حیوانوں کا مطمحِ نظر بن سکتی ہیں۔ انسان کا مرتبہ ان سے بہت بلند ہے۔

انسان کا مقصودِ حیات یا نصب العین یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا عاشق (بندہ) بن کر حریت (آزادی) حاصل کرلے۔

اگلے شعر میں اس کی لم بیان کرتے ہیں۔ یعنی عشق، عاشق کو مقام حریت حاصل کرنے کی تلقین اس لئے کرتا ہے کہ اگر عاشق کو حریت نصیب نہ ہو، تو عشق زندہ نہیں رہ سکتا۔ غلامی تو عشق کے حق میں سمِ قاتل کا حکم رکھتی ہے۔

اس شاندار تمہید کے بعد اقبال نے اولاً سات اشعار میں حضرت امام حسینؓ کی منقبت لکھی ہے، بعد ازاں حادثۂ کربلا کا فلسفہ بیان کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ امام حسینؓ کے مرتبۂ عالیہ کا کیا پوچھنا! سیدۃ النساء حضرت بتولؓ اُن کی ماں ہیں، اور سید الانبیاء سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے نانا ہیں۔ حضرت علیؓ اُن کے پدرِ بزرگوار ہیں۔ جو بسم اللہ کی "ب" ہیں۔ یعنی علومِ قرآنی کا دروازہ ہیں۔ اور وہ خود قرآن کی اس آیت کی تفسیر ہیں:۔

وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ (۳۷: ۱۰۷)

یعنی ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض دے دیا۔

امام حسینؓ کی رفعتِ شان کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ جب کہ حسنؓ اور حسینؓ دونوں صاحبزادے حضورِ اکرمؐ کے دوشِ مبارک پر بیٹھے ہوئے تھے تو ایک صحابی نے یہ کہا کہ ان صاحبزادوں کی خوش نصیبی کا کیا ٹھکانا ہے کہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوشِ مبارک پر سوار ہیں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ:۔

نِعْمَ الْجَمَلُ جَمَلُكُمَا وَ نِعْمَ الْعِدْلَانِ اَنْتُمَا۔

"یعنی تمہارا دونوں کا اونٹ بہترین اونٹ ہے اور تم دونوں بہترین سوار ہو"

عدلان اُن دو سواریوں کو کہتے ہیں، جو کجاوہ میں آمنے سامنے بیٹھتی ہیں تاکہ

وزن برابر رہے۔

جس طرح سورۂ اخلاص سارے قرآن مجید میں ممتاز ہے، اسی طرح امام حسینؓ ساری اُمت میں بلند پایہ رکھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ موسیٰؑ اور فرعون یا شبیرؓ اور یزید یہ دو آدمیوں ہی کے نام نہیں ہیں، بلکہ حیات کے دو مختلف اور متضاد مظہر ہیں جو قیامت تک اسی طرح برسرِ پیکار رہیں گے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

مطلب یہ ہے کہ دنیا میں شروع ہی سے حق و باطل میں آویزش چلی آرہی ہے۔ اور اگر دنیا میں قوتِ شبیری نہ ہوتی، تو حق کب کا مٹ چکا ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ:-

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیری
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

نوٹ:- اقبال نے قیامِ پاکستان سے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ:-

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

قوم خانقاہوں سے تو باہر نکل آئی۔ لیکن افسوس کہ بعض اسباب ایسے پیدا ہو گئے کہ وہ (رسمِ شبیری ادا کرنے کے لئے) میدانِ کربلا کی طرف

جانے کے بجائے ہوٹلوں کی طرف چلی گئی۔ اور وہاں جا کر خدا معلوم کیا دیکھا کہ اب باہر نکلنے کا نام ہی نہیں لیتی۔

اس تمہید کے بعد اقبالؔ اصل موضوع کی طرف آتے ہیں :۔

کہتے ہیں کہ جب خلافت نے اپنا رشتہ قرآن سے منقطع کر لیا، تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حریت کا خاتمہ ہو گیا۔ چونکہ خدا پرستی کے لئے حریت کا وجود شرطِ اولیں ہے۔ اس لئے امام حسینؓ نے میدانِ کربلا میں اپنی جان دے کر قیامت تک کے لئے ملوکیت (استبداد) کے اصول کو باطل کر دیا۔ یعنی اپنی شہادت سے یہ ثابت کر دیا کہ اسلام ملوکیت کا دشمن ہے۔ اسی لئے اقبالؔ کی تعلیم یہ ہے کہ :۔

"لا ملوکیت فی الاسلام"

نوٹ :۔ پہلے مصرع میں (چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت) یزید کی تخت نشینی کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ وہ اپنے باپ کی وفات کے بعد، اُمت کے انتخاب سے خلیفہ نہیں ہوا بلکہ اُسی طرح مسلمانوں پر حاکم بن گیا جس طرح ایک قیصر کے بعد اس کا بیٹا قیصر بن جاتا تھا۔ اسی کا نام ملوکیت ہے جو حُریت کی ضد ہے۔ ۱۲

کہتے ہیں کہ امام حسینؓ نے حق کے لئے اپنا سر کٹا یا اور اسی لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اپنی قربانی سے توحیدِ الٰہی کو از سرِ نو دنیا میں قائم کر دیا۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ اگر وہ اپنی شہادت سے اس بات کو واضح نہ کرتے کہ توحید پرستی کے لئے حریت لازمی ہے، لیکن ملوکیت، حریت کو فنا کر دیتی ہے،

اس لئے اسلام ملوکیت کا سخت دشمن ہے۔

تو مسلمان اس اصول کو فراموش کر دیتے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ رفتہ رفتہ توحید الٰہی کا خاتمہ ہو جاتا۔ لیکن امام حسینؓ نے قیامت تک مسلمانوں کے لئے ایک نمونہ قائم کر دیا کہ ملوکیت کو مٹانے کے لئے اپنی جان قربان کر دو۔ تاکہ توحید الٰہی زندہ رہ سکے۔

امام حسینؓ نے اپنے طرزِ عمل سے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی تعلیمات کی رُوح کو دنیا پر آشکار کر دیا۔ جس بات کی انہوں نے زبان سے تعلیم دی تھی، امام حسینؓ نے اس پر عمل کر کے دنیا کو دکھا دیا۔

تعلیماتِ اسلام کی وہ رُوح کیا تھی؟ صرف یہ کہ

ع ماسِوئ اللہ را مسلماں بندہ نیست

یعنی مسلمان اللہ کے علاوہ کسی کا غلام نہیں ہو سکتا۔ کسی کے حکم کی اطاعت نہیں کر سکتا۔ کسی کے سامنے سر نہیں جھکا سکتا۔

چونکہ قرآن اس تعلیم کا سب سے بڑا علمبردار ہے اس لئے اقبالؔ نے یہ کہا ہے کہ

ع رمزِ قرآں از حسینؓ آموختیم

یعنی حسینؓ نے ہم مسلمانوں کو قرآنِ حکیم کی رُوح سے آشنا کیا۔

نوٹ:۔ میں نے ایک دفعہ حضرت اقبالؔ سے یہ دریافت کیا کہ "رمزِ قرآن" سے آپ کی مراد کیا ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ تعلیماتِ قرآن کی رُوح یہ ہے کہ باطل کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت سر بکف رہو اور اگر ضرورت ہو تو جان دینے سے بھی دریغ مت کرو۔

ع سطرِ عنوانِ نجاتِ ما نوشت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حسینؓ نے ہمارے

گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا، یا اگر ہم ان کی شہادت پر آنسو بہائیں گے تو ہماری نجات ہو جائے گی یہ دونوں باتیں سراسر غیر اسلامی ہیں۔ اقبالؒ کا مطلب یہ ہے کہ امام حسینؓ نے راہِ خدا میں سر کٹا کر ہمیں نجاتِ اخروی حاصل کرنے کا طریقہ بتلا دیا یعنی یہ کہ مسلمان وہ ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے اور کسی بادشاہ کے سامنے سر نہیں جھکاتا۔

ع ماسوی اللہ را مسلماں بندہ نیست

اس مصرع میں شہادت حسینؓ کا سارا فلسفہ مضمر ہے۔

آخری تین شعر انہوں نے خالص جذباتی رنگ میں لکھے ہیں۔ جن کا مطلب یہ ہے کہ دمشق، بغداد اور غرناطہ یہ تینوں عظیم الشان سلطنتیں صفحۂ ہستی سے مٹ چکی ہیں لیکن

تارِ ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز

یعنی ملت کے خیالات میں جو انقلاب امام حسینؓ نے پیدا کیا تھا اس کا اثر ابھی تک باقی ہے۔ اور ان کی تکبیر کی آواز سے (بشرطیکہ مسلمانوں کی توجہ ریڈیو کی آواز سے ہٹ سکے) اب بھی ایمان زندہ ہو سکتا ہے۔

در معنی ایں کہ چوں ملّتِ محمّدیہ موسّس بر توحید

ملّتِ اسلامیہ کسی خاص ملک سے وابستہ نہیں ہے

ورسالت است پس نہایت مکانی ندارد

جوہرِ ما با مقامے بستہ نیست ۔۔۔ بادۂ تندش بجامے بستہ نیست
ہندی و چینی سفالِ جامِ ماست ۔۔۔ رومی و شامی گلِ اندامِ ماست
قلبِ ما از ہند و روم و شام نیست ۔۔۔ مرز بومِ او بجز اسلام نیست
پیشِ پیغمبر چو کعبِ پاک زاد ۔۔۔ ہدیہ آورد از بانَتْ سُعاد
در ثنایش گوہرِ شب تاب سفت (۱) ۔۔۔ سیفِ مسلول از سیوف الہند گفت
آں مقامش برتر از چرخِ بلند ۔۔۔ نامدش نسبت باقلیمے پسند

---

(۱) حضرت کعبؓ نبی کریمؐ کو بہت ایذا دیا کرتے تھے۔ فتح مکّہ کے بعد مکّہ سے بھاگ کر طائف چلے گئے۔ وہاں سے قصیدہ بانت سعاد لکھ کر حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے گذشتہ گناہوں کی معافی مانگی حضورؐ نے ان کو معاف کر دیا اور قصیدے کے صلے میں اپنی چادر مبارک عطا فرمائی۔ اس قصیدے میں کعبؓ نے حضورؐ کو "سیفٌ من سیوف الہند" (ہندوستاں کی تلواروں میں سے ایک تلوار) کے الفاظ سے مخاطب کیا۔ مگر حضورؐ نے کعبؓ کے مصرع میں اصلاح دیکر فرمایا "سیفٌ من سیوف اللہ" کہنا چاہیے (یعنی خدا کی تلواروں میں سے ایک تلوار)

گفت سیف من سیوف اللہ گو — حق پرستی جز براہِ حق مپو
ہمچناں آں راز دانِ جزو و کل — گردِ پایش سرمۂ چشمِ رُسل
گفت با است ،،ز دنیائے شما — دوست دارم طاعت و طیب و نسا،،
گر ترا ذوقِ معانی رہنما ست — نکتۂ پوشیدہ در حرفِ "شما" ست
یعنی آں شمعِ شبستانِ وجود — بود در دنیا و از دنیا نبود
جلوۂ او قدسیاں را سینہ سوز (۱) — بود اندر آب و گِل آدم ہنوز
من ندانم مرز و بومِ او کجاست — ایں قدر دانم کہ با ما آشنا ست
ایں عناصر را جہانِ ما شمرد — خویشتن را میہمانِ ما شمرد
زانکہ ما از سینہ جاں گم کردہ ایم — خویش را در خاکداں گم کردہ ایم
مسلم استی دل باقلیمے مبند — گم مشو اندر جہانِ چون و چند
می نگنجد مسلم استی مرز و بوم — در دلِ او یاوہ گردد شام و روم

دل بدست آور کہ در پہنائے دل
می شود گم ایں سرائے آب و گل

عقدۂ قومیتِ مسلم کشود — از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملتِ گیتی نورد — بر اساسِ کلمۂ تعمیر کرد
تا ز بخششہائے آں سلطانِ دیں — مسجدِ ما شد ہمہ روئے زمیں
آں کہ در قرآں خدا او را ستود (۲) — آں کہ حفظِ جان او موعود بود

---

(۱) کُنتُ نَبِیًّا وَّ آدَمُ بینَ الماءِ والطِّین۔
(۲) وَاللہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاس (آیہ شریفہ)

دشمناں بے دست و پا از ہیبتش
لرزہ بر تن از شکوہِ فطرتش

پس چرا از مسکنِ آبا گریخت؟
تو گماں داری کہ از اعدا گریخت؟

قصہ گویاں حق ز ما پوشیدہ اند
معنیٔ ہجرت غلط فہمیدہ اند

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است
ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است

معنیٔ او از تنک آبی رم است
ترکِ شبنم بہر تسخیرِ یم است

بگذر از گل گلستاں مقصودِ تست
ایں زیاں پیرایہ بندِ سودِ تست

مہر را آزادہ رفتن آبروست
عرصۂ آفاق زیرِ پاے اوست

ہمچو جو سرمایہ از باراں مخواہ
بیکراں شو در جہاں پایاں مخواہ

بود بحرِ تلخ رو یک سادہ دشت
ساحلے ورزید و از شرم آب گشت

بایدت آہنگِ تسخیرِ ہمہ
تا تو می باشی فراگیرِ ہمہ

صورتِ ماہی بہ بحر آباد شو
یعنی از قیدِ مقام آزاد شو

ہر کہ از قیدِ جہات آزاد شد
چوں فلک در شش جہت آباد شد

بوے گل از ترکِ گل جولانگر است
در فراخاے چمن خود گستر است

اے کہ یک جا در چمن اندر اختی
مثلِ بلبل با گلے در ساختی

چوں صبا بارِ قبول از دوش گیر
گلشن اندر حلقۂ آغوش گیر

از فریبِ عصرِ نو ہشیار باش
رہ فتد اے راہرو ہشیار باش

(فصل نہم)

تمہید :- اس فصل میں اقبال نے یہ تعلیم دی ہے کہ ملّتِ محمدیہ کی بنیاد چونکہ توحید اور رسالت پر رکھی گئی ہے اور ان دونوں کا تعلق عقیدہ سے ہے یعنی ملّتِ اسلامیہ کی بنیاد چونکہ غیر مادی ہے اس لئے ملّتِ مذکورہ کسی مادی یا خارجی شئے سے وابستہ نہیں ہو سکتی یعنی کسی خاص ملک یا خطۂ ارضی میں محدود نہیں ہو سکتی۔

ملّتِ اسلامیہ میں شامل ہونے کے لئے نہ کسی ملک یا خطۂ ارضی سے وابستہ ہونا ضروری ہے نہ کسی خاص نسل یا قوم یا قبیلہ یا رنگ سے بلکہ جو شخص بھی خواہ وہ کسی ملک کا رہنے والا ہو اور کسی نسل سے ہو، توحید اور رسالت پر ایمان لے آئے گا، وہ ملّتِ اسلامیہ کا ایک فرد بن جائے گا۔

اس فصل میں دو بند ہیں۔ پہلے بند میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کسی خاص ملک سے مختص نہیں ہے بلکہ مکانی حدود سے بالاتر ہے۔ دوسرے بند میں قومیت کے اسلامی نظریہ کی وضاحت کی ہے اور اس ضمن میں ہجرت کا فلسفہ بیان کر کے مسلمانوں کو ہجرت کی روح کو زندگی میں جذب کرنے کی دعوت دی ہے۔ اب میں پہلے بند کا مطلب لکھتا ہوں :-

پہلا بند :- اس بند کے پہلے تین اشعار میں اقبال نے یہ بنیادی نکتہ واضح کیا ہے کہ ہماری قومیت کسی مقام کی پابند نہیں ہے۔ اور ہم اپنی قومیت کے اعتبار سے نہ ہندی ہیں نہ رومیؔ ہیں نہ شامی ہیں بلکہ کسی جغرافیائی خطہ کے بجائے ہمارا عقیدہ (اسلام) ہی ہمارا وطن ہے یعنی ہم اسلام میں رہتے ہیں :-

بازو ترا توحید کی ہمت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

اس بنیادی نکتہ کو انھوں نے دو مثالوں سے واضح کیا ہے۔ پہلی مثال یہ ہے کہ جب حضرت کعبؓ نے بارگاہِ رسالتؐ میں اپنا مشہور قصیدہ پڑھ کر سنایا جس کا پہلا شعر یہ ہے:۔

بَانَتْ سُعَادُ فَقَلْبِي الْيَوْمَ مَتْبُوْلُ
مُتَيَّمٌ اِثْرَهَا لَمْ يُفْدَ مَكْبُوْلُ

چونکہ میری محبوبہ (سعاد) مجھ سے جُدا ہو گئی اس لئے میرا دل آج ہر قسم کی مسرت سے محروم (مقطوع) ہے۔ اس کی جدائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اس غلام کی مانند ہوں جو ذلیل و خوار ہو اور اس کا فدیہ کسی نے ادا نہ کیا ہو اس لئے وہ دشمنوں کی قید میں ہو۔

اس قصیدہ میں حضرت کعب نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہندوستان کی تلواروں میں سے ایک کھینچی ہوئی (مسلول) تلوار سے تشبیہ دی۔ چونکہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وجود باوجود کو خاص اقلیم یا ملک سے منسوب کرنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ اس واسطے کہ حضورؐ تو ساری دنیا کے لئے رحمت ہیں اور ساری دنیا کے لئے ہادی ہیں اور ساری دنیا کے پیشوا ہیں، اور ساری دنیا کے آقا ہیں، اس لئے آپؐ نے حضرت کعب سے ارشاد فرمایا کہ سَيْفٌ مِنْ سُيُوْفِ الْهِنْدِ کے بجائے "سَيْفٌ مِنْ سُيُوْفِ اللّٰهِ" کہو۔

ع حق پرستی جز براہِ حق مپو

یہ نہایت بلیغ مصرع ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر حق پرستی مطلوب ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کے ارشاد پر عمل کرو۔ اور چونکہ حق تعالیٰ نے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری کائنات کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ اس لئے

حضورؐ کو کسی خاص ملک سے منسوب مت کرو۔ اور چونکہ حضورؐ کا پیغام عالمگیر ہے۔ اس لئے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ملت بھی عالمگیر ہے۔۔ نہ اُس کی کوئی حد ہے نہ اس کی کوئی نہایت ہے۔

اس کے بعد اسی نکتہ کو کہ ذاتِ محمدیؐ کسی خاص خطۂ ارضی سے وابستہ نہیں ہے، دوسری مثال سے سمجھاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ ہے کہ آپؐ رازدانِ جزو کل ہیں۔ اور آپؐ کی گردِ پا، سرچشمۂ انبیاءؑ ہے۔ آپؐ جامع الکلم ہیں، آپؐ مدینۃ العلم ہیں۔ آپؐ فرماتے ہیں کہ:۔

"تمہاری دنیا میں سے تین چیزیں میرے لئے مرغوبِ طبع بنائی گئی ہیں۔ خوشبو، عورتیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے"

حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

حُبِّبَ اِلَیَّ مِنْ دُنْیَاکُمْ ثَلَاثٌ اَلطِّیْبُ وَالنِّسَاءُ وَقُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ۔

کہتے ہیں کہ اے مخاطب! اگر تجھ کو علمِ معانی سے کچھ لگاؤ ہے تو لفظ "دُنْیَاکُمْ" یعنی "تمہاری دنیا" کی ترکیب پر غور کرو۔ لفظ "تمہاری" میں ایک خاص نکتہ پوشیدہ ہے۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دنیا کو اپنی طرف منسوب نہیں فرمایا۔ بلکہ عامۃ النّاس کو دُنیا کا مضاف الیہ بنایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ آپؐ اس دنیا میں رہتے تھے لیکن اس دنیا سے کوئی تعلق یا رابطہ نہیں رکھتے تھے۔ لاریب در دنیا بود، ولے انداز دنیا نبود۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ اگرچہ آپؐ جامۂ بشری میں ملبوس تھے لیکن آپؐ کی

اصل دنیاوی (مادّی) نہیں تھی۔ بلکہ آپؐ کا جوہرِ ذات نوری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ اُس وقت مرتبہ نبوت پر فائز ہو چکے تھے جب کہ آدمؑ کی تخلیق بھی نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ کُنْتُ نَبِیًّا وَّ اٰدَمُ بَیْنَ الْمَآءِ وَالطِّیْنِ اِس پر شاہد ہے۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اُس وقت خلعتِ نبوّت سے سرفراز ہو چکا تھا جب کہ آدم کا جسمِ خاکی تیار بھی نہیں ہوا تھا۔

کوئی شخص آپ کی اصل سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔ ہاں اتنا معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ہماری رہنمائی کی خاطر جامۂ بشری میں ملبوس کر دیا۔

کس ز سرِّ عبدہٗ آگاہ نیست
عبدہٗ جز سرِّ الّا اللہ نیست (جاوید نامہ)

آپؐ کی اصل حقیقت فہمِ انسانی سے بالاتر ہے کیونکہ آپؐ میں سفلی اور علوی دونوں شانیں جلوہ گر ہیں۔

عبدہٗ از فہمِ تو بالاتر است
زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است (جاوید نامہ)

یعنی آپؐ آدم بھی ہیں اور جوہرِ آدم بھی ہیں۔ اسی لئے عرفاء نے آپؐ کی ذات کو برزخِ کبریٰ سے تعبیر کیا ہے۔ بقول محسنؔ کاکوروی مرحوم ؎

ادھر مخلوق میں شامل اُدھر اللہ سے واصل
خواص اس برزخِ کبریٰ میں ہے حرفِ مشدّد کا

اسی لئے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دُنیا کو ہماری دُنیا قرار دیا۔ اپنی دُنیا نہیں فرمایا۔ کیونکہ ع بود در دُنیا واز دُنیا نہ بود

بلکہ اپنے آپ کو اس دُنیا میں ہمارا مہمان تصور فرمایا۔

اس حدیث کا مطلب بیان کرنے کے بعد اقبال کہتے ہیں کہ ہم کو بھی حضورؐ کے نقشِ قدم پر چل کر اپنا مطمحِ نظر، عالمِ اُخروی کو بنانا چاہیے تھا۔ جیسا کہ قرآنِ حکیم کی اس آیت سے مستنبط ہوتا ہے۔

اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ

بیشک آخرت کی زندگی ہی حقیقی معنی میں زندگی ہے۔

لیکن ہم چونکہ دنیاوی لذات میں منہمک ہو گئے ہیں، اس لئے ہم نے اپنے آپ کو اس دُنیا میں گم کر دیا ہے۔ یعنی دنیاوی زندگی ہی کو اپنا مقصودِ حیات قرار دے لیا ہے۔

اب گریز کر کے مطلب کی طرف آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے مخاطب! اگر تو واقعی مُسلمان ہے تو اپنے آپ کو کسی اقلیم یا سلطنت سے وابستہ مت کر۔ اگر تو اپنے آپ کو ہندی یا پاکستانی یا ایرانی یا مصری تصور کرے گا، تو مقصدِ حیات اور تعلیم نبویؐ دونوں سے بیگانہ ہو جائے گا۔

مسلمان اپنے آپ کو کسی خطۂ ارض سے وابستہ نہیں کرتا، کیونکہ کر نہیں سکتا۔ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان کا زاویۂ نگاہ آفاقی ہو جائے، کیونکہ اسلام بذاتِ خود آفاقی ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ

(ا) اسلام کا خدا ساری کائنات کا رب ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہ

(ب) اسلام کا رسولؐ ساری کائنات کا ہادی ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝

(ج) اسلام کی کتاب ساری کائنات کے لئے نصیحت ہے۔

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝

پس اے مخاطب! تو اپنے سینے میں سچے مسلمان کا دل پیدا کر۔ کیونکہ اُس کے دل میں اس قدر وسعت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ساری کائنات کو اپنے اندر سمو سکتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ تو اپنے دل کو کسی خاص ملک سے وابستہ مت کر۔ بلکہ ساری دنیا کو اپنا وطن سمجھ۔

ع مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا

دوسرا بند:۔ اس بند میں اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد وطن یا نسل یا زبان پر نہیں رکھی۔ اس لئے مسلمان کی وفاداری کا مرجع یا مرکز وطن نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کی قومیت کی اساس کلمۂ توحید پر ہے۔ دنیا کی دوسری تمام قومیں اوطان سے بنتی ہیں، لیکن مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد وطن نہیں ہے بلکہ دین ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جس کی بدولت مسلمان قوم، دیگر اقوامِ عالم سے متمیز ہو گئی ہے۔

ع خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

کہتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرما کر مسلمانوں کی قومیت کے عقدہ کو حل فرما دیا۔ یعنی آپؐ نے مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد وطن پر نہیں رکھی، بلکہ کلمۂ توحید کو قومیت کی اساس قرار دیا۔ اور اسی لئے ہماری عبادت زمین کے کسی خاص حصے سے

وابستہ نہیں ہے بلکہ حضورؐ نے ساری زمین کو ہمارے لئے مسجد قرار دیدیا۔ دیگر اقوام اپنی عبادت کے لئے خاص مکان کی محتاج ہیں۔ مثلاً ایک پارسی (مجوسی) آتشکدہ کی عمارت سے باہر اپنی عبادت نہیں کر سکتا۔ ہندو اپنی عبادت کے لئے مندر کا محتاج ہے۔ عیسائی اپنے مراسم عبادت کلیسا کی چار دیواری سے باہر نکل کر انجام نہیں دے سکتا۔ اور ایک یہودی ہیکل میں داخل ہوئے بغیر اپنا فریضہ ادا نہیں کر سکتا۔ لیکن مسلمان ہر جگہ نماز پڑھ سکتا ہے۔

اس کے بعد اقبال نے ہجرت کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اے مسلمان! تو جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ میں آپ کو انسانوں (کی شرارت) سے محفوظ رکھوں گا، چنانچہ وہ آیت یہ ہے:۔

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ط

اور اللہ انسانوں (کی شرارتوں) سے آپ کو محفوظ رکھے گا۔

علاوہ بریں آپ کی شخصیت اس قدر عظیم الشان تھی کہ آپ کی ہیبت اور شکوہِ فطرت کی بنا پر، دشمن آپؐ کے سامنے لرزہ براندام ہو جاتا تھا۔ پھر آپؐ نے ترکِ وطن کیوں کیا؟ یہ تو قابلِ قیاس ہی نہیں کہ آپؐ نے دشمنوں کے خوف سے ایسا کیا۔ کیونکہ ہجرت سے پہلے مذکورہ بالا آیت (آپؐ کے اطمینانِ خاطر کے لئے) نازل ہو چکی تھی۔

بات یہ ہے کہ لوگوں نے ہجرت کا مفہوم ہی غلط سمجھا۔ سنو! حضورِ اکرم صلعم نے ہجرت فرما کر ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کو یہ سبق پڑھا دیا کہ ہجرت

کرنا مسلمان کی زندگی کا قانون ہے، اور اس کے دوام و استحکام کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب ہے اس کی توضیح یہ ہے کہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ملّت کے فوائدِ عمومی کے لئے اپنے ذاتی فائدہ سے دستبردار ہو جائے اور ادنیٰ مقاصد کے بجائے اعلیٰ مقاصد کو اپنا نصب العین بنائے۔ یعنی وطن (شبنم) کو ترک کر کے کائنات (یم) کی تسخیر کے لئے کوشش کرے۔

فلسفۂ ہجرت بیان کرنے کے بعد آخر میں اقبالؔ حسبِ دستور مسلمان سے خطاب کرتے ہیں۔ بلکہ اس کی سوئی ہوئی طاقتوں کو جگاتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ اے مسلمان! تُو وطن یا جنم بھومی (گُل) کی محبت دل سے نکال دے، کیونکہ تیرا نصب العین اس سے بہت بلند ہے۔ تیرا مقصود تو تسخیرِ کائنات (گلستاں) ہے۔

دیکھ لے! آفتاب کسی خطۂ ارضی کو اپنا وطن نہیں بناتا، تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ساری کائنات پر حکمراں ہے، یہ ساری دنیا اس کے پاؤں کے نیچے ہے۔

پس تجھے لازم ہے کہ تو ساحل (حدود) طلب نہ کرے، بلکہ بیکراں ہو جائے۔ اے مسلمان! مچھلی سے سبق لے۔ وہ کسی خاص مقام کو اپنا وطن نہیں بناتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سارا سمندر اس کا وطن ہے۔ پس تو بھی قیدِ مقام سے آزاد ہو جا۔

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی

دیکھ لے! جب تک بُوئے گُل، اوراقِ گُل میں محدود رہتی ہے، وہ اپنی دلکشی کو ظاہر نہیں کر سکتی۔ لیکن جب وہ ترکِ وطن کر دیتی ہے، تو سارے چمن پر

حکمران ہو جاتی ہے۔ اگر تو صبا کی روش اختیار کر لے، یعنی اگر تو وطن کا تصور دماغ سے نکال دے، تو پھر جس طرح وہ سارے گلشن کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے، اسی طرح تو ساری کائنات پر حکمران ہو جائے گا۔

اے مسلمان! عصرِ نو کے فریب میں مت آجانا۔ تیری قومیّت کی بنیاد وطن نہیں ہے۔ بلکہ دین (توحید و رسالت) ہے۔ اگر تو نے قرآنِ حکیم کی اس واضح تعلیم کو مدِ نظر نہ رکھا، تو گمراہی یقینی ہے۔

در معنیٔ ایں کہ وطن اساسِ ملت نیست

ملتِ اسلامیہ کی بنیاد وطن پر نہیں ہے

آں چناں قطعِ اخوت کردہ اند — بر وطن تعمیرِ ملت کردہ اند

تا وطن را شمعِ محفل ساختند — نوعِ انساں را قبائل ساختند

جنتے جستند در بئس القرار — (۱) تا اَحَلّوا قومھم دار البوار

ایں شجر جنت ز عالم بردہ است — تلخیٔ پیکار بار آوردہ است

مردمی اندر جہاں افسانہ شد — آدمی از آدمی بیگانہ شد

روح از تن رفت و ہفت اندام ماند — (۲) آدمیت گم شد و اقوام ماند

تا سیاست مسندِ مذہب گرفت — ایں شجر در گلشنِ مغرب گرفت

قصۂ دینِ مسیحائی فسرد — شعلۂ شمعِ کلیسائی فسرد

اُسقف از بے طاقتی در ماندہٗ — (۳) مہرہا از کف بروں افشاندہٗ

قومِ عیسیٰؑ بر کلیسا پا زدہ — نقدِ آئینِ چلیپا وا زدہ

دہریت چوں جامۂ مذہب درید — مرسلے از حضرتِ شیطاں رسید

---

(۱) اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ کُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَھُمْ دَارَ الْبَوَارِ جَھَنَّمَ یَصْلَوْنَھَا وَ بِئْسَ الْقَرَارُ ط (آیہ شریفہ)

(۲) ہفت اندام: اعضاءِ جسمانی ۱۲ (۳) اُسقف: پاپائے اعظم ۱۲-

آں فلار نساوی باطل پرست (۱) سرمۂ او دیدۂ مردم شکست
نسخۂ بہرِ شہنشاہاں نوشت در گلِ ما دانۂ پیکار کشت
فطرتِ او سوئے ظلمت بردہ رخت حق ز تیغِ خامۂ او لخت لخت
بتگری مانندِ آذر پیشہ اش بست نقشِ تازہ اندیشہ اش
مملکت را دینِ او معبود ساخت فکرِ او مذموم را محمود ساخت
بوسہ تا بر پائے ایں معبود زد نقدِ حق را بر عیارِ سود زد
باطل از تعلیمِ او بالیدہ است حیلہ اندازی فنے گردیدہ است
طرحِ تدبیرِ زبوں فرجام ریخت (۲) ایں خسک در جادۂ ایام ریخت
شب بچشمِ اہلِ عالم چیدہ است
مصلحت تزویر را نامیدہ است

فصل دہم

تمہید:- اس فصل میں اقبال نے نظریۂ وطنیت کے مفاسد بیان کئے ہیں۔ اور اُن سے آگاہ ہو جانے کے بعد ہر شخص پر یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ یہ نظریہ اسلام کی ضد ہے۔ یعنی کوئی مسلمان اس کو تسلیم کر لینے کے بعد مسلمان نہیں رہ سکتا۔ اس کی تفصیل یہ ہے:-

---

(۱) فلارنساوی یعنی میکیاولی، کتاب الملوک کا مشہور مصنف جو فلارنس میں پیدا ہوا ۱۲۔
(۲) خسک: کانٹے ۱۲۔

(۱) اس نظریہ کی رو سے وہ تمام افراد (خواہ وہ دینی یا مذہبی عقائد کے اعتبار سے باہم کر مختلف ہی کیوں نہ ہوں) جو کسی خاص ملک یا جغرافیائی حدود کے اندر رہتے ہیں، ایک قوم ہیں۔

(۲) مذہب، افراد کا نجی معاملہ ہے۔ اس لئے وہ سیاسی (وطنی) معاملات پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ اور نہ کسی سیاسی مسئلہ میں اس کی مداخلت گوارا کی جا سکتی ہے۔ یعنی مذہب اور سیاست زندگی کے دو مختلف شعبے ہیں جن میں کوئی ربط نہیں ہے۔

(۳) انسان کی وفاداری کا مرکز اور مرجع اس کا وطن ہے نہ کہ مذہب یعنی وطن کو مذہب پر تقدم اور تفوّق حاصل ہے۔ مثلاً انگلستان کا ایک باشندہ پہلے انگریز ہے پھر عیسائی یا یہودی ہے۔

(۴) ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنے وطن کو اپنی زندگی کا نصب العین یا مقصود حیات بنائے، یعنی ایک انگریز کا مرنا اور جینا اپنے وطن کے لئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مذہب کی توہین برداشت کر سکتا ہے لیکن اپنے وطن کی توہین گوارا نہیں کر سکتا۔

(۵) اگر کسی معاملہ میں وطن اور مذہب کا مفاد متصادم ہو جائے، تو وہ مذہبی مفاد کو وطنی مفاد پر قربان کر دے گا۔ چنانچہ تلک نے اسی بنیاد پر شیوا جی کی بدعہدی کو مستحسن قرار دیا تھا۔

(۶) انسان کی ہمدردی صرف اپنے وطن اور اہل وطن کے ساتھ ہوگی۔

(۷) نیکی و بدی یا خیر و شر کا معیار مذہب نہیں ہے بلکہ وطن ہے۔ ہر وہ

بات جس سے وطن کو تقویت پہنچے اچھی ہے، خواہ اخلاقی زاویہ نگاہ سے وہ مذموم ہی کیوں نہ ہو۔ اور ہر وہ بات جس سے وطن (مملکت) کو ضعف پہنچے بری ہے۔ خواہ مذہبی یا اخلاقی اعتبار سے وہ محمود ہی کیوں نہ ہو۔

اب اِن اُصولوں کا موازنہ اسلامی تعلیمات سے کیجئے:۔

(۱) اسلام کہتا ہے کہ مسلمانوں کی قوم وطن سے نہیں بنتی بلکہ عقیدہ توحید و رسالت سے بنتی ہے۔ ہر وہ شخص جو اللہ اور اُس کے رسولؐ پر ایمان لاتا ہے، قوم المسلمین میں داخل ہو جاتا ہے۔ خواہ وہ مشرق میں رہتا ہو یا مغرب میں۔

اسلام نے بنی آدم کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ مومن اور کافر۔ یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانے والے۔ اور اللہ اور اس کے رسولؐ کا انکار کرنے والے خواہ وہ مشرک ہوں یا بت پرست، آتش پرست ہوں یا ستارہ پرست، یہود ہوں یا نصاریٰ۔ یہ سب قوم الکافرین میں داخل ہیں۔ اور ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اسلام کو کفر پر غالب کرنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ قرآن عزیز اسے یہ دعا سکھاتا ہے:۔

فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ ۝ (۲: ۲۸۶)

یعنی اے اللہ ہمیں کافروں پر غلبہ عطا فرما۔

(۲) قرآن عزیز کی تعلیم یہ ہے کہ دینِ اسلام، انسان کا پرائیویٹ معاملہ نہیں ہے بلکہ اس کی زندگی کے ہر شعبہ میں اس کے لئے رہنما ہے۔ وہ محض عقائد کا نام نہیں ہے۔ بلکہ مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس لئے زندگی کا کوئی گوشہ اس کی گرفت سے آزاد نہیں رہ سکتا۔ یعنی مذہب اور سیاست جدا نہیں ہیں۔ اسلام دین بھی ہے،

معاشرت بھی ہے، سیاست بھی ہے، تمدن بھی ہے، مختصر یہ کہ سب کچھ ہے۔

(۳) ایک مسلمان کی وفاداری کا مرکز اور مرجع اس کا دین ہے نہ کہ وطن۔ اور ایک مسلمان پہلے بھی مسلمان ہے اور آخر میں بھی مسلمان ہے بلکہ وہ صرف مسلمان ہے۔ اور اگر وہ مسلمان نہیں ہے تو اللہ کی بارگاہ میں اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ یعنی پھر وہ کچھ بھی نہیں ہے۔

(۴) ہر مسلمان کو لازم ہے کہ اسلام کو اپنی زندگی کا مقصود یا نصب العین بنائے۔ کیونکہ اس کا مرنا اور جینا اللہ کے لئے ہے نہ کہ وطن (مملکت) کے لئے۔

(۵) چونکہ اسلام میں دین اور سیاست دو جداگانہ شعبے نہیں ہیں اس لئے ان میں تصادم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مسلمان ہر حال میں اسلام کا وفادار سپاہی ہے۔

(۶) مسلمان کی ہمدردی ہر حال میں اسلام کے ساتھ ہو گی۔ اگر مثلاً ایک پاکستانی مسلمان کے سامنے وطن (پاکستان) اور اسلام کی عزت کا مسئلہ درپیش ہو، تو وہ بلا تامل اسلام کی عزت کو مدِ نظر رکھے گا۔ اور اگر اس کا وطن اسے اسلام سے غداری پر مائل کرے، تو ایسے وطن سے ہجرت کر کے کسی دوسری جگہ چلا جائے گا۔ کیونکہ ساری دنیا اس کا وطن ہے۔ اس کی قومیت کسی خاص خطۂ ارضی سے وابستہ نہیں ہے۔

ع ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

(۷) خیر و شر کا معیار مذہب ہے یا دین نہ کہ وطن۔

اس موازنہ سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکارا ہو سکتی ہے

کہ نظریۂ وطنیت، وطن کو وہی درجہ دیتا ہے جو اسلام نے اللہ تعالیٰ کو دیا ہے۔ اس لیے ایک مسلمان اصطلاحی معنی میں وطن پرست نہیں ہو سکتا۔ یعنی نظریۂ وطنیت اسلام کی ضد ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ نے ساری عمر اس نظریہ کے خلاف جہاد کیا اور میری رائے میں یہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

اب میں اس فصل کا مطلب لکھتا ہوں۔

کہتے ہیں کہ یورپ کے اربابِ سیاست نے وطن کو قوم کی بنیاد قرار دے کر اخوت کے اصول کا خاتمہ کر دیا۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ مثلاً جو مسلمان چین میں رہتے ہیں، اگر وہ وطنیت کے نظریہ کو قبول کر لیں تو وہ جاپان یا کوریا کے مسلمانوں سے نہ رشتۂ اخوت قائم کر سکتے ہیں نہ کسی آڑے وقت میں ان کی امداد کر سکتے ہیں، کیونکہ اس نظریہ کی رُو سے ایک چینی مسلمان، اگر وطن اُسے حکم دے، جاپانی مسلمان کے خلاف جنگ کرنے پر مجبور ہے۔

نظریۂ وطنیت کی رو سے ہر وہ شخص جو میرے وطن میں نہیں رہتا میرا نہیں ہے۔ اور نہ میں اُس کے ساتھ کسی قسم کی ہمدردی کر سکتا ہوں، کیونکہ میری ہمدردی تو میرے وطن کے ساتھ مختص ہو چکی ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کے بجائے وطن کا غلام ہوں۔ وطن کا طابعِ فرمان ہوں۔ میں اُسی کو دوست سمجھوں گا جسے میرا وطن میرا دوست قرار دے۔ مثلاً اگر برطانیہ کل کو روس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دے، تو ہر برطانوی مسلمان بلکہ ہر وہ مسلمان جس کے گلے میں "درجۂ نو آبادیات" کا طوق پڑا ہوا ہے۔ روسی مسلمان کو اپنا دشمن اور روس کو دشمن کا ملک قرار دے گا۔ خواہ اس میں کروڑوں

مسلمان کیوں نہ بستے ہوں۔ یہ نظریۂ وطن کی رُو سے انسانوں میں ما بہ الاشتراک وطن بنتا ہے نہ کہ ان کا عقیدہ۔ اگر کوئی برطانوی مسلمان بحالتِ جنگ کسی روسی مسلمان سے ہمدردی کرے گا، تو وہ غدارِ قوم قرار دیا جائے گا۔ کیونکہ وفاداری کا مرجع وطن ہے نہ کہ مذہب یا دین۔

حاشیہ:۔ میرے دل میں رئیس الاحرار فنا فی القوم محمد علی مرحوم و مغفور (متوفی سنہ ۱۹۳۱ع کی بہت عزت ہے) اور میں اُن سے بہت محبت کرتا ہوں۔ اس کی وجہ یہی تو ہے کہ اقبالؔ نے جو زبان سے کہا۔ انہوں نے اس پر عمل کر کے دنیا کو دکھا دیا۔

سنہ ۱۹۱۵ء میں جب ترکوں نے انگریزوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا تو مرحوم نے صاف لفظوں میں دشمنانِ اسلام سے کہہ دیا کہ ہماری ہمدردی ترکوں کے ساتھ ہے، کیونکہ وہ ہمارے بھائی ہیں۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں کانگریس نے "ترکِ موالات" کا اعلان کیا، تو اس مردِ حُر نے کراچی کی تقریر میں مجمعِ عام میں یہ کلمۂ حق کہا کہ مسلمانوں پر انگریزوں کی فوج میں ملازمت کرنی حرام ہے۔ کیونکہ دنیا کے تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اگر انگریز کل کو کسی اسلامی ملک کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیں تو مسلمان اپنے بھائی کے سینہ کو گولی کا نشانہ بنانے پر مجبور ہوگا۔ اس پر انگریزوں نے مولانا اور اُن کے رفقاء پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا۔

جناب ابوالکلام صاحب آزاد بھی اسی "جرم" میں ماخوذ تھے۔ انہوں نے اپنے تحریری بیان میں یہ جملہ بھی لکھا تھا کہ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد وطن پر نہیں ہے۔ بلکہ اس بات پر ہے کہ وہ دنیا میں قرآن کی صداقت کے گواہ ہیں یعنی مسلمانوں کی قومیت اُن کے دین پر مبنی ہے نہ کہ وطن یا نسل پر۔ ۱۲

یورپ کے اربابِ سیاست نے نظریۂ وطنیت اختیار کرکے دنیا والوں کو توقبیلوں میں منقسم کردیا (یعنی جس طرح پہلے زمانے میں مختلف قبیلے آپس میں برسرِ پیکار رہتے تھے، اسی طرح آج مختلف قومیں ایک دوسرے کی دشمن بنی ہوئی ہیں) اور اس دنیا کو جہنم کا نمونہ بنا دیا۔ اور پھر اس جہنم میں جنت کی تلاش کرنے لگے۔ جنت تو کیا ملتی، ہاں یہ ضرور ہوا کہ ان لوگوں نے اپنی اپنی قوم کو ہلاکت کے گڑھے میں دھکیل دیا۔

اقبالؔ نے اس شعر کا مضمون اس آیت سے اخذ کیا ہے:۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ کُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَھُمْ دَارَ الْبَوَارِ جَھَنَّمَ یَصْلَوْنَھَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ ط (۱۴: ۲۸ و ۲۹)

کیا آپ نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جنھوں نے اللہ کی نعمت کو کفر سے بدل دیا۔ اور (اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ) اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر یعنی جہنم میں پہنچا دیا۔ وہ اس میں داخل ہوں گے۔ اور وہ بہت بری جگہ ہے قرار کی یعنی سکونت کی۔ ۱۲

وطنیت وہ درخت ہے جس کے اثمار نے دنیا کو امن وامان اور سلامتی (جنت) سے یکسر محروم کردیا ہے۔

اس کی بدولت دنیا سے شرافت (مردمی) کا خاتمہ ہوگیا اور بھائی کا بھائی دشمن بن گیا۔

؎ قیامت ہے کہ انساں، نوعِ انساں کا شکاری ہے

اس ناپاک تعلیم کی بدولت انسانوں کے اندر سے انسانیت (مروت، ہمدردی اور شرافت تمام خوبیوں) کا خاتمہ ہوگیا، صرف حیوانیت باقی رہ گئی ہے۔ یعنی آج بلحاظِ اطوار، انسانوں اور حیوانوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ جس طرح ایک بھیڑیا

دوسرے بھیڑیئے کا دشمن ہوتا ہے، اسی طرح ایک قوم دوسری قوم کی بدخواہ بنی ہوئی ہے۔

جب ازمنۂ وسطیٰ میں سیاست، مذہبِ عیسوی کو شکست دے کر مسندِ اقتدار پر متمکن ہوئی تو اُس نے گلشنِ مغرب میں وطنیت کا بیج بو یا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کلیسا کی شمع بالکل گل ہو گئی۔ یعنی اربابِ سیاست نے پاپائے روم کو سیاسی اقتدار سے بکلی محروم کر دیا اور یہ کہا کہ تم مذہبی پیشوا ہو اس لیے بڑے شوق سے لوگوں کی حیاتِ آخروی کا انتظام کرو لیکن تمہیں دنیاوی یا سیاسی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ یعنی مذہب کو سیاست سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کی قوم نے خود اپنے طرزِ عمل سے آنجناب کی تعلیمات کو باطل کر دیا۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ دنیا میں جس قدر انبیاءؑ مبعوث ہوئے سب نے قومیت کی بنیاد، دینِ اسلام[۱] یا توحید و رسالت کے عقیدے پر رکھی۔ چنانچہ جب حضرت عیسیٰؑ تشریف لائے تو ان پر ایمان لانے والے ایک قوم بن گئے اور ان کے منکر دوسری قوم بن گئے یعنی کافر۔

جب یورپ میں نصرانیت شائع ہوئی تو "آئینِ چلیپا" کی رُو سے ہسپانوی، فرانسیسی، اطالوی، جرمنی، انگریز یہ سب لوگ نصرانی ہونے کی بنا پر ایک قوم تھے۔ لیکن ان لوگوں نے نصرانیت کی تعلیم کو خیرباد کہہ کر مذہب کے بجائے وطن کو اپنی قومیت کی بنیاد قرار دے دیا۔

---

[۱] ہر نبی نے اسلام ہی کی تعلیم دی تھی، لیکن لوگوں نے اسے مسخ کر دیا۔ اور اسلام کو نبی سے منسوب کر کے اس کا نام بدل دیا۔

جب یورپ مذہب کی گرفت سے آزاد ہو کر دہریت کی طرف مائل ہو گیا۔ تو ایک اطالوی سیاستداں نے (جسے اقبالؔ نے فرستادۂ شیطان قرار دیا ہے) جو فلارنس کا باشندہ تھا اور جس کا نام میکیاؔ ولی تھا لوگوں کی آنکھوں میں ایسا سرمہ لگایا جس سے ان کی قوتِ بصارت بالکل زائل ہو گئی۔ یعنی وہ حق اور باطل میں امتیاز کرنے کی قوت سے محروم ہو گئے۔

اُس نے بادشاہوں کے لئے ایک کتاب لکھی اور اس کی تعلیمات کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ کے لوگ، جو سب مذہبِ عیسوی کے پیرو تھے، مختلف اقوام میں منقسم ہو کر آپس میں برسرِ پیکار ہو گئے اور ابھی تک یہی کیفیت ہے۔

اُس نے حق و صداقت دونوں کا خاتمہ کر دیا اور وطن کو ایک عظیم الشان بت کی شکل میں پیش کر کے اہلِ یورپ کو اس نئے بُت کا پجاری بنا دیا۔

اُس نے مملکت (اسٹیٹ) کو بنی آدم کے معبود کا درجہ دے دیا اور مذموم (بُری) باتوں کو محمود (اچھی) قرار دیا۔

اس کی تعلیم کی بدولت باطل کو دُنیا میں فروغ حاصل ہوا، اور عیاری، مکاری، (ڈپلومیسی) ایک فن بن گئی اور فریب کا نام مصلحت (پالیسی) ہو گیا۔

استدراک

میکاولی پر نوٹ

اقبالؔ نے اس فصل میں اجمالی طور پر میکاوؔلی کے فلسفۂ سیاست پر تنقید کی ہے۔ ناظرین کی سہولت کی خاطر میں اس کی قدرے وضاحت کئے دیتا ہوں :-

میکاولی کے سوانح :- ازمنۂ وسطیٰ کا یہ مشہور سیاسی مفکر ۱۴۶۹ء میں اٹلی کے مشہور شہر فلارنس میں ایک دولتمند گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا آغاز وزارتِ خارجہ میں ایک کلرک کی حیثیت سے کیا۔ لیکن اپنی ذاتی قابلیت کی بدولت بہت جلد اونچے مرتبہ پر پہنچ گیا۔ چنانچہ جمہوریہ فلارنس نے سولھویں صدی کے آغاز میں اس کو اپنا سفیر بنا کر لوئی دوازدہم کے دربار میں بھیجا۔ چونکہ ۱۵۱۲ء میں جمہوریہ فلارنس کا خاتمہ ہو گیا۔ اس لئے میکاولی مجبوراً گوشہ نشین ہو گیا۔ اور اس حالتِ عزلت میں اُس نے دو کتابیں لکھیں۔ (۱) مقالاتِ سیاسی (۲) کتاب الملوک۔ ۱۵۲۷ء میں وفات پائی۔

پندرھویں اور سولھویں صدی میں اٹلی کی سیاسی حالت

جس وقت میکاولی نے ہوش سنبھالا تو اُس نے دیکھا کہ میرا ملک طوائف الملوکی

خانہ جنگی اور امراء کی ریشہ دوانیوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ دولتمندوں سے لے کر دوکاندار اور مزدور تک عیاشی میں مستغرق ہے۔ ان باتوں سے بڑھ کر تکلیف دہ بات یہ تھی کہ اسقفِ اعظم (پوپ) اور اس کے حاشیہ نشین لوگوں کے سامنے اپنے طرزِ عمل سے بہت بُرا نمونہ پیش کر رہے تھے۔ دوسرے اطالوی مصنفین اور مفکرین کی طرح میکاولی نے کلیسائے روم ہی کو تمام خرابیوں کا ذمّہ دار قرار دیا ہے۔[1] چنانچہ وہ اپنے مقالات میں یوں رقم طراز ہے:۔

---

[1] میکیاولی اور اس کے عہد کے دوسرے مصنّفین اور موجودہ زمانے کے مورخین نے پوپوں اور ان کے ماتحتوں کی زندگیوں کے جو حالات درج کیے ہیں اور جن جن الفاظ سے ان کو یاد کیا ہے میں اس شرح میں نہ ان کو درج کر سکتا ہوں اور نہ کرنا چاہتا ہوں۔ مبادا اس ملک کے رومن کیتھولک باشندے اُن تصریحات کو "دل آزاری" سے تعبیر کریں۔ لیکن جو حضرات کو حقیقت حالات سے آگاہی مطلوب ہو، وہ حسبِ ذیل کتب خود پڑھ لیں۔

۱۔ تاریخ نظریہ سیاسی، مولفہ ڈاکٹر جی۔ ایچ سیبائن صفحہ ۲۸۹ تا صفحہ ۳۰۲

۲۔ یورپ کے ذہنی ارتقاء کی تاریخ، مولفہ ڈاکٹر ڈریپر۔

۳۔ سائنس اور الٰہیات میں مناقشات کی تاریخ، مولفہ ڈاکٹر اے۔ ڈی وہائٹ۔

۴۔ معرکۂ مذہب و سائنس، مولفہ ڈاکٹر ڈریپر۔

۵۔ تاریخ اساقفِ روما، مولفہ پروفیسر رینکی۔

۶۔ تاریخ اخلاقِ یورپ، مولفہ پروفیسر لیکی۔

ہم اطالوی لوگ رومی کلیسا اور اس کے پادریوں ہی کی وجہ سے اس قدر لا مذہب اور بدکردار ہو گئے ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر مصیبت یہ ہے کہ اس کلیسا نے ہمارے ملک کو شدید قسم کے انتشار میں مبتلا کر دیا ہے۔ نہ تو اس میں خود اتنی طاقت ہے کہ وہ ملک میں اتحاد قائم کر سکے اور نہ وہ دوسروں کو اس کی اجازت دیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم لوگ ہر قسم کی مصیبت سے دوچار ہو گئے ہیں۔"

تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ سولہویں صدی میں اطالوی معاشرہ خرابیوں اور بدکاریوں اور اخلاقی برائیوں کی انتہائی پستی میں گرا ہوا تھا۔ بعض مؤرخین نے اس زمانے کو "حرامزادوں اور قسمت آزماؤں کا دور" قرار دیا ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ میکیاولی درحقیقت محبِ وطن تھا۔ اس کا دل اپنے وطن کی بربادی پر ہر وقت کڑھتا رہتا تھا۔ چنانچہ یہ بات اس کی تصانیف کے مطالعہ سے بالکل واضح ہو سکتی ہے۔ اور چونکہ وہ ایمانداری کے ساتھ رومی کلیسا کو تمام خرابیوں کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔ اس لئے وہ پہلے کلیسا اور بعد ازاں نفسِ مذہب ہی سے متنفر ہو گیا۔

بدقسمتی سے اس کے سامنے صرف ایک ہی مذہب تھا اور اس کو اربابِ کلیسا نے اس درجہ مسخ کر دیا تھا کہ ایک میکیاولی ہی پر کیا موقوف ہے یورپ کا ہر تعلیم یافتہ آدمی اس سے بیزار ہو گیا تھا۔ اکثر مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ یورپ میں ارتیابیت، دہریت، مادیت اور لامذہبیت کی ترویج اور اشاعت کا سب سے بڑا سبب رومی کلیسا کا طرزِ عمل تھا۔

میکیاولی کی تصانیف:۔ اس نے بہت سی کتابیں لکھیں لیکن اس کی دو[2] سیاسی تصانیف یعنی کتاب الملوک اور ٹائیٹس لوئیش کی پہلی دس فصول پر مقالات بہت مشہور ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں جو شئے مشترک ہے، وہ یہ ہے کہ میکیاولی نے حصولِ مقصد کے لئے ہر بات کو جائز قرار دیا ہے[1]۔

اُس نے سیاست کو مذہب سے اور اس کی گرفت سے بالکل آزاد کر دیا۔ اور کئی مقامات میں حکمرانوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ اگر حصولِ مقصد ——— اور اس کی نظر میں مقصدِ اعلیٰ صرف یہ ہے کہ مملکت طاقتور ہو جائے ——— کے لئے اخلاقِ حسنہ کو بالائے طاق رکھنا پڑے تو شوق سے ایسا کر سکتے ہو۔ اصلی چیز مملکت ہے۔ اس لئے اس کے استحکام اور بقا کے لئے مذہب اور اخلاق دونوں کو بلا تامل قربان کیا جا سکتا ہے۔

اُس نے اپنی تصانیف میں مسیحیت کو بھی ہدفِ اعتراضات بنایا ہے، اور اس کو سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ مسیحی ضابطۂ اخلاق، انسانوں کے اندر غلامانہ ذہنیت[2] پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ وہ مقالات میں رقمطراز ہے:۔

"ہمارا مذہب فروتنی، مسکینی اور عاجزی کو سب سے بڑی نیکی قرار دیتا ہے۔

---

[1] اسی کی تعلیمات کی بدولت یورپ اس مقولہ پر عامل ہوا ہے کہ

"محبت اور جنگ میں ہر بات جائز ہے۔"

[2] یہی اعتراض نطشہ نے عائد کیا ہے، ملاحظہ ہو اس کی مشہور تصنیف اینٹی کرائسٹ ۱۲۔

اور دُنیاوی مقاصد کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں دیگر مذاہبِ عالم، رُوح کی بلندی، جسم کی طاقت اور اُن صفات کو جن سے بنی آدم میں شوکت اور ہیبت کا رنگ پیدا ہو، اخلاقِ حسنہ سمجھتے ہیں۔ مسیحیت کے اصولوں نے میری رائے میں ہمیں بہت کمزور کر دیا ہے، اور اسی لئے ہم بدکاروں کے چنگل میں بآسانی پھنس جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ مسیحیوں کی اکثریت، حصولِ بہشت کی خاطر، توہین کا انتقام لینے کے بجائے، اسے برداشت کرنے کو مناسب بلکہ بہتر خیال کرتی ہے۔"

اُس نے حکمرانوں کو بیشک یہ مشورہ دیا کہ مملکت کو مستحکم کرنے کے لئے مذہب اور اخلاق دونوں کو پسِ پشت ڈال دو۔ لیکن عوام کے لئے اس کا فیصلہ یہ ہے کہ انہیں مذہب، اخلاق، انصاف اور ایمانداری ان تمام باتوں کو مدِّ نظر رکھنا چاہئیے۔ اس کی یہی دو رنگی یا منافقت ہے جس نے اُسے بہت زیادہ بدنام کیا۔ اور بجا طور پر کیا۔ اور یہی میکیاویلیت ہے۔ اور اسی وجہ سے اقبالؔ نے اُسے "مُرسلِ شیطان" قرار دیا ہے۔ وہ عوام سے تو یہ کہتا ہے کہ اخلاقِ حسنہ کی پابندی کرو لیکن حکمرانوں کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ وطن (اسٹیٹ) کو مستحکم کرنے کے لئے جھوٹ، فریب، دغا، بے ایمانی، مکاری، عیّاری سب جائز ہے۔

اسی لئے اُس نے حکمران کی ذات کو مملکت کے قانون کی گرفت سے بالاتر کیا ہے۔ اور یہیں سے یہ نظریہ پیدا ہوا کہ

"ایک بادشاہ کبھی غلطی نہیں کرتا، کیونکہ کر نہیں سکتا۔"

گویا جس طرح کلیسا نے پوپ کو معصوم قرار دیا تھا، میکیاولی نے پوپ اور کلیسا کا زور کم کرنے کے لئے حکمران کو معصومیت کا درجہ دے دیا۔

اُس نے حکمرانوں کو صاف لفظوں میں ظلم و ستم، دغا بازی، فریب کاری اور قتل و غارت کا مشورہ دیا ہے۔ بشرطیکہ ان باتوں سے مملکت کو تقویت حاصل ہو سکے یا اقتدار میں اضافہ ہو سکے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:۔

"جو بادشاہ اپنے اقتدار کو برقرار رکھنا چاہتا ہے، اسے اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ ہر حال میں نکوکاری لازمی نہیں ہے۔ بعض اوقات نیکی (صداقت) انسان کے لئے بہت سی مصائب کا موجب بنجاتی ہے۔ اور بسا اوقات بدی کا راستہ اس کے لئے پیام راحت بنجاتا ہے۔"

اُس نے یہ بھی تعلیم دی ہے کہ وطن اور اس کی محبت، اس کی خدمت اور اس کا استحکام، یہ انسان کا پہلا فرض ہے۔ اور اس کے سامنے مذہب اور اخلاق سب کو قربان کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:۔

"لیکن جہاں اور جس وقت وطن کی حفاظت اور بقار کا سوال در پیش ہو، تو ہر شخص کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کے لئے اپنی جان قربان کر دے اور اپنے وطن کو بچانے کے لئے، سچ اور جھوٹ، عدل اور نا انصافی، مروت اور ظلم، ذاتی عزت اور ذلت، سب اصولوں کو بالائے طاق رکھدے۔ اس وقت ہر شخص کو اس سوال پر غور کرنا چاہیئے کہ میں اپنے وطن کو کس طریقہ سے بچا سکتا ہوں۔؟"

میکیاولی کی اس تعلیم کو سامنے رکھ کر، اقبالؔ کے اس مصرع کے معنٰی بآسانی سمجھ میں آ سکتے ہیں کہ

ع مملکت را دینِ او معبود ساخت

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ میکیاولی نے

۱۔ وطن کو انسانوں کے لئے ایک بُت یا معبود بنا دیا۔

۲۔ مذہب اور اخلاق کو سیاست سے خارج کر دیا۔

۳۔ جھوٹ اور مکاری بلکہ ہر بُرائی کو "فن" بنا دیا۔

۴۔ تمام یورپ کو اخلاقی قیود سے آزاد کر دیا۔ اور اس طرح الحاد کے لئے راستہ صاف کر دیا۔

۵۔ مملکت (اسٹیٹ) کو انسانوں کے خیالات بلکہ عقائد پر بھی حکمران بنا دیا۔

۶۔ اربابِ سیاست کو مذہب سے بیگانہ کر دیا۔

در معنیٰ این که ملّتِ محمدیّہ نہایتِ زمانی ہم ندارد که

ملّتِ اسلامیہ قیامت تک باقی رہیگی

دوام این ملّتِ شریفہ موعود است

در بہاراں جوشِ بلبل دیدهٔ رستخیزِ غنچہ و گل دیدهٔ
چوں عروساں غنچہ ہا آراستہ از زمیں یک شہرِ انجم خاستہ
سبزہ از اشکِ سحر شوئیدهٔ از سرودِ آبِ جو خوابیدهٔ
غنچۂ بر می دمد از شاخسار گیردش بادِ نسیم اندر کنار
غنچۂ از دستِ گلچیں خوں شود از چمن مانندِ بو بیروں رود
بستِ قمری آشیاں بلبل پرید قطرۂ شبنم رسید و بو رمید
رخصتِ صد لالۂ ناپائیدار کم نسازد رونقِ فصلِ بہار
از زیاں گنجِ فراوانش ہماں محفلِ گلہائے خندانش ہماں
فصلِ گل از نسترن باقی تراست از گل و سرو و سمن باقی تراست
کانِ گوہر پرورے گوہر گرے کم نگردد از شکستِ گوہرے
صبح از مشرق ز مغرب شام رفت جامِ صد روز از خمِ ایام رفت
بادہ ہا خوردند و صہبا باقی است دوشہا خوں گشت و فردا باقی است

همچنان از فردهائے بے سپر — هست تقویمِ امم پائنده تر

در سفر یار است و صحبت قائم است — فرد ره‌گیر است و ملت قائم است

ذاتِ او دیگر صفاتش دیگر است — سنتِ مرگ و حیاتش دیگر است

فرد برمی‌خیزد از مشتِ گلے — قوم زاید از دلِ صاحبدلے

فرد پورِ شصت و هفتاد است و بس — قوم را صد سال مثلِ یک نفس

زنده فرد از ارتباطِ جان و تن — زنده قوم از حفظِ ناموسِ کهن

مرگِ فرد از خشکیِ رودِ حیات — مرگِ قوم از ترکِ مقصودِ حیات

گرچه ملت هم بمیرد مثلِ فرد — (۱) از اجل فرمان پذیرد مثلِ فرد

امتِ مسلم ز آیاتِ خداست — اصلش از هنگامهٔ قالوا بلیٰ ست

از اجل این قوم بے پروا ستے — (۲) استوار از نحن نزلنا ستے

ذکر قائم از قیامِ ذاکر است — از دوامِ او دوامِ ذاکر است

تا خدا ان یطفئوا فرموده است — (۳) از فسردن این چراغ آسوده است

امتے در حق پرستی کاملے — امتے محبوبِ هر صاحبدلے

حق برون آورد این تیغِ اصیل — از نیامِ آرزوهائے خلیلؑ

تا صداقت زنده گردد از دمش — غیرِ حق سوزد ز برقِ پیهمش

ما که توحیدِ خدا را حجتیم — حافظِ رمزِ کتاب و حکمتیم

---

(۱) وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ (آیهٔ شریفه) (۲) إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (آیهٔ شریفه)

(۳) يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ (آیهٔ شریفه)

آسماں با ما سرِ پیکار داشت
در بغل یک فتنۂ تاتار داشت

بند ہا از پا کشود آں فتنہ را
بر سرِ ما آزمود آں فتنہ را

فتنۂ پامالِ راہش محشرے
کشتۂ تیغِ نگاہش محشرے

خفتہ صد آشوب در آغوشِ او
صبحِ امروزے نزاید دوشِ او

سطوتِ مسلم بخاک و خوں تپید
دید بغداد آنچہ روما ہم ندید

تو مگر از چرخِ کج رفتار پرس
زاں نو آئینِ کہن پندار پرس

آتشِ تاتاریاں گلزار کیست؟
شعلہ ہائے او گلِ دستارِ کیست؟

زانکہ ما را فطرت ابراہیمی است
ہم بہ مولیٰ نسبت ابراہیمی است

از تہِ آتش بر اندازیم گُل
نارِ ہر نمرود را سازیم گل

شعلہ ہائے انقلابِ روزگار
چوں بباغِ ما رسد گردد بہار

رومیاں را گرم بازاری نماند
آں جہانگیری جہانداری نماند

شیشۂ ساسانیاں در خوں نشست
رونقِ خمخانۂ یوناں شکست

مصر ہم در امتحاں ناکام ماند
استخوانِ او تہِ اہرام ماند

در جہاں بانگِ اذاں بودست و ہست
ملتِ اسلامیاں بودست و ہست

عشق آئینِ حیاتِ عالم است
امتزاجِ سالماتِ عالم است

عشق از سوزِ دلِ ما زندہ است
از شرارِ لا الٰہ تابندہ است

گرچہ مثلِ غنچہ دلگیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما

(فصل یازدہم)

تمہید:۔ اس فصل میں اقبالؔ نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ جس طرح ملّتِ اسلامیہ کسی مکان (ملک) میں محدود نہیں ہے۔ بلکہ ایک آفاقی نظام ہے اسی طرح وہ مختص بالزماں بھی نہیں ہے بلکہ ہمیشہ زندہ رہے گی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی بقاء کا قرآن مجید میں وعدہ فرمایا ہے۔ اس نکتہ کو اقبالؔ نے موسم بہار کی مثال سے واضح کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

اے مخاطب! تو نے موسم بہار میں پھولوں کی افراط کا مشاہدہ تو ضرور کیا ہوگا۔ لیکن جب یہ موسم ختم ہو جاتا ہے تو قمریاں اور بلبلیں بھی رخصت ہو جاتی ہیں۔ اس کے باوجود یعنی پھولوں کے ختم ہو جانے سے فصلِ گُل کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ بالفاظِ دگر موسم بہار کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا۔ ہر سال یہ موسم آتا ہے اور ہر سال نئے پھول پیدا ہوتے ہیں۔

پھولوں کے مرجھا جانے سے فصلِ گُل کو نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ کانِ گوہر سے اگر چند جواہرات نکال لیئے جائیں تو کان میں کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح افراد کے مر جانے سے قوم نہیں مر جاتی۔ فرد بیشک راہ گیر (مسافر) ہے۔ لیکن قوم قائم (مستقل) رہتی ہے۔

فرد اور ملّت کی زندگی میں نمایاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ فرد، مٹی (مشتِ گِل) سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن قوم، نبی کی تعلیمات سے عالمِ وجود میں آتی ہے۔

فرد کی زندگی عموماً ساٹھ سے لے کر ستّر سال تک ہوتی ہے۔ لیکن قوم کی زندگی میں سو سال بھی ایک لمحہ کے برابر ہوتے ہیں۔

فرد جان و تن کے ارتباط سے زندہ رہتا ہے۔ لیکن قوم کی زندگی قومی روایات پر موقوف ہے۔

فرد کی موت کا سبب یہ ہوتا ہے کہ اس کی زندگی کا سرچشمہ خشک ہو جاتا ہے۔ لیکن قوم اس وقت فنا ہوتی ہے جب وہ اپنے مقصدِ حیات سے غافل ہو جائے۔

یہ صحیح ہے کہ وقتِ مقررہ پر قومیں بھی مر جاتی ہیں۔ لیکن دنیا میں مسلمانوں کی قوم ایسی ہے جو اجل سے محفوظ ہے، اس کو فنا کا خوف نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی بقاء کا سامان مقرر فرما دیا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآنِ مجید فرماتا ہے:۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝

بیشک ہم ہی نے اس نصیحت نامہ (ذکر) کو نازل کیا ہے اور ہم نے خود ہر حال میں اس کی حفاظت کا ذمہ بھی لے لیا ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ قرآنِ حکیم قیامت تک علیٰ حالہٖ اور بجنسہٖ باقی رہے گا۔ تو اس کے پڑھنے والے، اس پر ایمان لانے والے یعنی ذاکرینِ قرآن بھی باقی رہیں گے کیونکہ منطقی طور پر ثابت ہے کہ

ع ذکر قائم از قیامِ ذاکر است

یعنی بقائے ذکر (قرآن) تادم بقائے ذاکر (اہلِ قرآن) ہے۔

اگر ذاکرین نہ ہوں تو ذکر کے باقی رہنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ بالفاظِ دگر ملّتِ اسلامیہ بھی قیامت تک باقی رہے گی۔

قرآنِ حکیم نے یہ پیشگوئی بھی فرمائی ہے:۔

یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاہِھِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ ہ

کافر یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور (قرآنِ حکیم یا اسلام) کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور کو مرتبۂ کمال تک پہنچائے گا۔ خواہ کافروں کو یہ بات ناگوار ہی کیوں نہ لگے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اسلام (جو قرآن حکیم میں محفوظ ہے) قیامت تک زندہ رہے گا۔ دُنیا کی کوئی طاقت اُسے صفحۂ ہستی سے فنا نہیں کر سکتی، کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا وعدہ فرما لیا ہے۔

اِس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ مُسلمان بھی قیامت تک زندہ رہیں گے۔ کیونکہ یہ بات عقل میں نہیں آسکتی کہ اسلام تو زندہ رہے اور مسلمان دُنیا سے مٹ جائیں۔

اس کے بعد اقبالؔ ملّتِ اسلامیہ کی خصوصیات بیان کرتے ہیں۔

(۱) یہ اُمّت حق پرستی میں کامل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں میں صدہا عیوب ہیں لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید میں کسی قسم کی آمیزش نہیں کی ہے۔ اسلام کے علاوہ دنیا میں جس قدر مذاہب پائے جاتے ہیں، اُن کے پیرووں نے اپنے اپنے مذہب کے بانی کو کسی نہ کسی رنگ میں خدا یا خدا

کا ہم پلہ بنا کر عقیدۂ توحیدِ باری کو فنا کر دیا۔

(۲) حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ میری ذریت (نسل) سے ایسی قوم پیدا ہو جو دنیا میں تیری توحید کی اس شمع کو برقرار رکھ سکے جو میں نے روشن کی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دُعا قبول فرمائی اور ملتِ محمدؐیہ کو پیدا کیا، تاکہ توحید (صداقت) دنیا میں قائم ہو سکے۔

(۳) چنانچہ ہم مسلمان، توحیدِ الٰہی پر (دلیل) ہیں۔ نیز کتاب اللہ (قرآنِ حکیم) اور سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محافظ ہیں۔

اس کے بعد اقبالؔ نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ مسلمانوں کی ملّی تاریخ میں ایک دور ایسا بھی آیا جب ۱۲۸۵ء میں ہلاکو نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ عنقریب مسلمان صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے۔ لیکن

ع پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانہ سے

قدرتِ خداوندی کا کرشمہ قابلِ دید ہے کہ وہی تاتاری اسلام قبول کرنے کے بعد ملّت کے خادم بن گئے۔

چونکہ ہماری فطرت ابراہیمی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہماری نسبت بھی ابراہیمی ہے۔ یعنی ہم چونکہ توحیدِ الٰہی کے علمبردار ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ ملّتِ اسلامیہ کی بقاء کا خود ضامن ہے۔

دیکھ لو! رومی، ساسانی، یونانی، مصری یہ تمام قومیں جنہوں نے اپنے اپنے زمانہ میں غیر معمولی شان و شوکت حاصل کی اور عظیم الشان سلطنتیں

قائم کیں، دنیا کو تہذیب و تمدن سے روشناس کیا۔ جملہ علوم و فنون میں شہرت حاصل کی، انجام کار دُنیا سے مٹ گئیں اور اس طرح کہ آج ان کا نام لیوا بھی کوئی نہیں ہے۔ لیکن دنیا میں آذان کی آواز چودہ سو سال سے گونج رہی ہے۔ اور انشاء اللہ ہمیشہ گونجتی رہے گی۔ ملّتِ اسلامیہ زندہ ہے، اور انشاء اللہ قیامت تک زندہ رہے گی۔

وجہ یہ ہے کہ کائنات کی زندگی کا انحصار عشق پر ہے۔ چنانچہ سالماتِ عالم میں اسی کی بدولت، امتزاج کی صفت (جذب کی قوت) پیدا ہوئی۔ یہ کائنات کششِ باہمی کی بدولت قائم ہے۔ اور کشش، عشق ہی کی فعلیت کا دوسرا نام ہے۔ اور عشق کا انحصار ہمارے دل کے سوز پر ہے۔ اور ہمارے دل میں یہ سوز و گداز لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی بدولت پیدا ہوا ہے۔

یہ سچ ہے کہ موجودہ دور میں ہم مشکلات سے دوچار ہیں اور اس لئے ملول (دلگیر) ہیں۔ لیکن ہم مٹ نہیں سکتے۔ کیونکہ اگر ہم مٹ گئے۔ تو یہ کائنات بھی مٹ جائے گی۔

در معنیٔ این که نظامِ ملّت غیر از آئین صورت

قرآنِ حکیم ملّتِ محمدیہؐ کا آئین ہے

نبندد و آئینِ ملّتِ محمدیہؐ قرآن است

ملّتے را رفت چوں آئیں ز دست — مثلِ خاک اجزائے او از ہم شکست
ہستیٔ مسلم ز آئین است و بس — باطنِ دینِ نبیؐ این است و بس
برگِ گل شد چوں ز آئیں بستہ شد — گل ز آئیں بستہ شد گلدستہ شد
نغمہ از ضبطِ صدا پیداستے — ضبط چوں رفت از صدا غوغاستے
در گلوئے ما نفس موجِ ہواست — چوں ہوا پابندِ نے گردد نواست
تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست؟ — زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست؟
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات — بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ او را ریب نے تبدیل نے (۱) (۲) — آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
پختہ تر سودائے خام از زورِ او — در فتد با سنگِ جام از زورِ او
می برد پابند و آزاد آورد — صید بنداں را بفریاد آورد

---

(۱) لَا رَیْبَ فِیْهِ ط (آیہ شریفہ) ۱۲ — (۲) لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمَۃِ اللّٰہ (آیہ شریفہ) ۱۲

نوعِ انساں را پیامِ آخریں — حاملِ او رحمۃً للعالمیںؐ

ارج می گیرد ازو نا ارجمند — بندہ را از سجدہ سازد سربلند

رہزناں از حفظِ او رہبر شدند — از کتابے صاحبِ دفتر شدند

دشت پیمایاں ز تابِ یک چراغ — صد تجلی از علوم اندر دماغ

آنکہ دوشِ کوہ بارش برنتافت (۱) — سطوتِ او زہرۂ گردوں شگافت

بنگر آں سرمایۂ آمالِ ما — گنجد اندر سینۂ اطفالِ ما

آں جگر تابِ بیابانِ کم آب — چشمِ او احمر ز سوزِ آفتاب

خوشتر از آہو رمِ جمازہ اش (۲) — گرم چوں آتش دمِ جمازہ اش

رختِ خواب افگندہ در زیرِ نخیل — صبحدم بیدار از بانگِ رحیل

دشت سیر از بام و در نا آشنا — ہرزہ گردو از حضر نا آشنا

تا دلش از گرمئ قرآں تپید — موجِ بیتابش چو گوہر آرمید

خواند در آیاتِ مبینِ او سبق — بندہ آمد خواجہ رفت از پیشِ حق

از جہانبانی نوازد سازِ او — مسندِ جم گشتِ پا اندازِ او

شہرہا از گردِ پایش ریختند — صد چمن از یک گلش انگیختند

اے گرفتارِ رسومِ ایمانِ تو — شیوہ ہائے کافری زندانِ تو

قطع کردی امرِ خود را در زُبُر (۳) — جادہ پیمائی اِلیٰ شیءٍ نُکُر (۴)

---

(۱) اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ.... الخ (آیہ شریفہ) ۱۲ - (۲) جمازہ: اونٹنی ۱۲

(۳) فَتَقَطَّعُوْا اَمْرَھُمْ بَیْنَھُمْ زُبُرًا (آیہ شریفہ) (۴) یَوْمَ یَدْعُ الدَّاعِ اِلٰی شَیْءٍ نُّکُرٍ (آیہ شریفہ)

گر تو می خواہی مسلماں زیستن | نیست ممکن جز بقرآں زیستن
صوفیِ پشمینہ پوشِ حال مست | از شرابِ نغمۂ قوال مست
آتش از شعرِ عراقی در دلش | در نمی سازد بقرآں محفلش
از کلاہ و بوریا تاج و سریر | فقرِ او از خانقاہاں باج گیر
واعظِ دستاں زن افسانہ بند | معنیٔ او پست و حرفِ او بلند
از خطیب و دیلمی گفتارِ او (۱) | با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ او
از تلاوت بر تو حق دارد کتاب
تو ازو کامے کہ می خواہی بیاب

فصل دوازدہم

تمہید:۔ اس فصل میں اقبال نے یہ نکتہ سمجھایا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم کسی آئین یا ضابطہ کی پابندی کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی (تاریخِ عالم شاہد ہے کہ قومی تنظیم، ضابطہ یا دستور العمل کے بغیر ناممکن ہے۔) لہٰذا ملتِ اسلامیہ کی بقار کے لئے بھی ایک آئین (دستور) درکار ہے۔ اور وہ ضابطہ قرآنِ حکیم ہے۔

اگر قوم آئین کی پابندی چھوڑ دے، تو وہ یقیناً منتشر اور پراگندہ ہو جائے گی۔ اور انتشار جیسا کہ سب جانتے ہیں، قوم کے حق میں پیامِ موت ہے۔ پس

(۱) خطیب او دیلمی اسمائے محدثین۔ ضعیف و شاذ و مرسل، اقسامِ حدیث ۱۲

مسلمان کی قومی ہستی بھی آئین کی پابندی پر موقوف ہے۔ اور یہ آئین بالفاظِ دگر سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے ہیں۔ دین کی رُوح یا اس کا باطنی پہلو ہے۔ اگر مثال درکار ہو، تو پھول کی پتی پر غور کرو۔ جب پتیاں تعاون کی پابندی کرتی ہیں، تو پھول بن جاتی ہیں۔ اور جب بہت سے پھول اسی قانون ارتباط کا اتباع کرتے ہیں، تو گلدستہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ یعنی آئین منتشر اور منفرق اجزاء میں ربط اور آہنگی پیدا کر دیتا ہے۔

اسی طرح آواز اگر قانون موسیقی کی پابند ہو جائے تو نغمہ بن جاتی ہے۔ اور اگر وہی آواز قانون کی پابندی ترک کر دے تو محض شور و غل بن جائے گی۔ جس کی دنیا میں نہ کوئی عزت ہے نہ قیمت۔

ان مثالوں کے بعد اصل مطلب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اے مسلمان! تو جانتا ہے کہ اس دنیا میں تو کس قانون کا پابند ہے۔ اور اس کائنات میں تیری سربلندی کا راز کیا ہے؟

سُن! تیرے آئین کا نام قرآن حکیم ہے جو زندہ کتاب ہے۔ اور اس کی تعلیمات ایسی صداقتوں کی حامل ہیں جو کسی کے مٹائے مٹ نہیں سکتیں، اس لئے زوال اور فنا پاک ہیں، بلکہ ازلی اور ابدی ہیں۔

اقبالؔ نے اس شعر میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ

(ا) قرآنِ حکیم زندہ کتاب ہے۔

(ب) اس کی تعلیمات اٹل ہیں۔

ذیل میں ان دونوں باتوں کی وضاحت کرتا ہوں :۔

قرآنِ حکیم بلاشبہ زندہ کتاب ہے، کیونکہ

(۱) جس زبان میں یہ کتاب نازل ہوئی وہ آجتک زندہ ہے (اور آئندہ بھی زندہ رہے گی) اور اس کے علاوہ جس قدر مذہبی کتابیں دنیا میں موجود ہیں، ان کی زبانیں مردہ ہو چکی ہیں۔ مثلاً

(ا) وید سنسکرت میں ہیں، اور سنسکرت مردہ ہو چکی ہے۔

(ب) دھمپد پالی میں ہے، اور پالی مردہ ہو چکی ہے۔

(ج) انگ بھی پالی میں ہے، جو مردہ ہو چکی ہے۔

(د) اُستا، ژند میں ہے، اور ژند مردہ ہو چکی ہے۔

(ہ) توریت، عبرانی میں ہے، اور عبرانی مردہ ہو چکی ہے۔

(و) زبور، سریانی میں ہے، اور سریانی مردہ ہو چکی ہے۔

(ز) انجیل، یونانی میں ہے، اور یونانی مردہ ہو چکی ہے۔

(۲) صرف قرآنِ حکیم ہی ایسی کتاب ہے جو ہر قسم کی تحریف سے پاک ہے۔ اس کے متن میں نہ تو تحریفِ معنوی ہوئی ہے نہ تحریفِ لفظی، چنانچہ مشہور معاندِ اسلام سر ولیم میور اپنی تالیف سیرت النبیؐ میں لکھتا ہے :۔

"آسمان کے نیچے قرآن ہی ایک ایسی مذہبی کتاب ہے جس کے متن میں بارہ سو سال کی طویل مدت میں کسی قسم کی تحریف نہیں ہوئی ہے"

(۳) دنیا کی مذہبی کتابوں میں قرآن حکیم ہی ایسی کتاب ہے جسے بانی مذہب

(صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود اپنی زندگی میں مدوّن فرما کر اپنی اُمّت کے حوالہ فرمایا۔ یہ شرف یا یہ خصوصیت قرآن کے علاوہ اور کسی مذہبی کتاب کو حاصل نہیں ہے۔

کوئی ہندو یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وید اگنی، وایو، اُدتی اور انگرہ ان چار رشیوں نے (جن پر یہ چار وید نازل ہوئے تھے) خود مرتب کر کے دنیا کو دیئے۔ وہ یہ دعویٰ تو کیا کریں گے، جبکہ وہ ان چاروں کے وجود کا کوئی تاریخی ثبوت تک ہم نہیں پہنچا سکتے۔!

کوئی یہودی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ توریت جو آج ہمارے پاس ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی میں مرتب کر کے قوم کو دی تھی۔ کیونکہ موجودہ توریت تو ایزرا (عزیر) نے اپنی یادداشت سے لکھ کر یہودیوں کو دی تھی۔ اصلی توریت تو ناپید ہو چکی ہے۔

اسی طرح کوئی نصرانی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ عہدِ جدید جنابِ مسیحؑ نے اپنی زندگی میں مدوّن کر کے دنیا کو دیا تھا۔ کیونکہ

(ا) متی کی انجیل متّی نے سنہ ۶۰ء میں خود لکھی تھی۔

(ب) مرقس کی انجیل مرقسؔ نے سنہ ۶۵ء میں خود لکھی تھی۔

(ج) لُوقا کی انجیل لُوقا نے سنہ ۷۲ء میں خود لکھی تھی۔

(د) یُوحنّا کی انجیل یُوحنّا نے سنہ ۹۲ء میں خود لکھی تھی۔

جنابِ مسیحؑ پر جو انجیل نازل ہوئی تھی وہ تو ارامی زبان میں تھی، اور عرصہ دراز سے ناپید ہے۔ اناجیلِ اربعہ کے قدیم نسخے یونانی زبان میں ہیں۔ اور

کوئی نسخہ چوتھی صدی عیسوی سے پہلے کا دنیا میں موجود نہیں ہے۔ یہ یونانی نسخے یقیناً ارامی انجیل کا ترجمہ ہیں۔ تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ ترجمے مستند ہیں۔ جب اصل ہی مفقود ہے، تو نقل کا کیا اعتبار؟

قصہ مختصر کسی مذہب کا کوئی پیرو یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میرے پاس جو میری مذہبی کتاب آج موجود ہے، یہ میرے مذہب کے بانی نے خود مدوّن کر کے دنیا کو دی تھی۔

لیکن ایک مسلمان یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ قرآنِ حکیم جو آج میرے پاس ہے، یہ وہی ہے جسے بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی زندگی میں تمام و کمال مرتب فرما کر دنیا کو دیا۔ چنانچہ مشہور جرمن مستشرق جان کریمر لکھتا ہے:۔

"ہم قرآنِ حکیم کو اُسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مُنھ سے نکلے ہوئے الفاظ کا مجموعہ تسلیم کرتے ہیں جس طرح مسلمان اس کتاب کو خدا کا کلام یقین کرتے ہیں۔"

یعنی مسلمانوں کے پیغمبر نے یہی کتاب دُنیا کے سامنے پیش کی تھی۔

(۴) قرآنِ حکیم ہی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اسے نزول کے وقت سے لے کر تا ایں دم ہر زمانے میں مسلمانوں نے حفظ کر کے اپنے سینوں میں محفوظ رکھا۔

آج اگر تمام مذہبی کتابیں دنیا سے ناپید ہو جائیں تو صرف قرآنِ حکیم ہی وہ کتاب ہے جسے پھر بہ آسانی سینوں سے صحیفوں میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔

(۵) قرآنِ حکیم ہی وہ کتاب ہے جسے ہر زمانہ میں ہر ملک میں ہر شہر میں مسلمان روزانہ اپنی نمازوں میں پڑھتے ہیں۔ دنیا میں کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا جب کہیں نہ کہیں

اس کی تلاوت نہ ہوتی ہو۔ یعنی یہ کتاب ہر وقت وردِ زبان رہتی ہے۔

اب ان امور کی روشنی میں ناظرین خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ قرآنِ حکیم "کتاب زندہ" کی مصداق ہے یا نہیں؟

(ب) دوسری بات اقبالؔ نے یہ کہی ہے کہ اس کی تعلیمات "لا ینال" یعنی اٹل ہیں۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ

(۱) قرآنِ حکیم نہ تو رسوم مذہبی کی کتاب ہے جو حالات کے بدل جانے سے یقیناً بدل جایا کرتے ہیں۔ مثلاً یجر وید۔

(۲) اور نہ قصوں، کہانیوں، داستانوں، روائتوں یا سوانح مشاہیر عالم کی کتاب ہے جو محض عارضی دلچسپی کا سامان بہم پہنچاتے ہیں، اور وہ بھی ادنیٰ درجہ کے لوگوں کے لئے مثلاً پران

(۳) اور نہ جنتر منتر، جادو ٹونے، جھاڑ پھونک کی کتاب ہے جس کا اثر علم کی روشنی سے زائل ہو جائے۔ مثلاً، اتھروید۔

(۴) نہ خلافِ عقل عقائد کی تعلیم دیتی ہے جو عقلا کی طبائع اُس سے متنفر ہو جائیں یا سائنس کے سامنے اُس کا چراغ گل ہو جائے۔

(۵) اور نہ انسان پرستی، آتش پرستی، عناصر پرستی یا بُت پرستی کی تعلیم دیتی ہے جو انسانی رُوح کے خلاف بغاوت کر کے اس کا خاتمہ کر دے۔ بلکہ اصولوں کی کتاب ہے، اُن اصولوں کی جو صداقت پر مبنی ہیں۔ اور اس لئے وہ ہر زمانہ میں زندہ بھی رہیں گے اور کارآمد بھی۔

(۶) قرآنِ مجید اصولوں کی کتاب ہے۔

(ب) وہ اصول صداقت پر مبنی ہیں۔

(ج) صداقت مٹ نہیں سکتی۔

(د) اس لئے قرآنی تعلیمات بھی اٹل ہیں۔

اگر میں اس دعویٰ کو ثابت کروں (الحمدللہ، ایسا کرسکتا ہوں) تو یہ کتاب رموزِ بیخودی کی شرح کے بجائے حقائق قرآن پر ایک مستقل کتاب بن جائے گی۔ اس لئے میں نمونتاً چند آیات پر اکتفا کرتا ہوں:

(۱) لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ الْحَيٰوةِ۔

تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے۔

(۲) لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔

انسان کو وہی ملے گا جس کے لئے وہ کوشش کرے گا۔

(۳) لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰى۔

کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔

(۴) لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا۔

اگر زمین و آسمان میں اللہ کے علاوہ دوسرے خدا بھی ہوتے، تو یقیناً دونوں میں فساد رونما ہو جاتا۔

(۵) مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى۔

جو اس دنیا میں اندھا ہے، وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا۔

(۶) اِمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ۔

جو شئے بنی آدم کے لئے مفید ہے وہ زمین میں باقی رہتی ہے۔

(۷) وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ؟

اور ہماری ہستی کی نشانیاں خود تمہارے اندر موجود ہیں۔ پس تم غور کیوں نہیں کرتے ؟

(۸) لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ۔

دین (اسلام) کے قبول کرنے میں کسی پر کوئی جبر نہیں کیا جا سکتا۔

(۹) وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْہِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ،

اور ہم نے لوہا نازل کیا ہے۔ جس میں بہت شدت ہے۔ یعنی ہیبت ہے۔ اور لوگوں کے فوائد بھی ہیں۔

(۱۰) اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ ھَلُوْعًا۔

بیشک انسان بہت بے صبر پیدا ہوا ہے۔

(۱۱) فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْکُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِہٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ؟

اس سے یعنی دعویٰ نبوت سے پہلے بھی تو میں اپنی عمر کے ایک بڑے حصہ تک تم میں رہ چکا ہوں۔ پس کیا تم نہیں سمجھ سکتے ؟

(۱۲) اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُکِبًّا عَلٰی وَجْھِہٖٓ اَھْدٰٓی اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ؟

جو شخص منہ کے بل گرتا ہوا چل رہا ہو، وہ منزلِ مقصود پر زیادہ پہنچنے والا ہوگا، یا وہ شخص جو سیدھے راستہ پر جا رہا ہے ؟

(۱۳) ھَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ ؟

کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں ؟

(۱۴) هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ط

اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو۔

(۱۵) اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔

دولت اور اولاد یہ دونوں چیزیں صرف اس دنیا کی زندگی کی زینت ہیں۔

(دیگر صحیح)

(۱۶) مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط

حضرت محمد مصطفےٰ ؐ نہیں ہیں مگر رسول اور بلاشبہ آپ ؐ سے پہلے بھی بہت سے رسول مبعوث ہو چکے ہیں۔

(۱۷) اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا۔

بادشاہوں کا دستور ہے کہ جب کسی شہر میں مخالفانہ طور پر داخل ہوتے ہیں تو اُسے برباد کر دیتے ہیں۔

(۱۸) ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ؟

کیا متفرق (بہت سے) آقا بہتر ہیں یا ایک زبردست طاقت رکھنے والا اللہ؟

(۱۹) اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ط

بیشک نفسِ امّارہ تو انسان کو برائی کا حکم دیتا ہے مگر یہ کہ میرا رب رحم فرمائے۔

(۲۰) اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ط اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ط ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔

نہیں ہے حکومت مگر صرف اللہ کے لئے۔ اُس نے حکم دیا ہے کہ اُس کے

سوا اور کسی کی عبادت (اطاعت) مت کرو۔ یہی ہے ہمیشہ قائم رہنے والا دین۔

یہ بیس آیات میں نے محض اپنے حافظہ کی مدد سے درج کر دی ہیں۔ اگر قرآن حکیم کا استقصائے کلی کیا جائے تو اُن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہو سکتی ہے۔ لیکن میرے دعویٰ کے اثبات کے لئے یہ بیس آیات بھی کافی ہیں۔

اب میں عقلمندوں سے خواہ وہ ہندو ہوں یا عیسائی، یہ دریافت کرتا ہوں کہ کیا کوئی شخص ان آیتوں کی تردید یا تکذیب یا تغلیط کر سکتا ہے؟

مثلاً قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا۔ (یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے اور قرآنِ حکیم کلیات ہی کی کتاب ہے) تو کیا کوئی شخص یہ ثابت کر سکتا ہے کہ خالد کے جسم پر مالش کرنے سے طارق کے جسم کا درد دُور ہو سکتا ہے؟ یا حسن کو دوا پلانے سے حسین کے مرض کا ازالہ ہو سکتا ہے؟ یا زید کے جرم میں بکر کو ماخوذ کیا جا سکتا ہے؟

قرآنِ مجید کی تعلیمات کا لبِّ لباب یہ ہے کہ

(۱) اللہ تعالیٰ اس کائنات کا خالق، رازق اور مالک ہے۔

(۲) اس لئے اس کے سوا کسی غیر کو اس کائنات پر حکمرانی کا حق حاصل نہیں ہے۔

(۳) پس ہر انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرے، اور اس کے سوا کسی کی اطاعت (عبادت) نہ کرے۔

(۴) بس یہی "دین القیم" یعنی ہمیشہ باقی اور قائم رہنے والا دین ہے۔

اب صاحبانِ عقل خود انصاف کریں کہ کیا وہ دین جو مذکورہ بالا تین

صداقتوں کی تعلیم دے، دنیا سے مٹ سکتا ہے؟ اسی لئے قرآنِ حکیم نے اس دین کو "دین القیم" سے تعبیر کیا ہے۔ اور کوئی شخص جب تک ہوش و خرد سے بالکل عاری نہ ہو جائے، اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ واقعی دین القیم کی یہی صحیح تعریف ہے۔

چونکہ قرآنِ حکیم، دین القیم کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اس لئے اقبال نے بجا طور پر یہ بات لکھی کہ:۔

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ اولا یزال است و قدیم

بلاشبہ قرآنِ حکیم زندہ کتاب ہے اور اس کی تعلیم کبھی دنیا سے فنا نہیں ہو سکتی۔

کہتے ہیں کہ اس کتاب کے مطالعہ سے انسان پر یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات پر زندگی کیوں پیدا کی؟

یہ اشارہ ہے تخلیقِ آدمؑ کی طرف کہ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہوا کہ اس کائنات میں ایک ہستی ایسی ہو جو اس کی نیابت کا فریضہ انجام دے سکے۔ پس اُس نے دُنیا میں زندگی کا آغاز کیا۔

واضح ہو کہ بقول سرجیمس جینز اس کرہ ارض کی ابتدائی حالت کا تقاضا ہرگز یہ نہ تھا کہ یہاں حیات موجود ہو سکے۔ لاکھوں برس تک تو ہماری یہ زمین سراپا آتش رہی۔ پھر لاکھوں برس کے بعد برودت کا عنصر پیدا ہوا۔ بہرحال جب یہ زمین ٹھنڈی ہو گئی تو سوال یہ ہے کہ حیات کہاں سے آگئی؟ زندگی

کیسے ظاہر ہو گئی؟ کوئی سائنسداں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ بلکہ حیات سے پہلے ایک اور سوال ہے وہ یہ کہ ہستی کیوں ہوئی؟ کوئی سائنسداں یا فلسفی اس بنیادی سوال کا جواب بھی نہیں دے سکتا۔[1]

قرآنِ حکیم نے اس بنیادی سوال کا جواب دیا ہے کہ

(۲) ہستی اس لئے ظاہر ہوئی یا یہ کائنات اس لئے موجود ہوئی، کہ واجب الوجود ہستی موجود ہے جس نے اسے خلعتِ وجود عطا فرمایا۔

(ب) زندگی اس لئے ظاہر ہوئی کہ اُس خدائے علیم وقدیر نے آدم کو اپنا خلیفہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ اور یہی ہے سِرِّ تکوینِ حیات۔

چوتھی صفت اس کتاب کی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یا قوم اس کی تعلیمات پر عمل کرے تو اس میں رنگِ شباب پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ مصرع بہت بلیغ اور وسیع المعانی ہے۔ یعنی

(۱) یعنی گمنام قوم، قعرِ مذلت و گمنامی سے نکل کر دنیا میں سرداری حاصل کر سکتی ہے۔

(۲) کمزور قوم اس کی بدولت طاقتور ہو سکتی ہے۔

بنیادی تصور یہ ہے کہ قرآن بذاتِ خود قوت اور طاقت کا سرچشمہ ہے۔ اس لئے جو قوم اس کو اپنا دستور العمل بنائے گی، وہ صنعتِ ثبات سے متصف

---

[1] صدیوں فلاسفی کی چنان و چنیں رہی
لیکن خدا کی ذات جہاں تھی وہیں رہی

ہو جائے گی۔

ع ہر چیز کہ در کانِ نمک رفت نمک شد

پانچویں صفت اس کتاب کی یہ ہے کہ

(ا) اِس میں ریب نہیں ہے

(ب) اس کے احکام تبدیلی (تغیر) سے پاک ہیں۔

(ج) اس میں تاویل کی حاجت نہیں ہے۔

پہلی صفت اس آیت سے ماخوذ ہے۔

لَا رَیْبَ فِیْهِ۔

اِس لَا کو لائے نفی جنس کہتے ہیں یعنی اس کے بعد جو لفظ آئے گا، وہ جنس پر دلالت کرے گا۔ اور یہ "لَا" اس جنس کی کسی صفت کے منفی ہونے پر دلالت کرے گا۔

رَیْب۔ یہ لفظ رَابَ، یَرِیْبُ کا مصدر ہے لغوی معنی ہیں قلق اور بیچینی میں ڈالنا۔ چونکہ شک یا شبہ بھی انسان کو بیچین کرتا ہے اس لئے رَیْب کو شک کے معنی میں استعمال کرنے لگے۔

لَا رَیْبَ فِیْهِ کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں کسی ایسی چیز کا وجود ہی نہیں ہے، اور کوئی ایسی تعلیم سرے سے موجود نہیں ہے، جو سننے یا پڑھنے والے کو تذبذب یا شک میں مبتلا کردے۔

دوسری بات کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو قوانین اس کتاب میں واضح فرما دیئے ہیں۔ ان میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر ایسا

ہوتو پھر امن اُٹھ جائے گا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے یہ قانون مقرر فرمادیا ہے کہ:۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ ۔

تحقیق اللہ کسی قوم کی حالت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا جبتک اس قوم کے افراد پہلے خود اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کرلیں۔

لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمَاتِ اللّٰہِ کا مطلب یہ ہے کہ اس قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔ اسی طرح قرآن مجید میں جس قدر قوانین بیان کئے گئے ہیں سب اٹل ہیں۔ کسی وقت، کسی قوم کے لئے ان میں تبدیلی نہیں ہوگی۔

تیسری بات کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کی آیات کا مطلب بیان کرنے میں کھینچ تان کی حاجت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا دعویٰ ہے کہ

لَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ

ہم نے اس قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے (سب لوگوں کے لئے) آسان کردیا ہے۔ یعنی ہر شخص تاویل کے بغیر اس سے نصیحت (کامیابی کا طریقہ) حاصل کرسکتا ہے۔

قرآنِ مجید کی چھٹی صفت یہ ہے کہ وہ بنی آدم کو ہر قسم کی غلامی سے آزادی عطا کرتا ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت قبل ازیں کرچکا ہوں، اس لئے اعادہ کی حاجت نہیں ہے۔

ساتویں صفت یہ ہے کہ یہ نوعِ انسانی کے لئے "پیامِ آخریں" ہے۔ اور چونکہ آخری پیغام ہے اس لئے کامل بھی ہے اور ساری دُنیا کے لئے ہے۔ اور چونکہ ساری دُنیا کے لئے ہے، اسی لئے حاملِ قرآن یعنی سرکارِ مدینہ صلی اللہ

علیہ وسلم رحمتہ للعالمین یعنی ساری دُنیا کے لئے رحمت ہیں۔

یہ شعر اس آیت سے ماخوذ ہے:۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔

آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا۔ اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی۔ (یعنی ہدایت مکمل طور پر نازل کر دی) ۔ اور میں اس بات سے راضی ہوں کہ تمہارا دین اسلام ہو۔ یعنی اگر تم اسلام کو اپنا دین (دستورِ حیات) بناؤ گے تو میں تم سے راضی ہو جاؤں گا۔ (اور اللہ کو راضی کرنا ہی مقصودِ حیات ہے۔)

قرآنِ حکیم کی چند خصوصیات واضح کرنے کے بعد اقبالؔ اس کی تعلیمات کے ثمرات کا بیان کرتے ہیں کہ

ع رہزناں از حفظِ او رہبر شدند الخ

یعنی ظہورِ اسلام سے پہلے عرب کے باشندے لوٹ مار، قتل وغارت اور قزاقی میں عمریں بسر کر دیتے تھے۔ اور یہ باتیں ان کا مشغلۂ حیات تھیں۔ لیکن اس زندہ کتاب نے ان کے اندر حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا۔ جو لوگ راہزن تھے وہ راہبر بن گئے۔ اور جو لوگ جاہلِ مطلق تھے، وہ علوم وفنون کے علمبردار بن گئے۔ اور ان کے دل ودماغ دنیا کے علوم سے منوّر ہو گئے۔ اور انہوں نے ساری دنیا کو اپنے نور سے منوّر کر دیا۔

کہتے ہیں کہ قرآنِ حکیم کی شوکت وعظمت وسطوت کا کچھ اندازہ اس بات

سے ہو سکتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے:۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ

اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل فرماتے تو (اے مخاطب) وہ بھی اللہ کی جلالتِ شان کے تصور سے یا اس کی ہیبت سے دب جاتا (بلکہ) پھٹ جاتا۔

لیکن اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا فضل و کرم ہے کہ یہی قرآنِ حکیم جو ہمارا سرمایۂ ناز ہے یعنی ہماری تمام اُمیدوں کا مرکز ہے، یہی زندہ کتاب ہماری قوم کے اطفال کے سینوں میں سما جاتی ہے۔ یعنی جس کا تحمل پہاڑوں سے نہیں ہو سکتا، بچوں کے سینے اس کے متحمل ہو جاتے ہیں۔

پھر کہتے ہیں کہ اس قرآنِ حکیم نے عربوں کی زندگی میں ایسا انقلاب[1] پیدا کر دیا کہ چشمِ فلک نے آج تک اس کی نظیر نہیں دیکھی، اس انقلاب کا

---

[1] یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مشہور اشتراکی لیڈر مسٹر ایم۔ این۔ رائے نے اپنی پُر مغز کتاب بعنوان "اسلام کا تاریخی کارنامہ" میں لکھا ہے کہ:۔

"تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بڑا انقلاب آفریں انسان ابھی تک دنیا میں پیدا نہیں ہوا ہے۔"

لیکن کس قدر عبرتناک بات ہے کہ آج مسلمانوں سے زیادہ جامد قوم دنیا کے پردہ پر موجود نہیں ہے۔ ۱۲

ادنیٰ کرشمہ یہ ہے کہ

ع مسندِ جم گشت پا اندازِ او

اور مسلمان جس جنگل میں جا کر خیمہ زن ہوئے اُسے گلشن بنا دیا۔ جس صحرا پر ان کی ایک نگاہ پڑگئی وہ شہر میں تبدیل ہو گیا۔

لیکن جب مسلمانوں نے قرآنِ حکیم سے اپنا تعلق منقطع کر لیا، اور روایات و کرامات کی دنیا میں سکونت اختیار کر لی، تو وہ اِن آیات کا مصداق ہو گئے:۔

فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا (۲۳ : ۵۴)

(ہم نے سارے رسولوں کو ایک ہی تعلیم دے کر بھیجا اور ان کو مطلع کر دیا کہ تمہارا سب کا طریقہ ایک ہی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ میں تمہارا رب ہوں، اس لئے میری اطاعت کرو۔)

لیکن ان رسولوں کے متبعین نے اپنے دین میں اپنا طریق الگ الگ کر کے اختلاف پیدا کر دیا۔

اس تشتّت اور افتراق کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہے، اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ۔ (۵۴/۶)

(چونکہ یہ لوگ قرآنِ حکیم کی طرف سے غافل ہیں) اس لئے آپ اُن کی طرف سے کچھ خیال نہ کیجئے۔ جس دن ایک بلانے والا (فرشتہ) اِن لوگوں کو (جنہوں نے دین میں فرقہ بندی کی بنیاد رکھی)

ایک ناگوار شئے (جہنم[لہ]) کی طرف بلائے گا۔

آخر میں اقبالؔ مسلمان کو اس حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں کہ اگر تو ہندو (مشرک) یا انگریز کی حیثیت سے زندگی بسر کرنی چاہتا ہے، تو شوق سے شخصیت پرستی، آثار پرستی، تابوت پرستی، دلدل پرستی، قبر پرستی، اور روایات پرستی میں مستغرق رہ یا شوق سے دولتِ مشترکہ کے دامن سے وابستہ رہ۔ لیکن اگر تو مسلمان کی حیثیت سے اس دنیا میں زندہ رہنے کا آرزو مند ہو تو پھر اس کی تو ایک ہی صورت ہے، اور وہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کو اپنا رہنما اور دستورِ حیات بنا لے۔ اور اس دستور میں نہ کسی قسم کی کمی روا رکھ نہ بیشی۔ یہ مطلب ہے "حَسبُنا کتاب اللہ" کا۔ بالفاظِ دگر صرف قرآن کو اپنا ہادی اور پیشوا بنا۔ بقول اکبر الٰہ آبادی:۔

مغوی تو ملیں گے تمہیں شیطان سے بہتر
ہادی نہ ملے گا کوئی قرآن سے بہتر

اگر صحابہ اکرام رضؓ دن کو امام باڑوں میں جا کر مرثیے سنتے اور رات کو خانقاہوں میں بیٹھ کر قوالی سے لطف اندوز ہوتے، تو پھر ہر گز مسندِ جم کو پا انداز نہیں بنا سکتے تھے۔ بلکہ مسلمان ہونے کے باوجود اسی طرح قیصر و کسریٰ کے غلام ہوتے جس طرح ہم مسلمان ہونے کے باوجود برطانیہ اور امریکہ کے غلام ہیں۔

نوٹ:۔ لہ ہندوستان کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ مسلمان قوم ۱۷۰۷ء سے اسی دنیا میں جہنم کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ ۱۲

ہماری حالت کیا ہے؟ اس کا تذکرہ اقبال کی زبان سے سنیئے :-

(۱) صوفی پشمینہ پوش تو درگاہوں میں قوالی سن رہا ہے اور عراقی کے اشعار سے اپنے دل کو گرما رہا ہے۔ اس کی محفل میں ہر شئے کا گذر ہو سکتا ہے۔ لیکن قرآن حکیم کا نام سننے کے لیے کان ترستے رہتے ہیں۔

(۲) ہمارے واعظین کی حالت یہ ہے کہ اُن کے مواعظ باعتبار الفاظ تو بہت شاندار ہوتے ہیں، لیکن معنویت کے لحاظ سے بہت پست ہوتے ہیں وہ اپنی تقریروں میں خطیب اور دیلمی اور دوسرے محدثین کے حوالے تو بہت دیتے ہیں لیکن قرآنِ حکیم کی آیات سے بہت کم استشہاد کرتے ہیں۔ نیز وہ احادیث کی تحقیق میں تو بہت وقت صرف کرتے ہیں لیکن قرآنِ حکیم کا مطالعہ بہت کم کرتے ہیں۔

نوٹ :- ضعیف، شاذ اور مرسل، فنِ حدیث کی مشہور اصطلاحات ہیں۔

(۱) ضعیف حدیث اُسے کہتے ہیں جس کا کوئی راوی مجروح ہو یعنی کسی اعتبار سے اس کے ثقہ ہونے میں شک ہو۔

(۲) شاذ حدیث وہ ہے جو ثقات کی روایت کے خلاف ہو۔

لہ مقامِ مسرت ہے کہ اب اقبال کا کلام بھی قوالی کے لئے بہت موزوں ثابت ہو رہا ہے۔ بلکہ شاہدانِ بازاری بھی اس سے گرمئ محفل کا سامان مہیا کر رہی ہیں۔ ۱۲

(۴) مرسل حدیث وہ ہے جس کی سند کا آخری حصہ ساقط ہو۔

آخر میں مسلمانوں کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ قرآنِ حکیم کی تلاوت کرو۔ کیونکہ اگر تم اسلام کے مدعی ہو تو پھر اس کی تلاوت کرنا تمہارا فرضِ منصبی ہے۔ تم اس کے مطالعے سے اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں کامیابی حاصل کر سکو گے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کامیابی کے لئے جن قوانین اور اصولوں کی ضرورت ہے وہ سب اس کتاب میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اسی لئے یہ کتاب ہر حال میں تمہاری رہنمائی کر سکتی ہے۔

در معنئ این کہ در زمانۂ انحطاط تقلید از اجتہاد

زمانۂ انحطاط میں اتباعِ سلف، اجتہاد سے اولیٰ تر ہے

اولیٰ تر است

عہدِ حاضر فتنہ ہا زیرِ سر است — طبعِ ناپروائے او آفت گر است
بزمِ اقوامِ کہن برہم ازو — شاخسارِ زندگی بے نم ازو
جلوہ اش ما را ز ما بیگانہ کرد — سازِ ما را از نوا بیگانہ کرد
از دلِ ما آتشِ دیرینہ بُرد — نور و نارِ لاالٰہ از سینہ بُرد
مضمحل گردد چو تقویمِ حیات — ملّت از تقلید می گیرد ثبات
راہِ آبا رو کہ این جمعیت است — معنئ تقلید ضبطِ ملّت است
در خزاں اے بے نصیب از برگ و بار — از شجر مگسل بامیدِ بہار
بحر گم کردی زیاں اندیش باش — حافظِ جوئے کم آبِ خویش باش
شاید از سیلِ قہستاں برخوری — باز در آغوشِ طوفاں پروری
پیکرت دارد اگر جانِ بصیر — عبرت از احوالِ اسرائیل گیر
گرم و سردِ روزگارِ او نگر — سختئ جانِ نزارِ او نگر
خوں گراں سیر است در رگہائے او — سنگِ صد دہلیز یک سیمائے او

پنجهٔ گردوں چو انگورش فشرد یادگارِ موسیٰؑ و هاروںؑ نمرد
از نوائے آتشینش رفت سوز لیکن اندر سینه دم دارد هنوز
زانکه چوں جمعیتش از هم شکست جز براهِ رفتگاں محمل نه بست
اے پریشاں محفلِ دیرینه ات مُرد شمعِ زندگی در سینه ات
نقش بر دل معنیٔ توحید کن چارهٔ کارِ خود از تقلید کن
اجتهاد اندر زمانِ انحطاط قوم را برهم همی پیچد بساط
ز اجتهادِ عالمانِ کم نظر اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر
عقلِ آبایت هوس فرسوده نیست کارِ پاکاں از غرض آلوده نیست
فکرِ شاں ریسد همے باریک تر ورعِ شاں با مصطفےٰؐ نزدیک تر
ذوقِ جعفرؒ کاوشِ رازیؒ نماند آبروئے ملتِ تازی نماند
تنگ بر ما رهگذارِ دیں شد است هر لئیمے رازدارِ دیں شد است
اے که از اسرارِ دیں بیگانهٔ با یک آئیں ساز اگر فرزانهٔ
من شنیدستم ز نباضِ حیات اختلافِ تست مقراضِ حیات
از یک آئینی مسلماں زنده است پیکرِ ملت ز قرآں زنده است
ما همه خاک و دلِ آگاه اوست اعتصامش کن که حبل الله اوست

چوں گهر در رشتهٔ او سفته شو
ورنه مانندِ غبار آشفته شو

(فصل سیزدہم)

تمہید:۔ اس فصل میں اقبال نے اس حقیقت کو ذہن نشین کیا ہے کہ اگر کسی زمانہ میں ملتِ اسلامیہ علمی اور دینی اعتبار سے رو بانحطاط ہو جائے، تو اس وقت اجتہاد کرنے سے تقلید کرنا زیادہ مناسب بلکہ زیادہ محفوظ طریقہ ہے۔ یہ شعر اس ساری فصل کی رُوح ہے:۔

مز اجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

یعنی کوتاہ بیں اور کم سواد علماء کے اجتہاد پر عمل کرنے سے یہ بہتر ہے کہ سلفِ صالحین کا اتباع کیا جائے۔

اس فصل میں تین لفظ تشریح طلب ہیں:۔

زمانۂ انحطاط ۔ تقلید ۔ اجتہاد ۔

(۱) زمانۂ انحطاط سے وہ زمانہ یا ایسا زمانہ مُراد ہے جب دینی علوم میں گہری نظر رکھنے والے علماء ناپید ہو جائیں۔

(۲) اجتہاد:۔ دینی رُوح سے پُوری واقفیت اور شریعت کی مزاج شناسی اور علوم و فنون میں بصیرت حاصل کرنے کے بعد قرآن و حدیث میں اس کے صحیح منشاء کو معلوم کرنے کے لئے اپنی ذہنی کوششوں کو وقف کر دینا۔

(۳) تقلید:۔ کسی پیش رو، مجتہد مطلق کی بات پر اس لئے اعتماد کر لینا کہ وہ دینی رُوح اور شریعت کے مزاج اور قرآن و حدیث میں فہم و بصیرت کے

اعتبار سے درجہ استناد پا چکا ہے اور لائقِ اعتماد ہو گیا ہے۔

اس تمہید کے بعد اب میں اس فصل کا مطلب بیان کرتا ہوں۔

کہتے ہیں کہ عہدِ حاضر (موجودہ دور) مسلمانوں کے حق میں مختلف قسم کے فتنوں سے معمور ہے۔ اس عہد کی خصوصیات حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) اس عہد نے مسلمانوں کی طبائع میں دین کی طرف سے لاپرواہی اور بے اعتنائی کا رنگ پیدا کر دیا ہے۔

(۲) اِن کے دلوں میں اپنے اسلاف کی تحقیر کا مادہ پیدا کر دیا ہے۔

(۳) دینی زندگی کے سرچشموں کو خشک کر دیا ہے۔

(۴) مسلمانوں کو ان کے دین سے بیگانہ کر دیا ہے۔

(۵) ان کے دلوں کو عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبہ سے خالی کر دیا ہے۔

(۶) توحید کا مفہوم (نور و نار) ان کے دماغوں سے خارج کر دیا ہے۔

نور سے مراد ہے وہ روشنی یا بصیرت جو توحید سے پیدا ہوتی ہے۔ نار سے مراد ہے وہ جوش اور ولولہ جو اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ ہے۔

اقبالؔ نے اس کتاب میں یہ کہا ہے:۔

ع جلوہ اتشش مارا زما بیگانہ کرد

یعنی تہذیبِ حاضر نے ہم کو ہم سے بیگانہ کر دیا۔

اسی خیال کو انہوں نے دوسری جگہ یوں ادا کیا ہے:۔

عصرِ ما، ما را، ز ما بیگانہ کرد
از جمالِ مصطفیٰؐ بیگانہ کرد[1]

عہدِ حاضر، عصرِ حاضر، تہذیبِ حاضر، یہ سب ایک ہی معنیٰ کی مختلف تعبیریں ہیں یعنی مغربی علوم و فنون جن کی بنیاد مادیت اور الحاد پر ہے۔

اگر ان اصطلاحات کے مفہوم کو مدِّ نظر رکھا جائے، تو اقبالؔ کے ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ انگریزی تعلیم نے جو سراسر انکارِ خدا پر مبنی ہے، ہم مسلمانوں کو دینِ اسلام، عشقِ رسولؐ، رمزِ توحید اور روایاتِ ملّی چاروں نعماء سے محروم کر دیا۔

اس تصریح سے ثابت ہوا کہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی ساری خرابیوں کی جڑ وہ مغربی نظام و نصابِ تعلیم ہے، جو ہمارے کالجوں اور اسکولوں میں رائج ہے۔

اکبرؔ الٰہ آبادی نے اسی حقیقت کو یوں واضح کیا ہے:۔

یوں قتل سے بچّوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

عہدِ حاضر کے مقاصد واضح کرنے کے بعد اقبالؔ یہ کہتے ہیں کہ اگر کسی وجہ سے تقویمِ حیات مضمحل ہو جائے تو ایسی حالت میں قوم کو تقلید کا اصول اختیار

---

[1] مغربی تعلیم کی بدولت ہم اپنے آپ سے بیگانہ ہو گئے۔ اور اسی کا نتیجہ اپنے آقاؐ سے بیگانگی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ۱۲

کر لینا چاہیئے۔ کیونکہ اس کی بدولت، رنگِ ثبات پیدا ہو سکتا ہے۔ یعنی اگر قومی زندگی کا نظام (تقویم) کمزور ہو جائے، تو قوم کو سلف صالحین کا اتباع کرنا لازمی ہے۔ تاکہ وہ نظام درہم برہم ہونے سے محفوظ رہ سکے۔ اگر قوم ایسا نہیں کرے گی تو قومی نظام فنا ہو جائے گا۔

اے مسلمان! تو دیکھ رہا ہے کہ مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم تجھ کو دین سے بیگانہ کرتی جارہی ہے۔ تو روز بروز اپنے مرکز سے دور ہوتا جارہا ہے۔ اس لیئے مارکس اور لینن کے راستہ پر مت چل بلکہ اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چل۔ کیونکہ جمعیت یہی ہے۔ اس کے سوا ہر راہ، راہِ انتشار ہے۔

تقلید (اتباعِ سلف) کے معنی ہی ضبطِ ملّت کے ہیں۔ یعنی تقلید سے ملّت میں نظم اور انضباط کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ اس قوم پر خزاں کی کیفیت طاری ہے۔ پس مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ بہار کی امید پر اپنی قومی روایات (شجر) سے وابستہ اور ان کی حفاظت پر کمر بستہ رہیں۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کی زندگی سے استشہاد کرتے ہیں کہ اگر تمہیں مثال درکار ہو تو یہودیوں کو دیکھ لو۔ آسمان نے ان پر بے اندازہ ظلم و ستم کیئے۔ لیکن وہ موسیٰؑ اور ہارونؑ کی اس یادگار کو دنیا سے نہ مٹا سکا۔ اس قوم کے افراد میں سوز باقی نہیں رہا ہے لیکن سینہ میں دم ہنوز باقی ہے۔ یعنی پریشان حال ہے۔ لیکن فنا نہیں ہوئی۔

اے مسلمان! تیری محفلِ دیرینہ بھی پریشان ہو چکی ہے، بلکہ تیرے سینہ میں تو

زندگی کی شمع بھی گل ہوچکی ہے۔ اس لیئے تو توحید کا مفہوم اپنے دل پر نقش کرلے اور تقلید کی مدد سے اپنے نقائص کا مداوا کر۔

یاد رکھ! دورِ انحطاط میں اجتہاد کا دروازہ کھولنے سے قومی زندگی کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اس لیئے میرا مشورہ یہ ہے کہ کم نظر، کم سواد اور کوتاہ بیں علماء کے اجتہاد سے سلفِ صالحین کی تقلید ہزار درجہ بہتر ہے۔ بلکہ محفوظ تر ہے۔ یعنی اس تقلید کی بدولت قوم گمراہی سے محفوظ رہے گی۔

یہ سچ ہے کہ قوم ترقی نہیں کر سکے گی۔ لیکن جمود، گمراہی سے بہر حال بہتر ہے۔

اے مسلمان! میں اس زمانہ میں اس دورِ پُر فتن میں تجھے تقلید کا مشورہ اس لیئے دے رہا ہوں کہ تیرے اسلاف (آباء) کو امارت اور سرداری کی ہوس نہیں تھی۔ وہ حضرات پاک طینت تھے، اُن کا تقویٰ سرکارِ دوعالم صلعم کے تقویٰ سے ہمارے مقابلہ میں نزدیک تر تھا۔ وہ ہم سے بہت زیادہ مخلص اور خدا ترس تھے۔ ہم سے زیادہ اسرارِ شریعت کو سمجھنے والے تھے۔

لیکن آج حالت یہ ہوگئی ہے کہ نہ تو قوم میں کوئی شخص امام جعفر صادق رح جیسا دینی ذوق رکھتا ہے، اور نہ کسی شخص میں امام رازی رح کی عقلی کاوش نظر آتی ہے بر عکس ایں، آج ہر جاہل اجتہاد کا مدعی ہے۔ اور ہر لئیم، حکیم بنا ہوا ہے۔ بقول حالیؔ، ؎

مل گئی جس کو گانٹھ ہلدی کی
اُس نے سمجھا کہ میں ہوں پنساری

اے مسلمان! تو دین کے اسرار و رموز سے بیگانہ ہو چکا ہے اس لیئے

میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ اگر تجھ میں عقل ہے تو ایسی کوشش کر، کہ ساری قوم ایک ہی آئین کی پابند ہو جائے۔ کیونکہ میں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پڑھی ہے کہ جو قوم اختلاف کی لعنت میں گرفتار ہو جاتی ہے، وہ انجام کار صفحہ ہستی سے نابود ہو جاتی ہے یعنی اختلاف منقرض جاتا ہے۔

مسلمانوں کو یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ وہ آئین کونسا ہے جس پر انھیں متفق اور متحد ہونا چاہیے۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ مسلمان اسی صورت میں زندہ رہ سکتے ہیں، جب وہ صرف ایک آئین کی اتباع کریں اور وہ آئین قرآنِ حکیم ہے۔ ہم سب تاریکی میں ہیں اور قرآنِ حکیم دنیا میں شمع فروزاں ہے۔ اور آفتابِ درخشاں (دل آگاہ) ہے۔ پس ہمیں چاہیے کہ ہم سب اللہ تعالیٰ کی اس رسّی کو مضبوطی سے تھام لیں۔ یہ رسّی بقول مرشدی شیخ الہند چھوٹ تو سکتی ہے مگر ٹوٹ نہیں سکتی۔

اے مسلمان! اگر تو قرآنِ حکیم سے اپنا تعلق استوار نہیں کرے گا، تو یاد رکھ کہ تو اس دنیا میں غبار کی طرح آشفتہ ہو جائے گا۔

نوٹ:۔ ؏ ذوقِ جعفر کاوشِ رازی نماند

اس مصرع میں اقبال نے امام جعفر اور امام رازی دو بزرگوں کا ذکر کیا ہے۔ اور اول الذکر کے ساتھ ذوق اور آخر الذکر کے ساتھ کاوش کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امام جعفر کو علمِ دین سے فطری لگاؤ تھا۔ وہ خاندانِ نبوت سے قریبی تعلق رکھنے کے باوجود ایسے زمانہ میں تھے جبکہ بہت سے تابعین جو دین کی مجسم تصویر تھے، زندہ تھے۔

امام رازیؒ کے لیے کاوش کا لفظ اس لیے لائے ہیں کہ انھوں نے تحصیلِ علومِ دینی میں اپنی انتہائی کوشش صرف کر دی۔

امام جعفر صادق اور امام رازی کے سوانح حیات

نوٹ:۔ (۱) امام جعفرؒ امام زین العابدینؒ کے پوتے ہیں، اور وہ حضرت علیؓ کے پوتے ہیں۔ امام جعفر کی کنیت ابو عبداللہ تھی اور لقب صادق تھا۔ ان کی ولادت مدینہ منورہ میں ۱۷ ربیع الاول سنہ ۸۳ھ کو ہوئی۔ اپنے زمانہ میں علم و فضل اور اخلاقِ حسنہ دونوں کے اعتبار سے نہایت بلند مقام رکھتے تھے تمام تذکرہ نویس متفق ہیں کہ وہ علم حاصل کرنے کے بہت شائق تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نقلی اور عقلی علوم کے علاوہ ان کو مخفی علوم مثلاً علم الحروف، علم الجفر، علم الکیمیا، علم النجوم، علم الرّمل میں بھی مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ بلاشبہ ان کی ذات مخزنِ علوم و فنون تھی۔ اسی لیے ابو جعفر منصور عبّاسی نے کئی مرتبہ بڑی عزت کے ساتھ ان کو بغداد طلب کیا تھا۔ تاکہ علمی استفادہ کر سکے۔ سنہ ۱۴۸ھ میں وفات پائی۔

(۲) امام رازیؒ کا نام محمد تھا۔ کنیت ابو الفضل اور لقب فخر الدین۔ امام صاحب سنہ ۵۴۴ھ میں بمقام رے (خراساں) میں پیدا ہوئے۔ اسی نسبت سے رازی ہیں۔ سنہ ۶۰۶ھ میں بعمر ۶۳ سال رحلت فرمائی۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی ذات میں علم، دولت، عزت اور شہرت، چاروں باتیں جمع کر دی تھیں۔ اور یہ اجتماع النّادر کالمعدوم کا مصداق ہے۔ انہوں

نے مختلف علوم و فنون میں ۸۰ سے اوپر کتابیں تصنیف کیں، جن میں حسبِ ذیل کو بقائے دوام حاصل ہو گئی ہے۔

(۱) مفاتیح الغیب، المعروف بہ تفسیر کبیر۔ متکلمانہ انداز میں لاجواب تفسیر لکھی ہے۔

(۲) مباحثِ مشرقیہ۔ طبیعات اور الٰہیات میں ان کی بہترین تصنیف ہے۔

(۳) شرحِ اشارات۔ فلسفہ میں ان کا شاہکار ہے۔

میری رائے میں دنیائے اسلام میں اُن سے بڑا متکلم ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔ اور نہ آیندہ کوئی اُمید ہے کیونکہ عصرِ حاضر کے مسلمان تو اس فن کی کتابوں کو کما حقہ، سمجھ بھی نہیں سکتے۔ اِلّا ماشاء اللہ۔

در معنیٔ اینکہ پختگیٔ سیرتِ ملیہ از اتباعِ آئینِ الٰہیہ است

قومی سیرت (کیرکٹر) کی پختگی اتباعِ شریعت پر موقوف ہے

در شریعت معنیٔ دیگر مجو — غیرِ ضو در باطنِ گوہر مجو
این گہر را خود خدا گوہرگر است — ظاہرش گوہر بطونش گوہر است
علمِ حق غیر از شریعت ہیچ نیست — اصلِ سنت جز محبت ہیچ نیست
فرد را شرع است مرقاتِ (۱) یقین — پختہ تر از وے مقاماتِ یقین
ملت از آئینِ حق گیرد نظام — از نظامِ محکمے خیزد دوام
قدرت اندر علمِ او پیدا ستے — ہم عصا و ہم یدِ بیضا ستے
باتو گویم سرِ اسلام است شرع — شرع آغاز است و انجام است شرع
اے کہ باشی حکمتِ دیں را امیں — باتو گویم نکتۂ شرعِ مبیں
چوں کسے گردد مزاحم بے سبب — با مسلماں در ادائے مستحب
مستحب را فرض گردانیدہ اند — زندگی را عینِ قدرت دیدہ اند
روزِ ہیجا (۲) لشکرِ اعدا اگر — بر گمانِ صلح گردد بے خطر
گیرد آساں روزگارِ خویش را — بشکند حصن و حصارِ خویش را

---

(۱) مرقات - زینہ ۱۲   (۲) ہیجا - جنگ ۱۲۔

تا نگیرد باز کارِ او نظام — تاختن بر کشورش آمد حرام

سرِّ ایں فرمانِ حق دانی کہ چیست — زیستن اندر خطر ہا زندگیست

شرع میخواہد کہ چوں آئی بجنگ — شعلہ گردی واشگافی کامِ سنگ

آزماید قوتِ بازوے تو — (۱) می نہند الوند پیشِ روئے تو

باز گوید سرمہ ساز الوند را — از تفِ خنجر گداز الوند را

نیست میشِ ناتوانے لاغرے — در خورِ سرپنجۂ شیرِ نرے

باز چوں با صعوہ خوگر می شود — (۲) از شکارِ خود زبوں تر می شود

شارعِ آئیں شناسِ خوب و زشت — بہرِ تو ایں نسخۂ قدرت نوشت

از عمل آہن عصب می سازدت — جاے خوبے در جہاں اندازدت

خستہ باشی استوارت می کند — پختہ مثلِ کوہسارت می کند

ہست دینِ مصطفےٰ دینِ حیات — شرعِ او تفسیرِ آئینِ حیات

گر زمینی آسماں سازد ترا — آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

صیقلش آئینہ سازد سنگ را
از دلِ آہن رباید زنگ را

تا شعارِ مصطفےٰؐ از دست رفت — قوم را رمزِ بقا از دست رفت

آں نہالِ سربلند و استوار — مسلمِ صحرائی اشتر سوار

پائے تا در وادیٔ بطحا گرفت — تربیت از گرمیٔ صحرا گرفت

---

(۱) الوند - ایران کے ایک پہاڑ کا نام ۱۲ - (۲) صعوہ - ممولا - ۱۲

آں چناں کاہید از بادِ عجم
ہمچو نے گردید از بادِ عجم

آنکہ کشتے شیر را چوں گوسفند
گشت از پامالِ مورے دردمند

آنکہ از تکبیرِ او سنگ آب گشت
از صفیرے بلبلے پیشاب گشت

آنکہ عزمش کوہ را کاہے شمرد
با توکل دست و پائے خود سپرد

آنکہ ضربش گردنِ اعدا شکست
قلبِ خویش از ضربہائے سینہ خست

آنکہ گامش نقشِ صد ہنگامہ بست
پائے اندر گوشۂ عزلت شکست

آنکہ فرمانش جہاں را ناگزیر
بردرش اسکندر و دارا فقیر

کوششِ او با قناعت ساز کرد
تا بہ کشکولِ گدائی ناز کرد

شیخ احمد (۱) سیدِ گردوں جناب
کاسبِ نور از ضمیرش آفتاب

گل کہ می پوشد مزارِ پاکِ او
لا الٰہ گویاں دمد از خاکِ او

با مریدے گفت اے جانِ پدر
از خیالاتِ عجم باید حذر

زانکہ فکرش گرچہ از گردوں گذشت
از حدِ دینِ نبیؐ بیروں گذشت

اے برادر ایں نصیحت گوش کن
پند آں آقائے ملت گوش کن

قلب را زیں حرفِ حق گرداں قوی
با عرب در ساز تا مسلم شوی

---

(۱) حضرت شیخ احمد رفاعی رحمۃ اللہ علیہ — ۱۲

(فصل چہاردہم)

تمہید :۔ اس فصل میں دو بند ہیں۔ پہلے بند میں اقبالؔ نے یہ بتایا ہے کہ :۔

(۱) شریعت کی پیروی بلا چون وچرا واجب ہے۔

(۲) اس پیروی سے سیرتِ ملّی کی تکمیل ہوتی ہے۔

(۳) تکمیل (پختگی) سے قدرت حاصل ہوتی ہے۔

(۴) شریعتِ محمّدیہ کسی ملک یا قوم سے مختص نہیں، بلکہ وہ تو قانونِ حیات ہے۔ لہٰذا جب تک دنیا میں حیات موجود ہے شریعتِ محمّدیہ (دینِ مصطفےٰ) کی ضرورت برقرار رہے گی۔

دوسرے بند میں حسبِ معمول، قوم کی اسلام بیزاری اور شریعت سے بیگانگی پر ماتم کیا ہے۔ اور اس کے افسوسناک نتائج سے قوم کو آگاہ کیا ہے

آخر میں حضرت شیخ احمدؒ رفاعیؒ کی اُس نصیحت سے ناظرین کو بہرہ اندوز کیا ہے، جو اُنہوں نے اپنے ایک مُرید کو دی تھی۔

پہلا بند :۔ کہتے ہیں کہ اے مسلمان! شریعتِ محمّدیہ کے وہی معنی قبول کر، یعنی اسی مفہوم پر عمل کر جو ظاہری لفظوں سے واضح ہوتے ہیں۔ یہ غلط بلکہ گمراہ کن خیال اپنے دل سے بالکل نکال دے کہ شریعت بھی مادی اشیاء کی طرح کوئی ایسی چیز ہے، جس کا ایک ظاہری پہلو ہے اور دوسرا باطنی۔

شریعت تو از سرتاپا مثلِ گوہر ہے، اور سب جانتے ہیں کہ گوہر (مثلاً موتی یا

الماس وغیرہ) کا ظاہری حصہ بھی چمکدار ہوتا ہے اور باطنی حصہ بھی۔ کیا کوئی شخص ایسا بیوقوف ہو سکتا ہے جو یہ کہے گا کہ اس ہیرے کے ظاہری پہلو پر مت جاؤ، بلکہ اس کا باطنی پہلو دیکھو۔ یعنی اس کے دو حصے کر دو اور پھر دیکھو اندر کیا نکلتا ہے؟ ہر شخص اس نادان کو یہی جواب دے گا کہ گوہر تو مجسم نور ہے، سراپا درخشندگی ہے، جو اس کے باطن میں ہے، وہی اس کے ظاہر میں ہے۔

ع ظاہرش گوہر بطونش گوہر است

اقبال نے اس فصل کا یہ پہلا شعر اس قدر بلیغ لکھا ہے، کہ ساری کتاب میں اس کا جواب مشکل سے نکلیگا۔ انھوں نے "معنی دیگر" سے ایسی خوبصورتی کے ساتھ فرقِ ضالہ کے اصول وعقائد کی تردید کی ہے کہ بے اختیار دل سے صدائے تحسین بلند ہوتی ہے۔

دوسری خوبی یہ ہے کہ اس "معنی دیگر" ہی کی تلاش کے خبط نے ملتِ اسلامیہ کے اندر تاویل کا دروازہ کھولا، اور اس منحوس اور مبغوض رسمِ تاویل نے پوری قوم کو تباہ اور برباد کر کے رکھ دیا۔ چنانچہ اقبال خود کہتے ہیں:۔

ع زندہ قومے بود از تاویل مرد

اگر میں فتنۂ تاویل کی ابتداء کے اسباب، اور اس کی تاریخ، اور اس کے نتائج کی تفصیل لکھنے لگوں تو یہ شرح ملتِ اسلامیہ کی ہزار سالہ تاریخ کی شکل میں مبدل ہو جائے گی۔ گویا اقبال نے "معنی دیگر" کہہ کر دریا کو کوزہ میں بند کر دیا۔ اسی لئے تو میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ بلاغت کے اعتبار سے یہ شعر اس فصل کی جان ہے۔

اب میں "معنیٔ دیگر" کے مفہوم کو ایک مثال سے واضح کر دوں۔ مثلاً قرآنِ حکیم فرماتا ہے:۔

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ الخ

اس کا وہ مفہوم جو لفظوں سے متبادر ہوتا ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ صلوٰۃ کو قائم کرو۔ یعنی نماز باجماعت کی پابندی کرو۔ اقامتِ صلوٰۃ کا یہی مطلب صحابہ رضؓ، تابعین، تبع تابعین اور تمام سلفِ صالحین سے مروی ہے۔ صحابہؓ نے اس کا یہی مطلب سمجھا تھا۔ چنانچہ نماز باجماعت کی پابندی ہی اُن کے نزدیک کسی کے مسلمان ہونے کی دلیل تھی۔

اسی طرح دوسرے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ باقاعدہ ادا کرو۔ لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں ہی میں ایسے جہالت مآب افراد پیدا ہو گئے۔ جنہوں نے مسلمانوں کو ورغلایا کہ جب ہر شئے کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے تو قرآن کا بھی ایک ظاہری پہلو ہوگا اور دوسرا باطنی پہلو۔ پس آؤ اس آیت کے باطنی مفہوم کو متعین کریں۔ یعنی آؤ اس میں "معنیٔ دیگر" تلاش کریں۔

یہ تھی وہ منحوس ترین ساعت جب مسلمانوں نے شریعتِ اسلامیہ (قرآن) میں "معنیٔ دیگر" (باطنی مفہوم) تلاش کرنے کی ناپاک تحریک شروع کی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآنِ حکیم بازیچۂ اطفال بن کر رہ گیا۔ تفصیل سے قصداً اجتناب کرتا ہوں۔

اقبالؔ کے سامنے ملّتِ اسلامیہ کی سیزدہ صد سالہ تاریخ بھی تھی، اور فِرَقِ ضالّہ کی اسلام کش سرگرمیوں کی داستان بھی، اور وہ اس قسم کی تحریکوں

کے نتائج سے بھی آگاہ تھے جیسا کہ اُن کے کلام سے واضح ہے:۔

حکم دُشوار است تاویلے مجو
جُز بقلبِ خویش قندیلے مجو

نیز اُن کے مُرشد مولٰینا رُومؒ اُن سے پہلے قوم کو بایں الفاظ متنبہ فرما چکے تھے:۔

می کنی تاویل حرفِ بکر را
خویش را تاویل کُن نے ذکر را

اس لئے اقبالؔ نے مسلمانوں کو سب سے پہلے تاویل کے فتنہ سے متنبہ کیا کہ

ع در شریعت معنئ دیگر مجو

یعنی سچے مسلمان کا فرضِ منصبی صرف یہ ہے (اس کے علاوہ اور کچھ نہیں) کہ جو بات شارعِ علیہ السلام کے ارشادات سے بغیر کسی تاویل کے ثابت ہو اس کا اتباع کیا جائے، اور بلا چون و چرا اتباع کیا جائے۔ بس یہی شریعت کا، بلکہ اسلام کا مطالبہ ہے اور یہی قرآن کی تعلیم ہے کہ

مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ج

اور سولؐ جو کچھ دیں اُسے لے لو۔ اور جس چیز سے روک دیں، اُس سے باز رہو۔ کہتے ہیں کہ علمِ حق، شریعت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ یعنی علمِ طریقت، یا علمِ حقیقت، علمِ شریعت سے کوئی علیحدہ چیز نہیں ہے۔ اس شریعت کا دوسرا نام اتباعِ سُنّت ہے۔ اور سُنّت کی بنیاد محبت پر ہے۔

اقبالؔ نے اس شعر میں دو باتیں بیان کی ہیں:۔

پہلی بات یہ ہے کہ جاہل اور گمراہ صوفیوں کی بدولت چوتھی صدی ہجری سے مسلمانوں میں یہ غلط خیال راہ پا گیا ہے کہ شریعت اور ہے اور طریقت (حقیقت) اور ہے۔ اس خیال کی اشاعت کا سبب یہ ہے کہ جاہل صوفیوں کے بعض اعمال شریعت کے خلاف تھے۔ یعنی جب عقابوں کے نشیمن، زاغوں کے تصرف میں آگئے تو انھوں نے نفسِ امارہ کی پیروی کو شعارِ زندگی بنالیا۔ اور جب عامتہ المسلمین نے اُن پر اعتراض کیا، تو انھوں نے یہ جواب دیا کہ ہم شریعت کی منزل طے کر چکے ہیں۔ اس لئے اس کے ظاہری احکام کی پابندی سے آزاد ہو چکے ہیں۔ اور اب ہم طریقت یا حقیقت کی منزل میں ہیں۔ اور یہ منزل شریعت کی منزل سے جُداگانہ بلکہ بالاتر ہے۔ بیشک نماز فرض ہے۔ لیکن اُنہی لوگوں پر جو ابھی پہلی منزل میں ہیں۔ وغیر ذالک من الخرافات۔

ہندوستان میں، انیسویں صدی کے آغاز میں دہلی اور اس کے اطراف میں رسول شاہی فرقہ کے لوگوں نے بڑی شدومد کے ساتھ اس گمراہی کو شائع کیا۔ اور چونکہ عوام ان صاحبِ کشف و کرامت کا یقین کرتے تھے، اس لئے بآسانی اُن کے جال میں پھنس گئے۔

اقبالؔ نے پہلے مصرع میں اس گمراہی کا ازالہ کیا ہے۔ اور اُن سے پہلے اُن کے مرشد مولینا رومؒ اس حقیقت کو واضح کر چکے ہیں کہ تصوف طریقت کا دوسرا نام ہے۔ اور طریقت، شریعت سے علیحدہ کوئی چیز نہیں ہے۔ جیسا کہ موصوف دفترِ پنجم کے دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ:۔

"شریعت ہمچو شمع است کہ راہ می نماید۔ چوں در راہ آمدی ایں رفتنِ تو طریقت است، و چوں بمقصود رسیدی ایں رسیدنِ تو حقیقت است۔"

یعنی شریعت کی مثال شمع کی سی ہے، جو راستہ دکھاتی ہے۔ جب تُو اس راہ پر چلنے لگا۔ تو تیرا چلنا ہی طریقت ہے۔ اور جب تُو منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا، تو یہ پہنچ جانا ہی حقیقت ہے۔

اس تصریح سے ثابت ہوا کہ حقیقی تصوّف عینِ اسلام ہے۔ اور چونکہ اسلام کا مقصود یہ ہے کہ مسلمان اللہ تک پہنچ جائے، اس لئے اسلام عینِ تصوّف ہے۔ کسی شئے کے غلط استعمال سے وہ شئے بذاتِ خود مذموم نہیں قرار دی جاسکتی۔

دوسری بات اقبالؔ نے یہ کہی ہے کہ سنّتِ نبویؐ (شریعت) پر وہی شخص عامل ہوسکتا ہے، جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبّت کرتا ہو۔ کیونکہ اتباعِ رسولؐ، بدونِ محبّت محال ہے۔

کہتے ہیں کہ شریعت، فرد کے حق میں مرقاتِ یقین ہے۔ یعنی انسان اتباعِ شریعت ہی کی بدولت، حقیقی معنی میں مومن بن سکتا ہے۔ اور یقین (ایمان) کے مقامات اسی وسیلہ سے حاصل ہوسکتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کی رُو سے مقاماتِ یقین چار ہیں:۔

انبیاء کا ایمان، صدّیقین کا ایمان، شہداء کا ایمان، صالحین کا ایمان۔

پہلا مرتبہ جو ایمان (یقین) کا اوثق اور اعلیٰ مرتبہ ہے، یہ تو صرف انبیاء کو حاصل ہوسکتا ہے۔ اُمّت کے افراد اس مقام تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہاں بقیہ تین مراتب اُن کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ مَنْ جَدَّ وَجَدَ۔ (جو کوشش کرے گا، وہ پائے گا۔)

کہتے ہیں کہ آئینِ حق (شریعت) کا علم انسان کے اندر قدرت (استیلاء واقتدار) کا رنگ پیدا کر دیتا ہے۔ علمِ شریعت مسلمان کے حق میں عصا بھی ہے اور یدِ بیضا بھی ہے۔ عصا اور یدِ بیضا میں اُن معجزات کی طرف اشارہ ہے، جو حضرت موسیٰؑ کو عطا ہوئے تھے یعنی شریعت کا علم انسان کو فوق الفطرت طاقتیں عطا کر سکتا ہے۔

افلاطون کا قول ہے کہ علم، نیکی کا دوسرا نام ہے۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ شریعت کا علم نیکی کے علاوہ قدرت کا بھی دوسرا نام ہے۔ مسلمان اگر شریعت کا صحیح علم حاصل کر لے تو اس کے اندر محیّر العقول طاقت پیدا ہو جائے گی۔

اسی لئے وہ مسلمان سے یہ کہتے ہیں کہ شریعت، سرِ اسلام ہے۔ اگر کوئی شخص اسلام کی حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتا ہے تو شریعتِ محمدیہ کا اتباع کر کے دیکھ لے۔ یعنی اسلام انسان کے اندر انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن یہ انقلاب صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے کہ مسلمان شریعتِ اسلامیہ پر عامل ہو جائے۔

پس شریعت ہی اسلام کا آغاز ہے اور شریعت ہی اس کا انجام ہے۔ اسلام، شریعت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ شریعت ہی انسان کو خدا تک پہنچا سکتی ہے۔ دنیائے اسلام میں جس قدر اشخاص برگزیدہ گزرے ہیں، اُن سبھوں نے شریعت ہی کی پیروی سے یہ مرتبہ حاصل کیا ہے۔ اتباعِ شریعت ہی کی بدولت سید عبدالقادر جیلانیؒ غوثِ اعظم کے مقام پر پہنچ گئے، اور شیخ احمد سرہندیؒ، مجددِ الفِ ثانی کے مرتبہ پر فائز ہو گئے۔ اور یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ دنیائے اسلام میں ان سے زیادہ مقبولیت، شہرت اور عزت اور کسی بزرگ کو حاصل نہیں ہوئی۔

اب اس نکتہ کو اقبالؔ دو مثالوں سے واضح کرتے ہیں :۔

پہلی مثال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یا جماعت، ادائے مستحب میں کسی مسلمان کی بلا وجہ مزاحمت پر آمادہ ہو جائے تو شریعت اسلامیہ اس مستحب امر کو فرض قرار دے دیتی ہے۔ مثلاً گائے کا گوشت کھانا، ایک مستحب امر ہے کہ اس کے کھانے پر ثواب نہیں، اور نہ کھانے پر عذاب نہیں (یہی مستحب کا مفہوم ہے) لیکن اگر کوئی شخص یا حکومت کسی مسلمان کو ترکِ لحم بقر پر مجبور کرے تو اس صورت میں گائے کے گوشت کا کھانا از روئے شریعت مسلمان پر فرض ہو جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ شریعت نے اس فعلِ مستحب کو اندریں صورت فرض کا درجہ کیوں دے دیا؟ جواب اس کا یہ ہے کہ شریعت مسلمان کو قدرت کی نعمت سے بہرہ ور کرنا چاہتی ہے۔ شریعت کا مقصود یہ ہے، کہ مسلمان دنیا میں عزت اور اقتدار کی زندگی بسر کرے۔ اسلام اور عاجزی تو متضاد چیزیں ہیں۔ پس شریعت مسلمان کو یہ حکم دیتی ہے کہ اندریں حالات تم دنیا کو دکھا دو کہ۔

ماسوی اللہ را مسلماں بندہ نیست

پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست

یعنی دنیا کی کوئی طاقت مسلمان کو غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ جس بات سے اللہ نے یعنی شریعت نے مسلمان کو نہیں روکا، دنیا کی کوئی طاقت اس کو اس فعل سے باز نہیں رکھ سکتی۔

یہی وجہ ہے کہ جب سامانہ ضلع پٹیالہ (مشرقی پنجاب) کے ہنود نے عید الضحیٰ کے موقع پر مسلمانوں کو ذبحِ بقر سے باز رکھنا چاہا تو حضرت مجدد الفِ ثانیؒ نے

کفّار کے اس طرزِ عمل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی، اور خان جہاں لودی کو، جو جہانگیر کے اُمراء میں سے تھے، لکھا تھا:۔

"باید دانست کہ ذبحِ بقر دریں کشور از اعاظم شعائرِ اسلامیہ است۔"

اور ہم شعائر کے باب میں کسی غیر مسلم کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اگر آج اس مستحب فعل سے مسلمانوں کو باز رکھا جا سکتا ہے، تو کل کو سُنن اور واجبات اور فرائض سے تعرض ممکن ہو سکتا ہے۔

دوسری مثال:۔ اگر دورانِ جنگ میں دشمن صلح کی درخواست کرے اور صلح کی توقع پر اپنی حفاظت کے اسباب سے بے نیاز ہو جائے، تو مسلمانوں کے لئے اس کی مملکت پر حملہ آور ہونا جائز نہیں ہے، کیونکہ نہتّے یا غافل یا صلح کے آرزومند دشمن پر تلوار اُٹھانا آئینِ جوانمردی (مروّت) کے خلاف ہے۔

اس کے بعد کہتے ہیں کہ اے مسلمان! کیا تُو اس بات سے آگاہ ہے کہ شریعت نے اس قسم کے احکام کیوں نافذ کئے؟ سُن! اسلام چاہتا ہے کہ تو خطروں میں زندگی بسر کرے تاکہ تیری مخفی استعدادیں بروئے کار آ سکیں۔ زندگی، مَر مَر کے جیے جانے کا نام نہیں ہے، بلکہ مشکلات کے مقابلہ کا نام ہے۔ مسلمان کا فرض ہے کہ ہر وقت سر بکف اور کفن بر دوش رہے۔ اسلام، اپنے پیروؤں کو مجاہد فی سبیل (اللہ کی فوج کا سپاہی) بنانا چاہتا ہے، اور جیسا کہ سب جانتے ہیں سپاہی ہر وقت خطروں میں زندگی بسر کرتا ہے۔

اگلے اشعار میں اسی نکتہ کی تشریح کرتے ہیں کہ شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ جب تو میدانِ جنگ میں جائے، تو

(۱) شعلہ بن جا، اور کفر کو جلا کر خاک سیاہ کردے۔ کیونکہ تو منصب کے لحاظ سے غارتگرِ باطل ہے۔

(۲) پتھر کا حلق چیر دے یعنی دشمن کو پارہ پارہ کردے۔

شریعت تجھ کو یعنی تیری قوتِ ایمانی کو آزمانا چاہتی ہے، اس لئے وہ تجھے پہاڑ (کفر) سے متصادم ہونے کا حکم دیتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اے مسلمان! تو اللہ کا سپاہی ہے، تو حق کا علمبردار ہے۔ تیرا کام دین کو غالب کرنا ہے۔ اس لئے تو قلت یا کثرتِ اعداد پر نظر مت کر۔ تیرا کام کفر سے ٹکر لینا ہے۔ باطل سے ٹکرا جانا ہے۔ خواہ وہ باطل (کفر) کوہِ ہمالیہ کی برابر ہو، یا کوہِ الوند کی برابر۔

تیرا کام یہ ہے کہ تو الوند (کفر) کو پیس کر سرمہ کردے، اور اب دو ہی صورتیں عقلاً ممکن ہیں:۔

(ا) یا تو اس کوشش میں کامیاب ہوگا، تو غازی کہلائے گا۔

(ب) یا تو اس کوشش میں اپنی جان دیدے گا تو شہید کا مرتبہ پائے گا۔

ان دونوں صورتوں میں اللہ تجھ سے راضی ہوجائے گا، اور اگر اللہ راضی ہوجائے تو "ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ" یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

شریعت تجھ کو "الوند" کا مقابلہ کرنے کا حکم اس لئے دیتی ہے کہ اگر تو کمزور (میش ناتواں) کو اپنا مدِمقابل بنائے گا، تو رفتہ رفتہ خود بھی کمزور ہوجائے گا۔ مثلاً باز اگر خرگوش کے بجائے چڑیوں کے شکار کا عادی ہوجائے، تو پھر اس میں بڑے پرندوں اور جانوروں کو شکار کرنے کی قدرت باقی نہیں رہے گی۔

چونکہ شریعت تجھے طاقتور بنانا چاہتی ہے اس لئے اُس نے تجھے پہاڑوں سے ٹکرا جانے کا حکم دیا ہے۔ یہ وہ نسخہٗ قدرت ہے جو شارع علیہ السّلام نے تیرے لئے تجویز کیا ہے۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ تیرے اعصاب فولاد کی طرح سخت ہو جائیں۔ تاکہ تو بلندی پر پہنچ سکے۔

شریعت تجھے طاقتور بنانا چاہتی ہے، اور کوہسار کی طرح پختہ کرنا چاہتی ہے۔

اب اقبالؔ ہمیں اسلام کی رُوح سے آشنا کرتے ہیں کہتے ہیں کہ اے مخاطب! دینِ اسلام کسی خاص ملک یا خاص نسل کے باشندوں کا دین نہیں ہے۔ بلکہ وہ دینِ حیات ہے، یعنی زندگی کا یا زندہ رہنے کا قانون ہے۔ جو شخص زندہ رہنے کا آرزو مند ہو۔ اُسے اسلام اختیار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ یہ دین ہم کو دنیا میں زندہ رہنے کا طریقہ سکھاتا ہے۔ اور یہ دین اسی لئے عالمگیر ہے اور اسی لئے قیامت تک باقی رہے گا۔

(۱) زندگی ہر جگہ پائی جاتی ہے، اس لئے اسلام بھی عالمگیر ہے۔

(۲) زندگی قیامت تک باقی رہے گی، اس لئے اسلام بھی ابدی ہے۔

یعنی اسلام قیدِ مکانی اور قیدِ زمانی دونوں سے بالاتر ہے اور اسلام کی شریعت (قانونِ اسلام) زندگی کے قانون کی تفسیر ہے یعنی شریعت یہ بتاتی ہے کہ انسان کو کامیاب ہونے کے لئے کس نہج پر زندگی بسر کرنی لازم ہے۔

شریعت میں یہ طاقت ہے کہ اگر تو اس پر کاربند ہو جائے تو وہ تجھے پستی (غلامی) سے نکال کر بلندی (حکمرانی) تک پہنچا دے گی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے

قرآن میں بنی آدم سے وعدہ فرمایا ہے:۔

أَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ٥

اگر تم مومن ہو تو پھر دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مغلوب نہیں کر سکتی، اور یہ شریعت تمہیں وہ کچھ بنا سکتی ہے، جو اللہ چاہتا ہے کہ تم بن جاؤ، اور سب جانتے ہیں کہ اللہ ہمیں اپنا نائب بنانا چاہتا ہے۔

دوسرا بند:۔ پہلے بند میں اسلام (شریعت) کی سرگزشت بیان کی۔ اب اس بند میں مسلمانوں کی حالتِ زار بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب مسلمانوں نے شریعت (شعارِ مصطفےٰ) سے قطع تعلق کر لیا۔ اُسی زمانے سے وہ دُنیا میں عزت کی زندگی سے محروم ہو گئے۔

(۱) سنہ ۱۲۵۸ء میں ہلاکو نے بغداد کا خاتمہ کر دیا۔

(۲) سنہ ۱۴۹۲ء میں فرڈیننڈ نے غرناطہ کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔

(۳) سنہ ۱۶۸۲ء میں یورپ نے ترکوں کی کمزوری دُنیا پر واضح کر دی۔

(۴) سنہ ۱۷۲۷ء میں سکھوں نے سرہند کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

(۵) سنہ ۱۷۹۹ء میں ملاعنۂ فرنگ نے مسلمانانِ مشرق کی امیدوں کا چراغ گُل کر دیا۔

(۶) سنہ ۱۸۵۷ء میں انہی دشمنانِ ملت نے ہندی مسلمانوں کا خاتمہ کر دیا۔ اور مسلمانوں پر مصائب کے پہاڑ توڑ ڈالے۔ جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو بے حد و حساب جان و مال، عزت، دولت، حرمت کا نقصان اٹھانا پڑا۔

یہ پیہم شکستیں، ذلتیں اور رسوائیاں ہمارے حصہ میں کیوں آئیں؟ اقبالؔ کی رائے میں محض اس لئے کہ ہم شریعت سے بیگانہ ہو گئے، یا ہم نے شعارِ مصطفےٰ

سے اپنا رابطہ منقطع کر لیا۔

جب مسلم صحرائی، اونٹ پر سوار ہو کر عرب سے نکلا، تو اس نے ہر معرکہ میں فتح حاصل کی۔ لیکن جب وادی بطحا کے بجائے اس نے بغداد کو اپنا مرکز بنا لیا، تو عجم کی ناموافق آب و ہوا نے اس کو اس قدر ضعیف کر دیا کہ وہی عرب جو شیروں کا شکار کرتا تھا۔ اب اس قدر نازک مزاج اور رقیق القلب اور کمزور ہو گیا کہ چیونٹی کی پامالی سے بھی دردمند ہو جاتا تھا۔ اور وہی مسلمان جس کی تکبیر سے پتھر کا کلیجہ پانی ہو جاتا تھا۔ اب اس قدر جذباتی ہو گیا کہ صفیر بلبل اسے بیتاب کرنے کے لئے کافی بن گئی۔ اور وہی مسلمان جو پہاڑوں سے ٹکر لیا کرتا تھا، عجم کی آب و ہوا سے اس قدر لاغر ہو گیا کہ توکل پر زندگی بسر کرنے لگا۔ اور وہی مسلمان جس کی ضرب سے دشمن کی گردن کٹ کر گر پڑتی تھی۔ عجم کے غیر اسلامی ماحول کی بنا پر، جہاد سے بیگانہ ہو کر اپنے قلب کو انہی ضربوں سے خستہ کرنے لگا۔

یہ نہایت بلیغ شعر ہے۔ اس میں ظاہری خوبی تو یہ ہے کہ لفظ "ضرب" میں ایہام ہے۔ یعنی پہلے مصرع میں لفظِ ضرب کے معنیٰ ہیں تلوار مارنا۔ اور دوسرے مصرع میں اسی لفظ کے معنیٰ ہیں، رات کی تنہائی میں کسی مسلمان کا حجرہ میں بیٹھ کر "اللہ ھُو" کی مشق کرنا۔

باطنی خوبی یہ ہے کہ اس شعر میں اقبال نے اس عظیم الشان ذہنی انقلاب کی تاریخ بند کر دی ہے۔ جس نے مسلمانوں کے قوائے عملی کو ایسا مفلوج کر دیا کہ آج اقوامِ عالم کی صف میں شاید سکھوں کے لئے جگہ نکل سکے۔ لیکن اُن

کے لیے نہیں نکل سکتی۔ میں اس شرح میں اس انقلاب کی شرح تو نہیں لکھ سکتا ہاں اشارتاً اتنا لکھنا کافی ہے کہ ایران کے باشندے بظاہر مغلوب ہو گئے۔ لیکن وہ دل سے مسلمان نہیں ہوئے۔ اس لئے انہوں نے مسلمانوں کا انتقام خود اسلام سے لیا۔ اس طرح کہ اس پاکیزہ دین میں مجوسیت، ثنویت، زندیقیت، رجعت، حلول، اتحاد، تناسخ، تجسم، غرض کہ دنیا جہان کے غیر اسلامی تصورات کی آمیزش کر دی۔ اور اس آمیزش کے لیے "معنیٔ دیگر" کا طریقہ اختیار کیا۔ اسی ضلالت کی ایک کڑی وہ غیر اسلامی تصوف تھا جسے اسلام کے نام پر مسلمانوں میں مروج کر دیا گیا۔ اور ایرانی دماغ نے اس مجاہد قوم کی ایسی کایا پلٹ دی کہ کہ آج اس کا مزاج یکسر خانقاہی بن گیا ہے۔

دُور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سندھ اور پنجاب میں ہر جگہ خانقاہیں موجود ہیں۔ اور ان اشجارِ مقدسہ کے اثمارِ شیریں سے پوری قوم لطف اندوز ہو رہی ہے۔ اسی لئے ابلیس نے اپنی مجلسِ شوریٰ کے ارکان کو اس بات کی خاص طور سے تاکید کر دی ہے کہ۔

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

آخر میں اقبالؔ نے حضرت شیخ احمد رفاعیؒ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ شیخ موصوف نے اپنے ایک مُرید کو یہ نصیحت کی کہ جانِ پدر! اگر اسلام کی رُوح سے آشنا ہونا چاہتے ہو، تو "خیالاتِ عجم" سے کلی اجتناب کر۔ یہ سچ ہے کہ منطق، فلسفہ اور کلام میں ایرانیوں (عجمیوں) کی فکر آسمان سے بھی دد

ہاتھ اوپر چلی گئی، لیکن دینِ نبیؐ (شریعت) کی حدود سے متجاوز ہو گئی۔ پس میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ اگر تو مسلمان ہونا چاہتا ہے تو عجم کے بجائے عرب سے موافقت اور مطابقت پیدا کر، یعنی عجمی افکار سے پرہیز کر اور خالص اسلام کو مدارِ حیات بنا۔ یعنی وہ اسلام جسے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

نوٹ:۔ (۱) اقبالؔ کے نظامِ افکار میں عرب اور عجم ملکوں کے نام نہیں ہیں، بلکہ دو اصطلاحیں ہیں۔ عرب سے اُن کی مراد ہے خالص اسلام جس میں کسی بیرونی اور غیر اسلامی عنصر کی آمیزش نہ ہو۔ عجم سے اُن کی مراد ہے وہ تمام غیر اسلامی عناصر جو مختلف زمانوں میں اسلام کے اندر راہ پا گئے۔ اور رفتہ رفتہ اسلام کے اجزائے لاینفک بن گئے۔ اور بعض عناصر تو ایسے گھل مل گئے ہیں کہ اگر اقبالؔ اُن کی صراحت کر دیتے، تو ان پر بھی کفر کا فتویٰ لگ جاتا۔

نوٹ:۔ شیخ احمد رفاعیؒ جو طریقۂ رفاعیہ کے بانی گذرے ہیں، ۱۱۸ء میں بصرہ کے نزدیک ایک موضع میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے ساری عمر مسلمانوں کی اصلاح میں بسر کر دی۔ اُن کے زمانے میں غیر اسلامی تصوف، ملاحدہ اور زنادقہ اور باطنیہ کی متحدہ کوششوں سے عامۃ المسلمین میں مقبول ہو چکا تھا۔ اس لئے انہوں نے ایک جماعت بنائی جو مسلمانوں سے یہ کہتی تھی کہ تمام عجمی افکار سے اجتناب کرو۔ انہوں نے ۱۱۸۳ء میں وفات پائی۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھو دائرۃ المعارف اسلام جلد سوم ص ۱۱۵۶

در معنیٔ ایں کہ حسنِ سیرتِ ملّیہ از تأدّب بآدابِ

حسنِ سیرت، خُلقِ محمدیؐ کے اتباع پر موقوف ہے

محمدیہؐ است

سائلے مثلِ قضائے مبرمے / بر درِ ما زد صدائے پیہمے
از غضب چوبے شکستم بر سرش / حاصلِ دریوزہ افتاد از برش
عقل در آغازِ ایامِ شباب / می نیندیشد صواب و ناصواب
از مزاجِ من پدر آزردہ گشت / لالہ زارِ چہرہ اش افسردہ گشت
بر لبش آہے جگر تابے رسید / در میانِ سینۂ او دل تپید
کوکبے در چشمِ او گردید و ریخت / بر سرِ مژگاں دمے تابید و ریخت
ہمچو آں مرغے کہ در فصلِ خزاں / لرزد از بادِ سحر در آشیاں
در تنم لرزید جانِ غافلم / رفت لیلائے شکیب از محملم
گفت فردا اُمّتِ خیر الرسلؐ / جمع گردد پیش آں مولائے کل
غازیانِ ملّتِ بیضائے او / حافظانِ حکمتِ رعنائے او
ہم شہیدانے کہ دیں را حجت اند / مثلِ انجم در فضائے ملّت اند
زاہدان و عاشقانِ دل فگار / عالمان و عاصیانِ شرمسار

در میانِ انجمن گردد بلند ‌ ‌ ‌ ‌ نالہ ہائے ایں گدائے دردمند
اے صراطت مشکل از بے مرکبی ‌ ‌ ‌ ‌ من چہ گویم چوں مرا پرسد نبیؐ

"حق جوانے مُسلمے تو باسُپرد
کو نصیبے از دبستانم نبُرد
از تو ایں یک کارِ آساں ہم نشد
یعنی آں انبارِ گل آدم نشد"

در ملامت نرم گفتار آں کریم ‌ ‌ ‌ ‌ من رہینِ خجلت و امید و بیم
اندکے اندیش و یاد آر اے پسر ‌ ‌ ‌ ‌ اجتماعِ اُمتِ خیر البشرؐ
باز ایں ریشِ سفیدِ من نگر ‌ ‌ ‌ ‌ لرزۂ بیم و امیدِ من نگر
بر پدر ایں جورِ نازیبا مکن ‌ ‌ ‌ ‌ پیشِ مولا بندہ را رسوا مکن
غنچۂ از شاخسارِ مصطفےؐ ‌ ‌ ‌ ‌ گُل شو از بادِ بہارِ مصطفےؐ
از بہارش رنگ و بو باید گرفت ‌ ‌ ‌ ‌ بہرۂ از خُلقِ او باید گرفت
مُرشدِ رومی چہ خوش فرمودہ است ‌ ‌ ‌ ‌ آنکہ یم در قطرہ اش آسودہ است
"مگسل از ختم الرسلؐ ایّامِ خویش ‌ ‌ ‌ ‌ تکیہ کم کن بر فن و بر گامِ خویش"
فطرتِ مسلم سراپا شفقت است ‌ ‌ ‌ ‌ در جہاں دست و زبانش رحمت است
آنکہ مہتاب از سرِ انگشتش دو نیم ‌ ‌ ‌ ‌ رحمتِ او عام اخلاقش عظیم
از مقامِ او اگر دور ایستی ‌ ‌ ‌ ‌ (۱) از میانِ معشرِ ما نیستی

---

(۱) معشر: گروہ - جماعت - ۱۲

تو کہ مرغِ بوستانِ ما ستی — ہم صفیر و ہم زبانِ ما ستی
نغمہ داری اگر تنہا مزن — جز بہ شاخِ بوستانِ ما مزن
ہر چہ ہست از زندگی سرمایہ دار — میرد اندر عنصرِ ناسازگار
بلبل استی در چمن پرواز کن — نغمہ با ہم نوایاں ساز کن
در عقاب استی تہِ دریا مزی — جز بخلوت خانۂ صحرا مزی

کوکبی؟ می تاب بر گردونِ خویش
پا منہ بیروں ز پیرامونِ خویش

قطرۂ آبے گر از نیساں بری — در فضائے بوستانش پروری
تا مثالِ شبنم از فیضِ بہار — غنچہ تنگش بگیرد در کنار
از شعاعِ آسماں تابِ سحر — کز فسونش غنچہ می بندد شجر
عنصرِ نم برکشی از جوہرش (۱) — ذوقِ رم از سالماتِ مضطرش
گوہرت جز موجِ آبے ہیچ نیست — سعیِ تو غیر از سرابے ہیچ نیست
در یم اندازش کہ گردد گوہرے — تابِ او لرزد چو تابِ اخترے
قطرۂ نیساں کہ مہجور از یم است — نذرِ خاشاکے مثالِ شبنم است
طینتِ پاکِ مسلماں گوہر است — آب و تابش از یمِ پیغمبر است
آبِ نیسانی بآغوشش درآ — وز میانِ قلزمش گوہر برآ

در جہاں روشن تر از خورشید شو
صاحبِ تابانیٔ جاوید شو

---

(۱) سالمات: اجزائے ترکیبی ۔ ۱۲

(فصل پانزدہم)

تمہید۔ گذشتہ فصل میں اقبالؔ نے یہ بتایا ہے کہ سیرتِ ملی کی پختگی شریعتِ محمدیہ کے اتباع پر موقوف ہے۔ اس فصل میں انہوں نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ سیرتِ ملی میں حسن اور دلکشی خلقِ محمدی کا اتباع کرنے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اقبالؔ کا مطلب یہ ہے کہ پختگی اور شئے ہے، دلکشی اور شئے ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ اگر ایک شخص شرعی احکام کی پابندی کرے گا، تو اس کی سیرت میں پختگی پیدا ہو جائے گی یعنی وہ سچا مسلمان بن جائے گا۔ اس سے کوئی فعل شریعت کے خلاف سرزد نہیں ہوگا۔ اور وہ ہر حال میں اسلام پر قائم رہے گا۔ یہ سب کچھ ہو جائے گا لیکن، اس کی سیرت میں دلکشی پیدا نہیں ہو سکتی۔ یعنی اس کی شخصیت دوسروں کے لئے باعثِ کشش نہیں بن سکتی۔ وہ خود تو مسلمان بن جائے گا لیکن دوسروں کو مسلمان نہیں بنا سکے گا۔ دلکشی اس وقت پیدا ہوگی، جب وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ کو اپنے لئے نمونہ بنائے گا۔

ایک شخص نماز باقاعدہ پڑھتا ہے، روزے پابندی کے ساتھ رکھتا ہے، زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہے۔ غرض کہ جملہ اوامر کی تعمیل کرتا ہے اور ہر قسم کے نواہی سے مجتنب رہتا ہے۔ لیکن دشمنوں پر مہربانی نہیں کرتا، گالیاں کھا کر دعا نہیں دیتا، مساکین کی پرورش نہیں کرتا، تو اقبالؔ کے زاویہ نگاہ سے اس کی سیرت میں پختگی تو ہے، لیکن دلکشی نہیں ہے۔ اس کے لئے آداب (اخلاق) محمدیہ سے استفادہ (تأدب)

لازمی ہے۔ بالفاظِ دگر جب تک ایک مسلمان اپنے آپ کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں رنگین نہیں کرے گا۔ حضورؐ کی خُو دبُو، اپنے اندر پیدا نہیں کریگا، اُس وقت تک حُسنِ سیرت سے محروم رہے گا۔ یعنی اس کی شخصیت مرتبۂ کمال تک نہیں پہنچ سکتی۔ اسی لئے مرنے سے تین ماہ پہلے اقبالؔ نے اپنے تیس سالہ پیغام کا خلاصہ اس شعر میں بیان کر کے اپنا فرض ادا کر دیا ہے

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر با و نرسیدی تمام بولہبی است

اس فصل میں دو بند ہیں۔ پہلے بند میں اقبالؔ نے اپنی زندگی کا ایک واقعہ سپردِ قلم کیا ہے۔ دوسرے بند میں اس حقیقتِ کبریٰ کو بے نقاب کیا ہے۔ کہ مسلمان میں اسلامی رنگ و بُو یا اسلامیت کارل مارکس یا فرائیڈ یا گاندھی کی اتباع سے پیدا نہیں ہو سکتی۔

؎ او خویشتن گم است کرا رہبری کند

یہ نعمت تو صرف سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہی سے نصیب ہو سکتی ہے۔

پہلا بند:۔ کہتے ہیں کہ عنفوانِ شباب کے زمانہ میں ایک دن ایک فقیر ہمارے دروازہ پر آیا۔ اس کے اصرارِ پیہم پر مجھے غصہ آگیا۔ اس لئے میں نے ایک ڈنڈا اس کے سر پر رسید کر دیا۔ میرے پدرِ مرحوم نے جب میرا یہ طرزِ عمل دیکھا تو انہیں بیحد رنج ہوا۔ اور ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ جب میں نے انھیں اس حال میں دیکھا، تو میں مارے خوف کے کانپنے لگا۔

انہوں نے مجھ سے کہا کہ " کل قیامت کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت، آپؐ کے گرد جمع ہو گی۔ اس مجمع میں غازیانِ ملّت بھی ہونگے، اور فقہائے اُمّت بھی۔ شہداء بھی ہوں گے اور عشّاق بھی۔ علماء بھی ہوں گے اور صلحاء بھی۔ نکوکار بھی ہوں گے اور عاصیانِ شرمسار بھی۔ عین اس حالت میں یہ فقیر بھی جسے تم نے اس وقت دُکھ پہنچایا ہے، سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرے گا کہ فلاں شخص کے فرزند نے اس خطا پر مجھے مارا کہ خطا کار نہ تھا۔ اس پر حضورؐ مجھ سے یہ دریافت فرمائیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مسلمان نوجوان کو تیرے حوالہ کیا تھا، لیکن تو نے اس کی صحیح طریق پر تربیت نہیں کی۔ اسے اخلاقِ محمدیہ سے بہرہ ور نہیں کیا۔ تو یہ ایک آسان کام بھی نہ کر سکا۔ یعنی مٹی کے تودے کو آدمی نہ بنا سکا!" تو میں کیا جواب دوں گا۔

یہ کہہ کر اُنہوں نے سکوت کیا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد یوں گویا ہوئے:۔

"اے بیٹے! قیامت کے دن اُس مجمع کا تصور کرو اور پھر میری ریشِ سفید پر ایک نظر کرو اور اس کے بعد خود فیصلہ کرو کہ اُس دن تیری اس حرکتِ نازیبا کی بدولت مجھے اپنے آقا اور مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کس قدر شرمندہ ہونا پڑے گا۔!

"اے بیٹے! اپنے باپ پر یہ ستم مت کر! میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے میری رسوائی کا سامان مت کر!

تو حضورؐ کی اُمّت میں ہے، اس لئے تیرا فرض ہے کہ تو اپنے اندر حضورؐ کی سیرت کا عکس پیدا کرے۔ بات تو جب ہے کہ دُنیا میں جو شخص تجھے دیکھے

وہ یہ کہہ اُٹھے کہ یہ تو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام معلوم ہوتا ہے۔ سُن! مُرشدِ رُومیؒ نے کیسی نفیس بات کہی ہے، گویا دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔

مگسل از ختمِ رُسل ایّامِ خویش
تکیہ کم کن بر فن و بر گامِ خویش

یعنی اے مسلمان! اپنی ذاتی قابلیت اور استطاعت پر اعتماد مت کر بلکہ ہر وقت اور ہر حال میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ حسنہ کو مدِ نظر رکھ۔

اے بیٹے! مسلماں کی فطرت سراپا شفقت ہے اور اس کا وجود دُنیا کے لیئے سراسر رحمت ہے۔

اگر تجھ میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا عکس جلوہ گر نہیں ہے، تو پھر تو حضورؐ کی اُمت میں شامل نہیں ہو سکتا۔

اگر تُو مسلمان ہے تو یہ کوشش کر کہ تیرا شمار مسلمانوں میں ہو۔ اگر تو مسلمان ہے تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کی صحبت اختیار کر، تاکہ تیرے اندر بھی وہی رنگ پیدا ہو جائے۔

بلبل کو دیکھ وہ ہمیشہ باغ میں رہتی ہے اور گلوں پر نثار ہوتی ہے۔ وہ کبھی زاغ و زغن کی صحبت اختیار نہیں کرتی۔ عقاب کو دیکھ وہ کبھی سمندر کی مچھلیوں کو اپنا ہمنشین نہیں بناتا۔

اگر ماحول ناسازگار ہو تو زندگی اپنے مقام کو حاصل نہیں کر سکتی پس اگر تو مسلمان ہے تو اسلامی ماحول اختیار کر، تاکہ تجھ پر اسلام کا رنگ چڑھ سکے۔

دُوسرا ابتدار:۔ کہتے ہیں کہ اگر تم آب نیساں (وہ بارش جو موسم بہار کے آغاز یعنی آخر مارچ اور آغاز اپریل میں ہوتی ہے) کے ایک قطرہ کو باغ میں لیجا کر کسی غنچہ میں محفوظ (ڈپازٹ) کر دو۔ اور ہر ممکن طریق سے اس کی پرورش کرو لیکن وہ قطرہ کبھی ہرگز موتی نہیں بن سکتا۔ تمہاری ساری کوشش بیکار (سراب) ثابت ہوگی۔ اگر تم چاہتے ہو کہ وہ قطرہ موتی بن جائے، تو اسے کسی صدف کے اندر رکھو۔

آبِ نیساں کا جو قطرہ سمندر سے دُور (مہجور) ہو جائے گا وہ اسی طرح ضائع ہو جائے گا جس طرح شبنم کا قطرہ باغ سے دُور ہو کر ضائع ہو جاتا ہے،

اے بیٹے! جس طرح قطرۂ آبِ نیساں، سمندر سے مہجور ہو کر بیکار ہو جاتا ہے بلکہ اپنی ہستی کو کھو دیتا ہے۔ اُسی طرح مسلمان اگر سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے دُور ہو جائے، تو انسانیت کے نقطۂ نظر سے بے قدر و قیمت ہو جائے گا۔

تو مسلمان (آبِ نیساں) ہے، اس لئے حضورؐ کا دامن مضبوط پکڑ لے۔ تا کہ دُنیا میں آفتاب سے بھی زیادہ منور ہو سکے اور ہمیشگی کی زندگی حاصل کر سکے۔

نوٹ:۔ اقبالؔ نے اسی نکتہ کو جاوید نامہ میں یوں بیان کیا ہے:۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو   آنکہ از خاکش بروید آرزو

یا ز نورِ مصطفےٰؐ او را بہا ست   یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰؐ است

بات یہ ہے کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو شانیں ہیں۔ آپؐ آدم بھی ہیں، اور جوہرِ آدم بھی ہیں۔ جیسا کہ اقبالؔ خود کہتے ہیں:۔

عبدہٗ از فہم تو بالاتر است

زانکہ او ہم آدم وہم جوہر است

یعنی آپ آدم بھی ہیں اور مرکزِ آدمیت بھی ہیں۔ اس لئے انسان (آدمی) اپنے مرکز سے جس قدر زیادہ نزدیک ہوگا، اُسی قدر اُس میں آدمیت کا رنگ زیادہ نمایاں ہوگا۔ اور جتنا دُور ہوتا جائے گا اُتنا ہی بے قیمت ہوتا جائے گا۔ اور "انجام کار" کالانعام" کے دائرہ میں داخل ہو جائے گا۔

در معنیٔ این کہ حیاتِ ملیہ مرکزِ محسوس میخواہد

قومی زندگی کی بقا کے لئے مرکزِ محسوس ضروری ہے

و مرکزِ ملتِ اسلامیہ بیت الحرام است

می کشائم عقدہ از کارِ حیات سازمت آگاہ اسرارِ حیات
چوں خیال از خود رمیدن پیشہ اش از جہت دامن کشیدن پیشہ اش
در جہانِ دیر و زود آید چساں؟ وقتِ او فردا و دی زاید چساں؟
گر نظر داری یکے بر خود نگر جز رم پیہم نہ اے بیخبر
تا نماید تاب نامشہود خویش شعلۂ او پردہ بند از دودِ خویش
سیر او را تا سکوں بیند نظر موجِ جویش بستہ آید در گہر
آتشِ او دم بخویش اندر کشید لالہ گردید و ز شاخے بردمید
فکرِ خام تو گراں خیز است و لنگ تہمتِ گِل بست بر پروازِ رنگ
زندگی مرغِ نشیمن ساز نیست طائرِ رنگ است و جز پرواز نیست
در قفس واماندہ و آزاد ہم با نواہا می زند فریاد ہم
از پرش پرواز شوید دمبدم چارہ خود کرد جوید دمبدم
عقدہا خود می زند در کارِ خویش باز آساں می شود در کارِ خویش
پا بگل گردد حیاتِ تیز گام تا دو بالا گردد ذوقِ خرام

ساز ہا خوابیدہ اندر سوزِ او
دوش و فردا زادۂ امروزِ او

دمبدم مشکل گر و آسان گذار
دمبدم نو آفرین و تازہ کار

گرچہ مثلِ بو سراپائش رم است
چون وطن در سینۂ گیرد دم است

رشتہ ہائے خویش را بر خود تند
تکمہ گردد گرہ بر خود زند

در گرہ چون دانہ دارد برگ و بر
چشم بر خود وا کند گردد شجر

خلعتے از آب و گلِ پیدا کند
دست و پا و چشم و دل پیدا کند

خلوت اندر تن گزیند زندگی
انجمن ہا آفریند زندگی

ہمچنان آئینِ میلادِ اُمم
زندگی بر مرکزے آید بہم

حلقہ را مرکز چو جان در پیکر است
خطِ او در نقطۂ او مضمر است

قوم را ربط و نظام از مرکزے
روزگارش را دوام از مرکزے

راز دار و رازِ ما بیت الحرم
سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرم

چون نفس در سینۂ او پروریم
جانِ شیرین است او ما پیکریم

تازہ رو بستانِ ما از شبنمش
مزرعِ ما آب گیر از زمزمش

تاب دار از ذرہ ہایش آفتاب
غوطہ زن اندر فضایش آفتاب

دعوی اورا دلیل استیم ما
از براہینِ خلیلؑ استیم ما

در جہان ما را بلند آوازہ کرد
با حدوثِ ما قدم شیرازہ کرد

ملتِ بیضا ز طوفش ہم نفس
ہمچو صبحِ آفتاب اندر قفس

از حسابِ او یکی بسیار ہست
پختہ از بندِ یکی خود دار ہست

توز پیوندِ حریمے زندہ ۂ تا طوافِ او کنی پائندہ ۂ
در جہاں جانِ امم جمعیت است در نگر سرِّ حرم جمعیت است
عبرتے اے مسلمِ روشن ضمیر از مآلِ اُمّتِ موسیٰؑ بگیر
داد چوں آں قوم مرکز را ز دست رشتۂ جمعیتِ ملّت شکست
آنکہ بالید اندر آغوشِ رسل جزوِ او دانندۂ اسرارِ کُل
دہر سیلی بر بناگوشش کشید زندگی خوں گشت از چشمش چکید
رفت نم از ریشہ ہائے تاکِ او بیدِ مجنوں ہم نروید خاکِ او
از گلِ غربت زباں گم کردۂ (۱) ہم نوا ہم آشیاں گم کردۂ
شمع مُرد و نوحہ خواں پروانہ اش مشتِ خاکم لرزد از افسانہ اش
اے ز تیغِ جورِ گردوں خستہ تن اے اسیرِ التباس و وہم و ظن
پیرہن را جامۂ احرام کن صبح پیدا از غبارِ شام کن
مثلِ آبا غرق اندر سجدہ شو آنچناں گم شو کہ یکسر سجدہ شو
مسلمِ پیشیں نیازے آفرید تا بہ نازِ عالم آشوبے رسید

در رہِ حق پا بہ نوکِ خار خست
گلستاں در گوشۂ دستار بست

---

(۱) از گلِ غربت: یعنی غربت کی وجہ سے۔ ۱۲

(فصل شانزدہم)

تمہید:۔ اس فصل میں اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ قومی زندگی کی بقا کے لئے کسی ایسے مرکز کا وجود ضروری ہے، جو خارج میں بھی موجود ہو، یعنی ایسا مرکز جو حواسِ خمسہ سے محسوس ہو سکے۔ مثلاً آنکھوں سے نظر آسکے۔

اقبال نے اس مسئلہ کو اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ جس کی تشریح ذیل میں درج کروں گا۔ اس جگہ اتنی صراحت کافی ہے کہ مرکز محسوس کی ضرورت اس لئے لاحق ہوتی ہے کہ دنیا کی ہر قوم کی اکثریت (اور مسلمانوں کی قوم اس سے مستثنیٰ نہیں ہے) ان افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو ذہنی اعتبار سے بلند پایہ نہیں ہوتے۔ یعنی خالص تجریدی تصورات سے اُن کے دل و دماغ کی تسکین نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ان میں یکجہتی اور یک نگاہی پیدا کرنے کے لئے کسی ایسی چیز کا وجود لازمی ہے، جو آنکھوں سے نظر آسکے، تاکہ وہ اسے اپنی توجہ کا مرکز بنا سکیں۔ لہذا شارع علیہ السلام نے خانہ کعبہ (بیت الحرام) کو ملتِ اسلامیہ کا مرکز قرار دیا۔

اس فصل میں دو بند ہیں۔ پہلے بند میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ "حیات" کیا ہے۔ دوسرے بند میں اس بات کو واضح کیا ہے کہ حیاتِ ملی کسے کہتے ہیں۔ اور وہ کیونکر پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد بیت الحرام کی حقیقت بیان کی ہے۔

چونکہ یہ فصل اس کتاب کے مشکل مقامات میں سے ہے اس لئے

میں ہر شعر کا مطلب جداگانہ بیان کروں گا:۔

(۱) کہتے ہیں کہ اے مخاطب! میں تجھ کو حیات کے اسرار سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ ان کو سمجھ لینے کے بعد تو حیاتِ ملی کے مفہوم سے واقف ہو سکے۔

واضح ہو کہ اقبالؔ نے اس شعر میں یہ نہیں کہا کہ میں حیات کی ماہیت یا حقیقت بیان کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ بات انسان کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہے۔ حیات تو بڑی چیز ہے انسان کائنات کی کسی شئی کی ماہیت سے بھی آگاہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ آیۂ قرآنی شاہد ہے:۔

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا۔

کہ اے لوگو! تم کو علم نہیں دیا گیا مگر بہت تھوڑا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت تھوڑا علم دیا ہے۔ اس لئے اس کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ وہ ہر مسئلہ میں ایک خاص مقام تک پہنچ کر رک جاتا ہے۔ مثلاً حکماء نے انسان کی ماہیت منطقی اعتبار سے یہ بیان کی ہے کہ وہ حیوانِ ناطق ہے، لیکن اگر ہم اس تعریف پر غور کریں تو معلوم ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے بلکہ ہماری الجھن میں اضافہ ہو گیا۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ اب ہم یہ سوال کریں گے کہ حیوان کی ماہیت کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حیوان نام ہے "جسم نامی متحرک بالارادہ" کا۔ اب چار سوالات پیدا ہو گئے:۔

(۱) جسم کسے کہتے ہیں یا جسم کی ماہیت کیا ہے؟

(۲) نمو کسے کہتے ہیں یا نمو کی ماہیت کیا ہے؟

(۳) حرکت کسے کہتے ہیں یا حرکت کی ماہیت کیا ہے ؟

(۴) ارادہ کسے کہتے ہیں یا ارادہ کی ماہیت کیا ہے ؟

ان سوالات کے ساتھ پانچویں سوال کا بھی اضافہ کر لیجئے کہ

(۵) نطق کسے کہتے ہیں یا نطق کی ماہیت کیا ہے ؟

اب ارادہ کی تعریف بیان کیجئے کہ ارادہ، روح یا نفسِ ناطقہ کی صفات میں سے ایک صفت ہے تو سوال یہ ہو گا کہ روح کیا ہے۔ یہاں پہنچ کر سائل اور مجیب دونوں خاموش ہو جائیں گے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ حیوانِ ناطق کہہ کر ہم انسان کی ماہیت سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح حیات ایک حقیقت ہے جس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کی ماہیت کیا ہے؟ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں۔

ع راز ایں پردہ نہانست و نہاں خواہد بود

اس لئے اقبال نے یہ کہا کہ میں تجھ کو حیات کے اسرار یعنی ان آثار سے آگاہ کرتا ہوں جن کو انسانی عقل سمجھ سکتی ہے۔

(۲) حیات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اسے کسی لحظہ قرار نہیں ہے وہ ہر آن منقلب ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ پابندِ جہات نہیں ہے یعنی مادی شئے نہیں ہے۔ یہ حیات حواتنی پر اسرار اور محیر العقول ہے کہ

صدیوں فلاسفی کی چناں و چنیں رہی
لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

اس دنیا میں کیسے ظاہر ہوتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تو کچھ عقل رکھتا ہے تو اپنی نفسی زندگی پر غور کر۔ شاید کچھ سراغ مل جائے۔ اگر تو ایسا

کرے گا تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تو "رم پیہم" کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ یعنی تجھ پر ہر لحظہ ذہنی کیفیات طاری ہوتی رہتی ہیں، تو ہر آن بدلتا رہتا ہے۔

(۵) زندگی بذاتِ خود تو نامشہود ہے، یعنی حواسِ خمسہ سے محسوس نہیں ہو سکتی۔ لیکن وہ چاہتی ہے کہ اپنی جھلک تجھے دکھائے، اس لئے وہ اپنے شعلہ کو اس کے دھوئیں کی وساطت سے محصور کر لیتی ہے۔

اقبال نے اس شعر میں شعلہ اور دود (دھواں) دو لفظ استعمال کئے ہیں۔ ان لفظوں کے انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ وہ فرد کے وجود کو ان لفظوں کی مدد سے سمجھانا چاہتے ہیں۔ جس طرح دھواں، شعلہ ہی کی ایک صورت ہے۔ اُس سے جدا نہیں ہے۔ اسی طرح مادہ بھی رُوح ہی کی ایک کثیف صورت کا نام ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس بات کو اپنے تاریخی خطبہ صدارت (۱۹۳۰ء) میں یوں بیان کیا ہے:۔

"اسلام کے نزدیک مادہ، رُوح کی اس شکل کا نام ہے، جس کا اظہار زمان و مکان کی قیود میں ہوتا ہے۔"

نیز "ضربِ کلیم" میں اسی نکتہ کو اس طرح واضح کیا ہے:۔

ارتباطِ حرف و معنی؟ اختلاطِ جان و تن
جس طرح اخگر قبا پوش اپنے پیراہن سے ہے

یعنی راکھ کیا ہے؟ اخگر ہی کی دوسری صورت ہے۔ کہیں باہر سے آ کر انگارے پر نہیں تھی ہے۔ اسی طرح جسم کیا ہے؟ روح ہی کی کثیف صورت ہے۔ کائنات میں دُوئی نہیں ہے۔ یہ دُنیا ایک وحدت ہے، یعنی روحانی دُنیا ہے۔ مادہ،

رُوح ہی کی ایک شکل ہے۔ اقبالؔ، وحدت کے علمبردار ہیں، دُوئی (ثنویت) سے سخت بیزار ہیں۔

ع زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک

نوٹ:۔ اقبالؔ کے اس نظریہ کا مبنیٰ یا اس کی اساس یہ ہے کہ وہ وحدۃ الوجود کے قائل ہیں۔ جس کی تشریح آسان لفظوں میں یہ ہے کہ موجوداتِ عالم کا وجود، ذاتی یا مستقل نہیں ہے بلکہ عارضی اور ہنگامی ہے۔ کوئی شئے بذاتِ خود موجود نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ تمام اشیاء کو حق تعالیٰ نے موجود کیا ہے۔ اس لئے موجود حقیقی تو صرف حق تعالیٰ ہی ہے۔ دیگر اشیاء بظاہر موجود دکھائی دیتی ہیں۔ اور جو عارف ہے وہ جانتا ہے کہ حقیقت ان تمام اشیاء کی عدم ہے، کیونکہ کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْہَہٗ۔ یعنی بجز ذاتِ خداوندی ہر شئے ہلاک ہونے والی ہے۔ اور یہ ہلاکت مستقبل میں وارد نہیں ہوگی۔ بلکہ کائنات کی ہر شئے ہر وقت معدوم ہے (کیونکہ اس کی حقیقت ہی عدم ہے۔) اشیائے کائنات جو موجود نظر آرہی ہیں، یہ اس لئے اور محض اس لئے کہ وہ اصلِ وجود یعنی ذاتِ واجب الوجود سے مربوط ہیں۔ اگر یہ رابطہ ایک لمحہ کے لئے بھی منفک ہوجائے تو کائنات اسی طرح معدوم ہوجائے گی، جس طرح فلم کی حرکت رک جانے سے پردۂ سیمیں سے تصاویر معدوم ہوجاتی ہیں۔

قصہ مختصر کائنات کا وجود، حقیقی نہیں ہے بلکہ مجازی ہے، اس لئے یہ قول کہ بجز ذاتِ باری کے اور کوئی شئے موجود نہیں ہے، بالکل درست ہے۔ یہی اقبالؔ کا مسلک ہے۔ چنانچہ وہ اسی کتاب کے اندر خود لکھتے ہیں:۔

بر سرِ ایں باطلِ حق پیرہن
تیغِ لَا موجود اِلَّا ھُو بزن

یعنی اے مسلمان! یہ دنیا دراصل باطل ہے، لیکن بظاہر حق نظر آتی ہے۔ یعنی دراصل معدوم ہے بظاہر موجود نظر آتی ہے۔ پس تو اس باطل کے سر پر "لاموجود اِلَّا اللہ" کی تلوار مار کر اسے فنا کر دے۔

اب ناظرین خود فیصلہ کر لیں کہ اقبالؔ اپنے وجودی ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کونسا ثبوت پیش کر سکتے تھے؟

تاکہ انسان، حیات کی روانی (سیر) کو سکون کی حالت میں دیکھ سکے۔

(۶) حیات نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اپنے آپ کو مادہ میں محصور کر لیا ہے یا

(۷) مادیات کا پابند بنا لیا ہے۔ یعنی حیات بواسطۂ مظاہر مادی ظاہر ہوتی ہے۔ اقبالؔ نے اس کی دو مثالیں دی ہیں:۔

(۱) موتی کیا ہے؟ جواب دیتے ہیں کہ موتی دراصل جوئے حیات کی ایک موج ہے، جو صدف میں بند (بستہ) ہو گئی ہے۔

(ب) لالہ کیا ہے؟ جواب دیتے ہیں کہ لالہ دراصل آتشِ حیات کا ایک شعلہ ہے جو شاخ میں بصورتِ گل ساکن ہو گیا ہے۔

(۸) اے انسان! تیری عقل کوتاہ بین ہے، حقیقت سے آشنا نہیں ہے، مظاہر پرستی میں گرفتار ہے، اس لئے تو نے غلطی سے پروازِ رنگ و بُو کو گُل سمجھ لیا ہے۔ جسے تو گُل کہتا ہے، یہ دراصل رنگ ہے جو ہر لحظہ پرواز کر رہا ہے یعنی متحرک ہے۔

(۹) اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی کی خاصیت ہی یہ ہے کہ اسے قرار نہیں ہے، وہ ہر لحظہ متغیر ہوتی رہتی ہے اقبال نے اس حقیقت کو اس طرح واضح کیا ہے کہ زندگی اُس مُرغ کی مانند ہے جو ہر وقت اڑتا رہتا ہے، نہ کہیں نشیمن بناتا ہے، اور نہ کہیں قرار پذیر ہوتا ہے۔ بالفاظِ دگر زندگی، مرورِ خالص یا انقلابِ مسلسل یا رمِ پیہم یا پروازِ غیر مختتم کا نام ہے۔

اقبال نے اس نکتہ کو اپنی تمام تصانیف میں مختلف طریقوں سے واضح کیا ہے۔ چنانچہ دو تین شعر اس جگہ درج کرتا ہوں:-

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

زندگی جز لذتِ پرواز نیست
آشیاں با فطرتِ او ساز نیست

زندگی جز قوتِ اعجاز نیست
ہر کسے دانندۂ ایں راز نیست

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

(۱۰) حیات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ مقید بھی ہے، آزاد بھی ہے۔

اس حقیقت کو انہوں نے اسی کتاب میں قبل ازیں ...... یوں بیان کیا ہے۔

فطرتش آزاد و ہم زنجیری است
جزو او را قوتِ کُل گیری است

اقبال کا مطلب یہ ہے کہ حیات، بتقاضائے ذاتِ خویش (جس کی لِم کسی کو معلوم نہیں ہے) کیفیات متضادہ کی حامل ہے۔ وہ آزاد بھی ہے، مقید بھی ہے۔ اس میں سوز بھی ہے ساز بھی ہے۔ نور بھی ہے نار بھی ہے۔ ناز بھی ہے نیاز بھی ہے۔ جلال بھی ہے جمال بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

ع بالواہا می زند فریاد ہم

یعنی اگر وہ نغمہ سُناتی ہے تو فریاد بھی کرتی ہے۔

(۱۱) حیات کی فطرت میں چونکہ مذکورہ بالا دو شانیں پائی جاتی ہیں، اس لئے وہ بذاتِ خود اپنے آپ کو مقید کرتی رہتی ہے، اور پھر اُن قیود کو خود ہی ہٹاتی ہے یا مٹاتی رہتی ہے۔

ازپرِ خویش پرواز می شوید — یعنی خویش را مقید می سازد
چارۂ خود کردہ می جوید — یعنی باز خویشتن را آزاد می سازد

(۱۲) حیات اپنی راہ میں خود مشکلات پیدا کرتی رہتی ہے اور پھر خود ہی انھیں دُور بھی کرتی رہتی ہے۔

(۱۳) وہ اپنے آپ کو دشواریوں میں اس لئے مبتلا کرتی رہتی ہے کہ اُن دشواریوں سے مخلصی حاصل کرنے کے لئے جدو جہد کرسکے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ سعیٔ پیہم اور جہدِ مسلسل، حیات کی خصوصیت ہے۔ یعنی حیات اُس پہلوان کی طرح ہے۔

جو شیر سے کشتی لڑتا ہے۔ تاکہ اپنی طاقت کا امتحان کر سکے۔

(۱۴) حیات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے سوز میں ساز کا رنگ پوشیدہ ہے۔۔ یعنی وہ مجموعۂ اضداد ہے۔ عقل کا تقاضا تو یہ ہے کہ سوز سے ساز نہیں نکل سکتا۔ کیونکہ ساز، سوز کی ضد ہے۔ اور دو یا زیادہ ضدیں ایک شئے میں مجتمع نہیں ہو سکتیں (الضدان لا یجتمعان) لیکن حیات تو منطق کے قوانین اور عقل کی دسترس سے بالاتر ایک حقیقت ہے۔ وہ کیفیات متضادہ کی حامل ہے۔ چنانچہ قبل ازیں اقبال نے اسی حقیقت کو یوں واضح کیا ہے۔

خویش دارد خویش باز و خویش ساز
ناز ہا می پرورد اندر نیاز

جس طرح اس کے سوز میں ساز کا رنگ پوشیدہ ہے، اُسی طرح اُس کے ناز میں نیاز کا جلوہ مخفی ہے۔ اور جلال میں جمال کی شان مضمر ہے۔

ہیگل لکھتا ہے کہ منطق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ادنیٰ جو کتابوں میں مندرج ہے، جس کی رُو سے اجتماعِ ضدین محال ہے۔ دوسری اعلیٰ، جو حیات کے مظاہر میں نظر آتی ہے۔ مثلاً جو لینا چاہتا ہے، اُسے دینا چاہیئے۔ جو جینے کا آرزومند ہے، اُسے مرجانا چاہیئے اور سب سے دلکش مثال اُس نے یہ دی ہے، جو ۱۹۱۷ء سے آج تک لوحِ دل پر مرتسم ہے۔ نصب العین (آئیڈیل) کا حصول ہر وقت ہوتا رہتا ہے اور کبھی نہیں بھی ہوتا۔ The ideal is ever within reach

کیونکہ اگر نصب العین حاصل ہو جائے & never within reach.

تو پھر وہ نصب العین ہی کہاں رہا؟

اقبالؔ نے بھی اس ہیگلین آئیڈیلیزم کو اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں یوں بیان کیا ہے:۔

تو نشناسی ہنوز، شوقِ بمیرد ز وصل

چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام

اِسی حقیقت کو انہوں نے گلشنِ راز میں اس طرح واضح کیا ہے:۔

ع فراقِ عاشقاں عینِ وصال است

(۱۶) اگرچہ حیات ہر اپا رم ہے یعنی) ایک سیلانی کیفیت کا نام ہے، (۱۷) جیسے کسی گھڑی قرار یا سکون نہیں ہے لیکن یہی حیات جب کسی حیوان کے جسم سے وابستہ ہو جاتی ہے تو "رم" کے بجائے "دم" بنجاتی ہے۔ اور جس طرح ریشم کا کیڑا اپنے آپ کو اپنے تاروں میں محصور کر لیتا ہے، اسی طرح حیات اپنے آپ کو جسم کی چار دیواری میں محدود کر لیتی ہے۔

(۱۸) بات یہ ہے کہ حیات اپنا لباس (جسم) اپنی ذات میں اسی طرح پوشیدہ رکھتی ہے، جس طرح برگ و بار (پتے اور پھل) خود تخم کے اندر مستور ہوتے ہیں۔

(۱۹) حیات، اپنے لئے، آب و گِل (پانی اور مٹی) سے لباس (جسم) تیار کر لیتی ہے، (۲۰) رفتہ رفتہ اس جسم میں اعضا رنمود ہو جاتے ہیں۔

اس طرح زندگی فرد کی شکل میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور بہت سے افراد کے مجموعہ سے انجمن (جماعت) وجود میں آجاتی ہے۔

دوسرا بند:۔ (۱) جس طرح فرد پیدا ہوتا ہے، اسی طرح قومیں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ یعنی قوموں کی تخلیق میں بھی وہی قانون کارفرما ہے، جو فرد کی تخلیق میں۔

وہ یہ کہ جب

(۱) زندگی کسی قالب میں جلوہ گر ہوتی ہے تو فرد موجود ہو جاتا ہے۔

(ب) وہی زندگی (بصورتِ افراد) جب کسی مرکز پر مجتمع ہو جاتی ہے تو قوم وجود میں آجاتی ہے۔ بالفاظِ دگر

(۱) زندگی جب کسی تن سے مربوط ہو جاتی ہے تو اُسے فرد کہتے ہیں۔

(ب) وہی زندگی جب کسی مرکز سے وابستہ ہو جاتی ہے تو اُسے قوم سے تعبیر کرتے ہیں۔

(۲) حلقہ کی ہستی، مرکز یعنی نقطہ کے وجود پر موقوف ہے۔ اس کے لئے مرکز کی وہی حیثیت ہے جو جسم کے لئے جان کی۔ اگر نقطہ (مرکز) نہ ہو تو خط (دائرہ) موجود نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ کھنچ ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح اگر مرکز نہ ہو تو قوم موجود ہی نہیں ہو سکتی۔ اور جس طرح خط نقطہ میں مضمر ہوتا ہے، اُسی طرح قوم، مرکز میں مستور ہوتی ہے۔

(۳) مرکز ہی سے قوم میں ربط اور نظام پیدا ہوتا ہے، اور مرکز ہی سے قوم کو دوام اور استحکام حاصل ہوتا ہے۔ اگر مرکز نہ ہو تو قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔ اسی نکتہ کو اقبال نے جاوید نامہ میں یوں بیان کیا ہے:-

مُردۂ از یک نگاہی زندہ شو
بگذر از بے مرکزی، پائندہ شو

اسی حقیقت کو ضربِ کلیم میں یوں واضح کیا ہے:-

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جُدائی
ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے؟ خُدائی

چونکہ میں رموزِ بیخودی کی شرح لکھ رہا ہوں، نہ کہ مسلمانِ عالم کے زوال کی تاریخ۔ اس لئے صرف اس فقرہ پر اکتفا کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے بحیثیت قوم فنا ہو جانے کا باعث ہی یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی اتنی وسیع اور عریض زمین میں ان کا کوئی مرکز نہیں ہے۔ لے

اللہ تعالیٰ نے بیت الحرام کو ان کا مرکز بنایا تھا۔ لیکن انھوں نے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اپنا تعلق اپنے مرکز سے ہمیشہ کے لئے منقطع کر لیا۔ اس کا نتیجہ سبھوں کے سامنے موجود ہے۔ صدیوں سے "مسلماناں در گور و مسلمانی در کتاب" والا معاملہ ہے۔

راقم الحروف کو مسلمانوں کے زوال کا اس قدر افسوس نہیں ہے، جس قدر اس بات کا کہ ایک عرصہ سے مسلمانوں کی ذہنیت اس درجہ مسخ ہو چکی ہے کہ جو شخص انہیں دوبارہ مرکز سے وابستگی پیدا کرنے کی دعوت دیتا ہے، وہ ان کی نظر میں کافر اور واجب القتل قرار پاتا ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اب اصلاحِ حال کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔ اِلّا اینکہ یہ قوم صفحہ ہستی سے مٹا دی جائے۔ اور اس کی جگہ دوسری قوم ملت کی جانشین یا نمائندہ ہو۔ چنانچہ قرآنِ حکیم نے اس آیت میں اسی طرف اشارہ کیا ہے:-

یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ۔

لے کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ ان کا مرکز روز بروز امریکہ کی توجہاتِ خصوصی کا مرکز بنتا جا رہا ہے ۱۲۔

اے مسلمانوں! اگر تم اللہ کی نافرمانی کرو گے، تو وہ تمہاری جگہ دُوسری قوم پیدا کر دے گا۔ اور وہ لوگ تمہاری طرح (نافرمان) نہیں ہوں گے۔

(۴) اب یہاں سے اقبالی تصوریت کا آغاز ہوتا ہے۔ یعنی اقبالؔ وہ باتیں بیان کرتے ہیں، جن پر ہمیں عمل کرنا چاہیئے۔ لیکن نہ ہم ان پر عمل کرتے ہیں، اور نہ اس کے لئے آمادہ ہیں۔

کہتے ہیں کہ اے مسلمانوں! بیت الحرام (خانۂ کعبہ) جو ہمارا مرکز ہے، یہ ہمارا راز بھی ہے اور راز دار بھی ہے۔ یعنی یہ مرکز ہماری زندگی بھی ہے اور باعثِ قیامِ زندگی بھی ہے۔ اقبالؔ نے یہاں لفظِ راز کو حقیقت یا زندگی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

نیز اسی بیت الحرام کی بدولت ہمارے اندر سوز و ساز کی صفت ہے۔ یعنی جلال اور جمال کی شان پائی جاتی ہے۔

واضح ہو کہ اقبالؔ نے اپنے کلام میں، ناز و نیاز اور سوز و ساز کی ترکیب بکثرت استعمال کی ہے اور مضامین کی مناسبت سے مختلف معانی مراد لئے ہیں۔ میں ان سب معانی کا استقصار تو اس جگہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کے لئے ایک مستقل مقالہ درکار ہے۔ لیکن ناظرین کی آگاہی کے لئے وہ بنیادی نکتہ بیان کئے دیتا ہوں جس پر یہ ترکیبیں مبنی ہیں، اور جس کو مدِ نظر رکھنے سے ان کا مفہوم بآسانی متعین ہو سکتا ہے۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ اقبالؔ توحید کے علمبردار ہیں، جو اس کلمۂ طیبہ میں مذکور ہے:۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ۔ اس کلمہ کے دُو جُزء ہیں:۔

لَآ اِلٰہَ اور اِلاَّ اللّٰہُ۔

اِس کے بعد اقبال کے اس شعر پر غور کیجیے:۔

نکتہ می گویم از مردانِ حال
اُمتاں را لَاجلال اِلاَّ جمال

یعنی لَآ اِلٰہَ سے انسان میں جلال اور اِلاَّ اللّٰہ سے جمال کا رنگ پیدا ہوتا ہے۔

اِس کے بعد اس شعر پر غور کیجیے:۔

زیستن با سوزِ او قہاری است
لَآ اِلٰہَ ضرب است و ضربِ کاری است

یعنی لَآ اِلٰہَ سے سوز اور اِلاَّ اللّٰہُ سے ساز کا رنگ پیدا ہوتا ہے، نیز وہ کہتے ہیں کہ لَآ اِلٰہَ سے قہاری کی شان بھی پیدا ہو جاتی ہے، تو لازمی طور سے اِلاَّ اللّٰہُ سے غفاری کی شان پیدا ہو گی۔ نیز وہ کہتے ہیں کہ جب ایک انسان لَآ اِلٰہَ کہتا ہے، یعنی کائنات میں کوئی اِلٰہَ نہیں ہے یعنی مجھ سے برتر کوئی ہستی نہیں ہے، تو اس میں تکبر (ناز) کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے لیکن جب وہ اس منزل سے آگے بڑھتا ہے اور اِلاَّ اللّٰہ کہتا ہے۔ یعنی اپنے سے برتر ہستی کا اقرار کرتا ہے تو قدرتی طور سے اس کے اندر عاجزی (نیاز) کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

نیز وہ کہتے ہیں کہ جب ایک انسان لَآ اِلٰہ کہتا ہے تو اس میں فکر کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن جب وہ اِلاَّ اللّٰہ کہتا ہے تو اس میں ذکر کی صفت پیدا ہو جاتی ہے۔

اِن تمام تصریحات کو مدِّ نظر رکھنے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ اقبالؔ کے کلام میں سوز، ناز، جلال، فکر اور قہاری یہ پانچوں کلمۂ توحید کے پہلے جزو یعنی لَآ اِلٰہ کی مختلف مگر قریب المعنی تعبیریں ہیں۔ ان میں مابہ الامتیاز تو یہ ہے کہ ان کا محلِ استعمال مختلف ہے، اور مابہ الاشتراک یہ ہے کہ یہ سب ایک ہی درخت کے برگ و بار ہیں۔

اسی طرح ساز، نیاز، جمال، ذکر اور غفاری یہ پانچوں اسی کلمۂ توحید کے دُوسرے جزء یعنی اِلَّا اللہ کی مختلف تعبیریں ہیں۔

جیسا کہ پہلے واضح کر چکا ہوں، یہ موضوع تفصیل کا محتاج ہے، میں نے اس جگہ اس کو مجمل طریق پر لکھ دیا ہے، تاکہ ناظرین کو یہ معلوم ہو سکے کہ میں نے اس شعر میں سوز و ساز سے جلال اور جمال کیوں مراد لیا ہے۔

(۵-۶-۷) یہی وجہ ہے کہ ہمیں بحیثیت مُسلم، بیت الحرام سے بے اندازہ عقیدت اور محبّت ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ ہمارے لئے بمنزلۂ رُوح ہے، اور ہم اس کے لئے بمنزلۂ پیکر ہیں۔ اگر ہم بیت الحرام سے اپنا تعلق منقطع کر لیں تو ہم جسدِ بے رُوح کا مصداق ہو جائیں گے، بلاشبہ ہمارا باغ اُسی کی شبنم کی بدولت تر و تازہ ہے، یعنی ہم مسلمان اُسی کے فیض سے زندہ ہیں۔ اور ہمارے آفتاب (قوم) میں اُسی کی بدولت چمک پائی جاتی ہے۔

(۸) ہمارا وجود اس کے دعویٰ پر دلیل ہے یعنی بیت الحرام دُنیا میں بیت اللہ کے لقب سے مشہور ہے، یعنی اللہ کا گھر۔ پس بیت اللہ سے ثابت ہوا کہ اللہ ہے اور یہ دعویٰ ہے اور ہمارا وجود اس دعویٰ پر دلیل ہے۔ یعنی ہم اُس اللہ پر ایمان لاتے ہیں

جس اللہ کی ہستی کا بیت اللہ مدّعی ہے۔

اَب رہا ہمارا وجود، تو یہ حضرت ابراہیمؑ کا مرہونِ منت ہے، یعنی ہم کو یہ مرتبہ کہ ہم توحیدِ الٰہی پر دلیل بن سکے۔ حضرت ابراہیمؑ کی بدولت حاصل ہوا۔

اس شعر میں اقبالؔ نے تین باتیں بیان کی ہیں:۔

(ا) بیت اللہ، توحیدِ الٰہی کا مدّعی (علمبردار) ہے۔

(ب) ہم مسلمانوں کا وجود، اس دعویٰ پر دلیل ہے۔

(ج) ہمارا وجود، حضرت ابراہیمؑ کی کوششوں کا ثمرہ ہے، یعنی انہوں نے اس دعویٰ پر جو براہین پیش کیں، اُن میں سے ایک بُرہان ہمارا وجود ہے۔ اگر دنیا میں حضرت ابراہیمؑ کا وجود نہ ہوتا، تو ہم بھی موجود نہ ہوتے۔

(۹) بیت الحرام نے دُنیا میں ہم کو معزز کر دیا، اور ہمارے حدوث کو قدم سے وابستہ کر دیا یعنی ہم کو ہمیشگی عطا کر دی۔

(۱۰) اس کے گرد طواف کرنے کی بدولت ملّتِ بیضا میں ہم نفسی، ہم آہنگی، یک جہتی، یک رنگی یعنی اجتماعیت کی شان پیدا ہو گی۔ ہم اسی طرح ایک مرکز پر مجتمع ہو گئے جس طرح کوئی شخص دھوپ (صبحِ آفتاب) کو جو ساری کائنات میں پھیلی ہوئی ہے، کسی ایک مقام میں مجتمع کر دے۔

(۱۱) اے مسلمان! اسی کی بدولت تیری کثرت میں وحدت کی شان پیدا ہو گئی ہے، اور اس وحدت کی بدولت تیری خودی میں پختگی کا رنگ نمودار ہو گیا۔

واضح ہو کہ اس نکتہ کو اقبالؔ قبل ازیں ثابت کر چکے ہیں کہ جب تک فرد، ملت (وحدت) سے وابستہ نہ ہو، اس کی خودی مستحکم (پختہ) نہیں ہو سکتی۔ اِسی

نکتہ کو انہوں نے اِس مصرع میں بیان کر دیا ہے۔

(۱۲) اے مسلمان! تو بیت الحرام سے ربط کی بنا پر ہی زندہ ہے، یہ رابطہ ہی تیری زندگی کا باعث ہے، اور اس کا طواف کرتے رہنے ہی سے تیری زندگی برقرار رہ سکتی ہے۔ یعنی

راز دارو رازِ ما بیت الحرام

(۱۳) کہتے ہیں کہ جمعیت یا وحدتِ فکر ہی اس دُنیا میں قوموں کی زندگی کا سبب ہے۔ پس اے مسلمان! تُو اِس بات پر غور کر کہ حرمِ کعبہ کی حقیقت یہ ہے کہ وہ مسلمانوں میں وحدتِ فکر پیدا کر سکتا ہے۔

نوٹ: جمعیت کے تین معنی ہیں (۱) جماعت کی شان (۲) وحدتِ فکرو نظر (۳) اطمینانِ قلب۔

اس کے بعد یہودیوں کی زندگی سے عبرت حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ جب سے اس قوم نے اپنے مرکز سے اپنا تعلق منقطع کر لیا، اُس وقت سے یہ قوم وحدتِ ملی کی نعمت سے محروم ہے۔ اس قوم نے انبیاء کی آغوش میں پرورش پائی، یعنی اس میں پے در پے انبیاء مبعوث ہوئے۔ اور ہر نبی اسرارِ زیست یعنی زندگی بسر کرنے کے قوانین سے آگاہ تھا۔ اس لئے یہ قوم بھی علم و حکمت سے آراستہ تھی۔ لیکن جب اس پر انقلاب آیا تو زندگی وبالِ جان ہو گئی۔ رفتہ رفتہ یہ قوم مرکز سے بیگانہ ہو کر، اکنافِ عالم میں منتشر ہو گئی۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ یہ قوم اپنی زبان اور اپنے تمدن اور اپنے وطن سب چیزوں سے محروم ہے۔ غریب الوطن ہو جانے کی وجہ سے

یہ قوم اپنی زبان سے بھی بیگانہ ہو گئی۔

یہود کی مادری زبان عبرانی تھی، لیکن جب یہ قوم منتشر ہوئی تو جس ملک میں گئی وہیں کی زبان بولنے لگی۔ مثلاً بمبئی کے یہودی گجراتی بولتے ہیں، جرمنی کے یہودی جرمن، اور انگلستان کے یہودی انگریزی۔

اے مسلمان! تو بھی جورِ فلک سے خستہ تن ہو گیا ہے، اور تیرے ایمان میں ضعف پیدا ہو گیا ہے۔ اسی لئے تو اوہامِ باطلہ اور خیالات فاسدہ میں گرفتار ہے۔ اگر تو دوبارہ ترقی کرنا چاہتا ہے تو اپنے دل میں از سرِ نو کعبہ کی محبت پیدا کر۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق استوار کر لے۔ تیرے آباء واجداد نے پہلے اپنے اندر نیاز کی شان پیدا کی تھی۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے محبت کی تھی۔ اس کا صلہ بارگاہِ ایزدی سے یہ ملا۔ کہ وہ دُنیا میں سربلند ہو گئے۔

اقبالؔ کا فلسفہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مقامِ محبوبی (ناز) حاصل کرنا چاہتا ہے، تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ مشربِ عاشقی (نیاز) اختیار کرے۔ یعنی پہلے خود اللہ تعالیٰ سے محبت کرے۔ اس کا ثمرہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُسے دُنیا میں مقامِ محبوبی عطا فرمائے گا۔ یعنی وہ دوسروں پر حکمراں ہو جائے گا۔

خلاصۂ کلام اینکہ اگر تکبّر (ناز) سے زندگی کی ابتدا کرو گے تو مردود ہو جاؤ گے۔ لیکن اگر عاجزی (نیاز) سے ابتداء کرو گے تو محبوب بن جاؤ گے۔

در معنیٔ این کہ جمعیتِ حقیقی از محکم گرفتنِ نصب العینِ ملیہ است و نصب العینِ اُمّتِ محمدیہ حفظ و نشرِ توحید است

با تو آموزم زبانِ کائنات / حرف و الفاظ است اعمالِ حیات
چون ز ربطِ مدعائے بستہ شد / زندگانی مطلعِ برجستہ شد
مدّعا گردد اگر مہمیزِ ما / ہمچو صرصر می رود شبدیزِ ما
مدّعا رازِ بقائے زندگی / جمعِ سیمابِ قوائے زندگی
چون حیات از مقصدے محرم شود / ضابطِ اسبابِ این عالم شود
خویشتن را تابعِ مقصد کند / بہرِ او چیند گزیند رد کند
ناخدا رائم روی از ساحل است / اختیارِ جادہ ہا از منزل است
بر دلِ پروانہ داغ از ذوقِ سوز / طوفِ او گردِ چراغ از ذوقِ سوز
قیس اگر آوارہ در صحراستے / مدّعایش محملِ لیلاستے
تا بود شہر آشنا لیلائے ما / بر نمی خیزد بصحرا پائے ما
ہمچو جاں مقصود پنہاں در عمل / کیف و کم از وے پذیرد ہر عمل
گردشِ خونے کہ در رگہائے ماست / تیز از سعیٔ حصولِ مدّعاست
از تفِ او خویش را سوزد حیات / آتشے چوں لالہ اندوزد حیات
مدّعا مضرابِ سازِ ہمت است / مرکزے کو جاذبِ ہر قوت است

دست و پائے قوم را جنباند او | یک نظر صد چشم را گرداند او
شاہدِ مقصود را دیوانہ شو | با الفِ ایں شمع چوں پروانہ شو
خوش نوائے نغمہ سازے زخمہ زد است | (۱) زخمہ بر معنی برابر نیشتر زد است
تا کشد خار از کفِ پا رہ سپر | می شود پوشیدہ محمل از نظر

گر بقدرِ یک نفس غافل شدی
دُور صد فرسنگ از منزل شدی

ایں کہن پیکر کہ عالم نام اوست | (۲) ز امتزاجِ امہات اندام اوست
صد نیستاں کاشت تا یک نالہ رست | صد چمن خوں کرد تا یک لالہ رست
نقشہا آورد و افگند و شکست | تا بہ لوحِ زندگی نقشِ تو بست
نالہ ہا در کشتِ جاں کاریدہ است | تا نوائے یک اذاں بالیدہ است
مدتے پیکار با احرار داشت | با خداوندانِ باطل کار داشت
تخمِ ایماں آخر اندر گِل نشاند | بازبانت کلمۂ توحید خواند
نقطۂ ادوارِ عالم لا الٰہ | انتہائے کارِ عالم لا الٰہ
چرخ را از زورِ او گردندگی | مہر را پایندگی رخشندگی
بحر گوہر آفرید از تابِ او | موج در دریا در تپید از تابِ او

---

(۱) زخم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد
(ملک قمی)

(۲) امتزاج امہات یعنی عناصر کا اختلاط۔

خاک از موجِ نسیمش گل شود — مشتِ پر از سوزِ او بلبل شود
شعلہ در رگہائے تاک از سوزِ او — خاکِ مینا تابناک از سوزِ او
نغمہ ہایش خفتہ در سازِ وجود — جویدت اے زخمہ ور سازِ وجود
صد نوا داری چو خوں در تن رواں — خیز و مضرابے بہ تارِ او رساں
زانکہ در تکبیر رازِ بودِ تست — حفظ و نشرِ لا الٰہ مقصودِ تست
تا نہ خیزد بانگِ حق از عالمے — گر مسلمانی نیاسائی دمے
می ندانی آیۂ اُمّ الکتاب — (۱) اُمّتِ عادل ترا آمد خطاب
آب و تابِ چہرۂ ایامِ تو — در جہاں شاہد علی الاقوام تو
نکتہ سنجاں را صلائے عام دہ — از علومِ اُمّیئے پیغام دہ
اُمّیئے پاک از ہویٰ گفتارِ او (۲-۳) — شرحِ رمزِ ما غویٰ گفتارِ او
تا بدست آورد نبضِ کائنات — وا نمود اسرارِ تقویمِ حیات
از قبائے لالہ ہائے ایں چمن — پاک شست آلودگیہائے کہن
در جہاں وابستہ دینش حیات — نیست ممکن جز بآئینش حیات
اے کہ می داری کتابش در بغل — تیز تر نہ پا بہ میدانِ عمل
فکرِ انساں بت پرستے بتگرے — ہر زماں در جستجوئے پیکرے

---

(۱) وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَاءَ عَلَی النَّاسِ ط

(۲) وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ۱۲

(۳) مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی ۱۲

باز طرحِ آذری انداخت است — تازہ تر پروردگارے ساخت است

کاید از خوان ریختن اندر طرب — نام او رنگ است و ہم ملک و نسب

آدمیت کشتہ شد چوں گوسفند — پیشِ پائے ایں بتِ ناار جمند

اے کہ خوردستی زمینائے خلیل — گرمیِ خونت زصہبائے خلیل

بر سرِ ایں باطلِ حق پیرہن — تیغ لاموجود الّا ھو بزن

جلوہ در تاریکیٔ ایام کن — (۱) آنچہ بر تو کامل آمد عام کن

لرزم از شرمِ تو چوں روزِ شمار — پُرسدت آں آبروئے روزگار

حرفِ حق از حضرتِ ما بردہٗ
پس چرا با دیگراں نسپردہٗ

(فصل ہفتدہم)

تمہید:۔ اس فصل میں اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ جب تک ملتِ اسلامیہ کا ہر فرد، ملی نصب العین کے حصول کے لئے انتہائی جدّ و جہد نہ کرے، اُس وقت تک جمعیتِ حقیقی (وحدتِ ملی) پیدا نہیں ہوسکتی۔ اور توحید کی حفاظت اور اشاعت، ملتِ محمدیہ کا نصب العین (مقصودِ حیات) ہے۔

---

(۱) الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی۔

اقبال کے نزدیک، ملت عبارت ہے اُن افراد سے جن میں وحدت افکار و کردار پائی جائے۔ یہ وحدت اُسی وقت پیدا ہو سکتی ہے، جب تمام افراد کسی ایک نصب العین پر (خواہ وہ وطن ہو یا اللہ) متفق ہو جائیں اور متفق ہونے کے بعد ہر فرد، بلا استثنائے احدے، اس نصب العین کے حصول میں اس طرح منہمک ہو جائے کہ زن، زر اور زمین، یہ تینوں طاقتیں مل کر بھی اُسے اپنی طرف مائل نہ کر سکیں۔

یہاں تک تو ہر مسلمان اقبال سے متفق ہے لیکن جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ملتِ اسلامیہ کا نصب العین "تبلیغ و اشاعت اسلام" ہے، تو اُن کے اور ملت کے درمیان تصادم رونما ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مسلمان یہ کہتے ہیں کہ ممکن ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں تبلیغ و اشاعت اسلام کو نصب العین قرار دیا گیا ہو۔ لیکن موجودہ زمانہ میں ایسا کرنا قدامت پرستی یا رجعت پسندی کی دلیل ہے۔ چنانچہ مسلمانانِ عالم کا طرزِ عمل میرے اس قول پر شاہد عادل ہے۔ دیکھ لیجئے جاوا سے لے کر مراقش تک کسی اسلامی ملک نے تبلیغ و اشاعت اسلام کو ملت کا نصب العین قرار نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی اسلامی ملک میں اس کام کے لئے نہ کوئی ادارہ قائم ہے اور نہ کوئی جماعت سرگرم عمل ہے۔

سب سے زیادہ غور طلب بات یہ ہے کہ ارضِ حجاز اس قسم کی تمام تحریکوں سے پاک ہے۔ ہر سال تمام اسلامی ممالک سے لاکھوں مسلمان مکہ مکرمہ میں جمع ہوتے ہیں اور دنیا کا کوئی کام ایسا نہیں ہے جو وہاں نہ کرتے ہوں۔ عورتیں رات

دن "سوق سویقہ" میں سلک کریپ اور جارجیٹ خریدتی رہتی ہیں، اور صفا مروہ کے بازار سے سامانِ آرائش بطور سوغات اپنے ساتھ لے جاتی ہیں۔ مرد دن رات آبِ زمزم میں لٹھے کے تھان بھگوتے رہتے ہیں۔ اور کھجوروں کے صندوق بند کراتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر نہیں کرتے تو تبلیغ واشاعتِ اسلام کا کوئی انتظام یہ تو بڑی چیز ہے، دورانِ قیام میں، "تبلیغ اسلام" ان کا موضوعِ سخن ہی نہیں تھا۔

ساری دنیائے اسلام میں کہیں کوئی ایسی درس گاہ نہیں ہے جس میں مسلمانوں کو تبلیغ کے لئے تیار کیا جاتا ہو۔ جدید اصطلاح میں کہیں کوئی مشنری کالج نہیں ہے۔

اس لئے میں نے یہ بات غلط نہیں لکھی کہ اب اس باب میں ساری امت ایک طرف ہے اور اقبالؔ ایک طرف۔ چونکہ مسلمانوں نے تبلیغ واشاعت اسلام کو اپنی زندگی سے خارج کر دیا ہے۔ اسی لئے اکبرؔ الٰہ آبادی نے یہ شعر سپردِ قلم کیا تھا۔

سید اٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا

اس فصل میں دو بند ہیں۔ پہلے بند میں اقبالؔ نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ اگر کوئی قوم اپنا نصب العین متعین نہ کرے تو اس کی زندگی بے معنی ہو جائے گی۔ یعنی اس قوم کی زندگی اور حیوانوں کی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ دوسرے بند میں انہوں نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ مسلمان قوم کا نصب العین، تبلیغ واشاعتِ اسلام ہے۔

پہلا بند:۔ کہتے ہیں کہ انسانوں کی طرح کائنات کی بھی ایک زبان ہے لیکن فرق یہ ہے کہ انسانوں کی زبان، حروف اور الفاظ سے مرکب ہے۔ لیکن کائنات کی زبان، اعمالِ حیات (انسانوں کے اعمال)

سے عبارت ہے۔ یعنی الفاظ نہ ہوں تو کوئی انسان اپنے ما فی الضمیر کو ظاہر نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اعمال نہ ہوں تو کائنات (حیات) اپنے مقصد کو واضح نہیں کر سکتی۔

(۲) اگر زندگی کا مقصد متعین ہو جائے تو وہ مطلعٔ برجستہ یعنی بامعنی بن جاتی ہے۔

(۳) یعنی بے مقصد زندگی دراصل بے معنی (بیکار) زندگی ہوتی ہے۔ مدعا یا مقصد کی بدولت زندگی میں حرکت اور تیزی پیدا ہو جاتی ہے جس طرح مہمیز لگانے سے گھوڑا تیز دوڑنے لگتا ہے۔

(۴) زندگی کی بقا کا راز مقصد میں مضمر ہے۔ اسی کی بدولت زندگی کی تمام قوتیں ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہیں۔

(۵) جب انسان اپنی زندگی کا ایک مقصد متعین کر لیتا ہے تو یہ ساری کائنات اس کو منضبط اور مربوط نظر آنے لگتی ہے۔

ع ضابط اسباب این عالم شود

یہ بہت بلیغ مصرع ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ دنیا عالمِ اسباب ہے لیکن جو شخص اس دنیا میں بے مقصد زندگی بسر کرتا ہے وہ نہ ان اسباب (قوانین) کو سمجھ سکتا ہے اور نہ انہیں اپنے حصولِ مقصد کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔ اس کی زندگی حیوانوں کی طرح بسر ہوتی ہے۔ حیوانات اپنی زندگی کا کوئی مقصد متعین نہیں کر سکتے۔ اس لئے عناصرِ فطرت کے غلام ہوتے ہیں، لیکن انسانوں کو یہ طاقت عطا کی گئی ہے کہ اگر وہ اپنی زندگی کا کوئی مقصد معین کر لے تو اسباب

(عناصر فطرت یا قوانین) کو اپنا تابع فرمان بنا سکتا ہے۔ اور حصولِ مقصد کے لئے مناسب اسباب جمع کر سکتا ہے۔ اسباب بہم پہنچانے کی اس قدرت ہی کو اقبالؔ نے "ضابطِ اسبابِ ایں عالمِ نمود" سے تعبیر کیا ہے۔

اب وہ اس کو مثالوں سے واضح کرتے ہیں کہتے ہیں کہ

ناخدا کو دیکھو! وہ سمندر میں جہاز رانی اس لئے کرتا ہے کہ ساحل تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اس کی یم روی کا مقصد ساحل ہے۔

اسی طرح مسافر، جادہ (سڑک) کو اس لئے اختیار کرتا ہے کہ منزل تک پہنچنا چاہتا ہے۔

پروانہ کا مقصدِ حیات "سوز" ہے۔ اس لئے وہ شمع کا طواف کرتا رہتا ہے۔ قیس نے صحرا میں آوارگی اس لئے اختیار کی ہے کہ وہ محمل لیلیٰ کی تلاش میں ہے۔

اس کے بعد یہ نکتہ بیان کرتے ہیں کہ مقصود کے بغیر کوئی عمل ظہور پذیر نہیں ہو سکتا۔ مقصود، عمل میں اسی طرح پنہاں ہوتا ہے۔ جس طرح روح بدن میں۔ اور اسی مقصود سے ہر عمل کی قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ع "کیف و کم از وے پذیرد ہر عمل"

بہت بلیغ مصرع ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مقصد، عمل کے حسن و قبح کا معیار ہے۔ فرض کیجئے ایک شخص نے ایک مسکین کو دس روپے دیئے۔ اب اگر یہ سوال ہو کہ اس کا یہ عمل اچھا ہے یا بُرا؟ تو اس کا جواب مقصد سے مل سکتا ہے۔ اگر مقصد مسکین کی مدد کرنا ہے تو یہ عمل اچھا ہے۔

کے بعد عالم وجود میں آیا ہے۔ اسی پر باقی تمام اشیاء کو قیاس کر لیا جائے۔

ان ابتدائی اشعار کا مطلب یہ ہے کہ

(۱) عناصر کے امتزاج سے دنیا پیدا ہوئی۔

(۲) کچھ عرصہ کے بعد زندگی نمودار ہوئی۔

(۳) طویل مدت کے بعد حیوانات پیدا ہوئے۔

(۴) پھر انسان ظاہر ہوا۔

(۵) ایک مدت کے بعد اس نے بولنا سیکھا۔

(۶) گفتگو کے بعد نوشت و خواند کا مرحلہ آیا۔

(۷) اس کے علوم و فنون کا دور شروع ہوا۔

(۸) پھر مذہب کا تصور پیدا ہوا۔

(۹) کفر و اسلام کی آویزش کا آغاز ہوا۔

(۱۰) تخمِ ایماں آخر اندر گل نشاند۔

کائنات میں صدیوں تک اہلِ اسلام (احرار) اور اہلِ کفر کے درمیان پیکار کا سلسلہ قائم رہا ہے۔ ہر زمانہ میں فرعونوں اور نمرودوں نے توحیدِ الٰہی کو مٹانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن صدیوں بلکہ ہزاروں سال تک مصروفِ جنگ رہنے کے بعد اس عالم نے ایمان کا تخم تیرے دل میں بویا۔ یعنی توحیدِ الٰہی کا عقیدہ ابتدائے آفرینش سے اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ ابتداء میں انسان عناصر پرستی یا بت پرستی کرتا تھا۔ عرصہ دراز کے بعد توحید کی منزل تک پہنچا۔

اس کے بعد وہ توحید کی خصوصیات بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وہ کلمہ ہے جو اس کائنات کی ابتدا بھی ہے، اور انتہا بھی۔ آسمان اسی کلمۂ توحید کی بدولت گردش کر رہا ہے۔ اور آفتاب اسی کی بدولت چمک رہا ہے۔ اسی کی چمک سے موتی پیدا ہوتا ہے۔ اور اسی کی طاقت سے سمندر میں موجیں تڑپتی ہیں۔ اسی کی مہربانی سے مٹی، پھول کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے اور اسی کی کاریگری سے مٹھی بھر پر، بلبل کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ انگور کی بیل میں اُسی کے فیض سے ترو تازگی پیدا ہوتی ہے۔ اور اُسی کے سوز سے خاکِ مینا تابناک ہو جاتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو واحد لاشریک ہے، اس کائنات کا خالق، رازق، مُربّی اور منتظم ہے۔ اجرامِ فلکی کی حرکت، آفتاب میں درخشندگی، موتی میں آب و تاب، موجوں میں تپش، یہ سب اُسی کی کارفرمائی ہے۔ اُسی نے پھول پیدا کیے، اُسی نے بلبل پیدا کی، اُسی نے ہر قسم کے پھل پیدا کیے اور ہر شئے میں تاثیر ودیعت کی۔

اے مسلمان! کائنات میں ہر شئے کے اندر اللہ تعالیٰ نے کچھ خوبیاں مخفی کر دی ہیں۔ اب یہ تیرا کام ہے کہ تو اپنی عقل (زخمہ) کی مدد سے اُن مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور اس طرح کائنات پر حکمراں بن جائے۔

اے مسلمان! تجھے اللہ تعالیٰ نے اس لئے پیدا کیا ہے کہ تُو ساری کائنات کو توحید کا پیغام سُنائے۔ تیرے وجود کی علتِ غائی یہ ہے کہ تُو اس دُنیا کو نعرہ تکبیر سے معمور کر دے۔ اس لئے توحید کی حفاظت اور اشاعت ہی تیرا مقصودِ

حیات ہے اور یہی نیر النصب العین ہے۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی، تو اُٹھ! اور ساری دُنیا کو توحید کا پیغام سُنا۔ جب تک کائنات کے ہر گوشہ سے بانگِ حق (کلمۂ توحید) بلند نہ ہونے لگے، اُس وقت تک تو کمر نہیں کھول سکتا۔ آرام نہیں کر سکتا۔

یہ بات بیشک صحیح ہے۔ کیونکہ جب تک سپاہی میدانِ جنگ سے واپس نہیں آجاتا، وہ ایک لمحہ کے لئے بھی آرام نہیں کر سکتا۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان کو قرآن مجید میں اپنی فوج کا سپاہی قرار دیا ہے۔ ہر مسلمان مجاہد فی سبیل اللہ ہے، اور اس کا فرضِ منصبی یہ ہے کہ وہ دُنیا کو کفر اور شرک کی نجاست سے پاک کر دے یا اس کوشش میں اپنی جاں دیدے۔ ذیل میں وہ آیت نقل کرتا ہوں۔

سورۂ مجادلہ کے آخری رکوع میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم فرمایا ہے۔

(۱) وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کے دشمن ہیں (کافرین مشرکین اور منافقین) ان کا اصطلاحی نام "حزب الشیطان" ہے۔ یعنی شیطان کی فوج۔

(۲) وہ لوگ جو اللہ اور اُس کے رسولؐ کے دوست ہیں۔ اُن کا اصطلاحی نام "حزب اللّٰہ" ہے۔ یعنی اللہ کی فوج۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے اپنے دوستوں کی شناخت یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ کسی حال میں بھی اللہ اور اُس کے رسولؐ کے دشمنوں سے دوستی نہیں کر سکتے (چنانچہ ٹیپو سُلطان شہیدؒ نے اسی بنا پر انگریزوں سے دوستی نہیں کی)۔

(ب) اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اللہ کی فوج کامیاب ہوگی۔

اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (۵۸ : ۲۲)

اے لوگو! آگاہ ہو جاؤ، اور کان کھول کر سن لو کہ فلاح (کامیابی) اللہ ہی کے گروہ کو حاصل ہوگی۔

(ج) اگر دنیا کے مسلمان اس وقت "فلاح" سے ہمکنار نہیں ہیں تو ثابت ہو گیا کہ وہ "حزب اللہ" میں شامل نہیں ہیں، کیونکہ قرآن خدا کا کلام ہے، اس لئے اس میں غلطی کا امکان ہی نہیں ہے۔

اس کے بعد اقبال یہ کہتے ہیں کہ اے مسلمان! کیا تو نے قرآنِ مجید میں یہ آیت نہیں پڑھی؟

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۝

اور ہم نے تم کو ایک ایسی جماعت بنا دیا ہے، جو ہر پہلو سے نہایت اعتدال پر ہے تاکہ تم مخالفین کے مقابلہ میں توحید پر گواہی دو۔ (۲ : ۱۴۳)

تمام مفسرین نے اس آیت کا مطلب یہی بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ دنیا میں اسلام کی تبلیغ کریں۔

چونکہ "شہادت علی الناس" نے اُن کو ایک اُمت بنا دیا ہے، اس لئے دینِ اسلام ان کی قومیت کی بنیاد ہے۔ یعنی مسلمانوں کی قوم کسی ملک یا نسل یا رنگ کی بنیاد پر قائم نہیں ہوئی ہے، بلکہ یہ جماعت (اُمت) محض ایک دینی تقاضے کو پورا کرنے کے لئے عالمِ وجود میں آئی ہے۔ بالفاظِ دگر دینِ اسلام نے اس کو ایک قوم بنا دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ جماعت اس لئے بنائی ہے کہ رنگ، نسل، وطن اور زبان کے امتیازات سے بالاتر ہو کر ساری دنیا کو توحید کا پیغام سُنا سکے۔ اور کافروں کے مقابلہ میں حق کی گواہی دے سکے۔

اس قانون کی رُو سے حبشی اور امریکن، ایشیائی اور یوروپین، چینی اور جاپانی، ہندی اور ایرانی، اطالوی اور رُوسی۔ یہ تمام افراد جو کافروں کے مقابلہ میں توحید پر گواہی دیتے ہیں، ایک ہی جماعت (اُمّت) کے افراد ہیں، حالانکہ وطن، نسل، رنگ اور زبان کے اعتبار سے بالکل مختلف ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد نہ وطن ہے، نہ نسل نہ رنگ نہ زبان۔ بلکہ اسلام اور محض اسلام ہے۔

یہی بات محترمی ابوالکلام صاحب آزاد نے سنہ ۱۹۲۱ء میں کراچی کے مقدمہ میں نہایت دل نشین الفاظ میں بیان کی تھی۔ اور سچ یہ ہے کہ راقم الحروف سب سے پہلے آنجناب ہی کے "قولِ فیصل" کے مطالعہ کی بدولت اس حقیقت سے آگاہ ہوا تھا۔ اس کے بعد اقبال کے مطالعہ سے اس میں پختگی کا رنگ پیدا ہو گیا۔

پس اے مسلمان! تو دنیا کے تمام عقلاء اور حکماء کو اسلام کی دعوت دے اور نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کی نشر و اشاعت کا انتظام کر تاکہ سارا عالم ان سے رُوشناس بلکہ فیضیاب ہو سکے۔

بیشک آپؐ اُمّی ہیں۔ لیکن کیسے اُمّی ہیں؟ آپؐ نے نہ کسی انسان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور نہ کسی درس گاہ میں تعلیم حاصل کی۔ یہ تو بالکل

صحیح ہے۔ لیکن آپ نے اللہ تعالیٰ سے براہِ راست علم حاصل کیا۔ چنانچہ حسبِ ذیل آیت اس پر شاہد ہے:۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝

اے لوگو! یہ تمہارے ساتھ کے رہنے والے (صلی اللہ علیہ وسلم) نہ تو راہِ حق سے بھٹکے، اور نہ غلط راستہ پر ہوئے۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ آپ جو کچھ تعلیم دیتے ہیں، اس میں آپ کی نفسانی خواہش کو کوئی دخل نہیں ہے کیونکہ آپ کے ارشادات تمام تر اس وحی پر مبنی ہیں جو آپ پر بھیجی جاتی ہے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بنی آدم کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا ہے، اس لئے جب آپ نے تبلیغ شروع فرمائی (نبضِ کائنات پر ہاتھ رکھا) تو زندگی کی بقا اور اس کے استحکام کے سارے طریقے واضح طور پر بیان فرما دیئے، اور کفر اور شرک کی تمام صورتوں (آلودگیہائے کہن) یعنی برائیوں اور خرابیوں سے انسان کو آگاہ فرمادیا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ دنیا میں حیات صرف آپ کے پیش کردہ دین سے وابستہ ہے، جو درحقیقت آئینِ حیات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کامیاب زندگی اسی وقت بسر کرسکتا ہے جب آپ کے لائے ہوئے آئین پر عمل کرے۔

اقبال کا مسلک یہ ہے کہ اسلام کسی خاص قوم یا نسل یا خطہ یا ملک یا جماعت یا گروہ کا دین نہیں ہے، بلکہ "دینِ حیات" ہے۔ نیز دینِ اسلام محض رسم کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ زندگی کا قانون ہے۔

اے مسلمان! چونکہ تو حاملِ قرآن ہے، اس لئے سب کام چھوڑ کر تبلیغ و اشاعتِ اسلام کی طرف متوجہ ہو جا۔ اس وقت کام کی ضرورت اس لئے بھی بہت شدید ہو گئی ہے کہ اس دور میں فکرِ انسانی نے لوگوں کی پرستش کے لئے ایک نیا بُت تیار کیا ہے، بلکہ ایک نیا معبود وضع کیا ہے۔ جس کا "وطن" ہے۔ اور اُسے رنگ، نسل، ملک اور نسب سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ بُت سخت خونریز ہے اور خونریزی سے خوش ہوتا ہے۔ اس کی بدولت ایک قوم دوسری قوم کی دشمن بن گئی ہے۔

اے مسلمان! تو حضرت ابراہیمؑ کی تعلیم کا وارث ہے، یعنی دنیا میں توحیدِ الٰہی کا علمبردار ہے۔ اس لئے اُٹھ اور اس باطل عقیدہ کو جو حق کے لباس میں ظاہر ہوا ہے، فنا کر دے۔ یعنی اس کے مقابلہ میں یہ تعلیم پیش کر کہ لَا مَوجُودَ اِلَّا اللّٰہ۔ [1]

---

[1] اس تلقین سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وحدۃ الوجود کا اسلامی عقیدہ اقبالؔ کے دماغ سے کبھی بھی محو نہیں ہوا۔ یہی بات جو انہوں نے ۱۹۱۸ء میں کہی تھی، وہ آخر عمر تک کہتے رہے، صرف ایک شعر لکھتا ہوں:-

از ضمیرِ کائنات آگاہ اوست
تیغِ لَا مَوجُودَ اِلَّا اللّٰہ اوست

(مسافر ۱۹۳۴ء)

در معنیٔ این کہ توسیعِ حیاتِ ملیہ از تسخیرِ قوائ

نظامِ عالم کی قوتوں کو مسخر کرنے سے حیاتِ ملّی میں وسعت پیدا ہو سکتی ہے ،

نظامِ عالم است

اے کہ با نادیدہ پیماں بستہٴ — ہمچو سیل از قیدِ ساحل رستہٴ
چوں نہال از خاکِ ایں گلزار خیز — دل بغائب بند و با حاضر ستیز
ہستیٔ حاضر کند تفسیرِ غیب — می شود دیباچہ تسخیرِ غیب
ماسوا از بہرِ تسخیر است و بس — (۱) سینہٴ او عرضہٴ تیر است و بس
از کُنِ حق ماسوا شد آشکار — تا شود پیکانِ تو سنداں گداز
رشتہٴ باید گرہ اندر گرہ — (۲) تا شود لطفِ کشودن را فرہ
غنچہٴ؟ از خود چمن تعمیر کن — شبنمی؟ خورشید را تسخیر کن
از تو می آید اگر کارِ شگرف — از دمے گرمے گداز ایں تیرہ برف
ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد — عالمے از ذرّہٴ تعمیر کرد
آنکہ تیرش قدسیاں را سینہ خست — اوّل آدم را سرِ فتراک بست
عقدہٴ محسوس را اوّل کشود — ہمّت از تسخیرِ موجود آزمود
کوہ و صحرا دشت و دریا بحر و بر — تختہٴ تعلیمِ اربابِ نظر

(۱) عرضہ : نشانہ۔ (۲) فرہ : باعث۔

اے کہ از تاثیرِ افیوں خفتۂ ۔ عالمِ اسباب را دوں گفتۂ
خیز و وا کن دیدۂ مخمور را ۔ دوں مخواں ایں عالمِ مجبور را
غایتش توسیعِ ذاتِ مسلم است ۔ امتحانِ ممکناتِ مسلم است
می زند شمشیرِ دوراں بر تنت ۔ تا بہ بینی ہست خواں اندر تنت
سینہ را از سنگِ زورے ریش کن ۔ امتحانِ استخوانِ خویش کن
حق جہاں را قسمتِ نیکاں شمرد ۔ جلوہ اش با دیدۂ مومن سپرد
کارواں را رہگزار است ایں جہاں ۔ نقدِ مومن را عیار است ایں جہاں

گیر او را تا نہ او گیرد ترا
ہمچو مے اندر سبو گیرد ترا

دُلدُلِ اندیشہ ات طوطی پرست ۔ آں کہ گامش آسماں پہنا ور است
احتیاجِ زندگی میراندش ۔ بر زمیں گردوں سپر گرداندش
تا ز تسخیرِ قوائے ایں نظام ۔ ذوفنونیہائے تو گردد تمام
نائبِ حق در جہاں آدم شود ۔ بر عناصر حکمِ او محکم شود
تنگی ات پہنا پذیرد در جہاں ۔ (۱) کارِ تو اندام گیرد در جہاں
خویش را بر پشتِ باد اسوار کن ۔ یعنی ایں جمازہ را مہار کن
دستِ رنگیں کن ز خونِ کوہسار ۔ جوئے آبِ گوہر از دریا برآر
صد جہاں در یک فضا پوشیدہ اند ۔ مہرہا در ذرہ ہا پوشیدہ اند

---

(۱) اندام گرفتن کار یعنی آراستہ شدن کار - ۱۲

از شعاعش دیدہ کن نادیدہ را — وانما اسرارِ نافہمیدہ را
تابش از خورشید عالمتاب گیر — برقِ طاق افروز از سیلاب گیر
ثابت و سیارۂ گردوں وطن — آں خداوندانِ اقوامِ کہن
ایں ہمہ اے خواجہ آغوشِ تواند (۱-۲) — پیش خیزد حلقہ در گوشِ تواند
جستجو را محکم از تدبیر کن — انفس و آفاق را تسخیر کن
چشمِ خود بکشا و در اشیا نگر — نشّہ زیرِ پردۂ صہبا نگر
تا نصیب از حکمتِ اشیا برد — ناتواں باج از توانایاں خورد
صورتِ ہستی ز معنی سادہ نیست — ایں کہن ساز از نوا افتادہ نیست
برق آہنگ است ہشیارش زنند — خویش را چوں زخمہ بر تارش زنند
تو کہ مقصودِ خطابِ انظری — پس چرا ایں راہ چوں کوراں بری
قطرۂ کز خود فروزی محرم است — بادہ اندر تاک و بر گل شبنم است
چوں بدریا در رود گوہر شود — جوہرش تابندہ چوں اختر شود
چوں صبا بر صورتِ گلہا متن — غوطہ اندر معنیٔ گلزار زن
آنکہ بر اشیا کمند انداخت است — مرکب از برق و حرارت ساخت است
حرف چوں طائر بہ پرواز آورد (۳) — نغمہ را بے زخمہ از ساز آورد

---

(۱) آغوش، لونڈی کنیز ۱۲
(۲) پیش خیزہ: خدمتگار ۱۲
(۳) مرزا غالب بہ تغیرِ الفاظ ۱۲

اے خرت لنگانے رہِ دشوارِ زیست
غافل از ہنگامہ پیکارِ زیست
ہمرہانت پے بہ منزل بُردہ اند
لیلیٔ معنی ز محمل بُردہ اند
تو بصحرا مثلِ قیس آوارۂ
خستۂ واماندۂ بیچارۂ

علمِ اسما[1] اعتبارِ آدم است
حکمتِ اشیا حصارِ آدم است

(فصل پنجم)

اس فصل میں دو بند ہیں۔ پہلے بند میں اقبالؔ نے مسلمان کو اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ غایتِ تخلیقِ عالم یہ ہے کہ انسان اُسے یعنی اُس کی قوتوں کو مسخر کرے۔ تاکہ اس پر حکمراں ہو سکے۔ دوسرے بند میں انہوں نے مسلمان کو تسخیرِ کائنات کی دعوت دی ہے اور یہ بتایا ہے کہ جن قوموں نے کائنات کو مسخر کرلیا ہے، وہ آج دُنیا میں عزت کی زندگی بسر کررہی ہیں اور مسلمان خستہ ہیں، آوارہ ہیں، مجبور ہیں، بیچارہ ہیں، ذلیل ہیں، واماندہ ہیں۔

پہلا بند:۔ کہتے ہیں کہ اے مسلمان! تو نے "یُؤمِنُونَ بِالْغَیْبِ" پر عامل ہو کر اُس خدا کی ہستی کا اعتراف کیا ہے جو آنکھ سے نظر نہیں آتا۔ اس لئے

(۱) وعلّم آدم الاسماء

تجھ میں بے اندازہ طاقت پیدا ہو گئی ہے یعنی تو ایک سیلِ بے پناہ بن گیا ہے اس لئے تو مردانہ وار اٹھ اور کائنات (حاضر) سے برسرِ پیکار ہو جا۔ تاکہ تو فتح حاصل کر کے اس پر حکومت کر سکے۔ مرکزی خیال تو یہی ہے، اسی کو انہوں نے آخر تک واضح کیا ہے۔

کائنات (حاضر کی ہستی، غیب (خدا) کے وجود پر دلالت کرتی ہے۔ اور اگر تو اس کائنات کو مسخر کر لے تو تجھ میں تسخیر غیب کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔ یعنی تو اپنے اندر صفاتِ ایزدی کا عکس پیدا کر سکے گا۔

واضح ہو کہ اقبالؔ نے تسخیرِ یزداں کو مسلمان کا نصب العین قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

"تسخیرِ یزداں" اقبالؔ کی اصطلاح ہے، جو انہوں نے اپنے مرشد سے مستعار لی ہے۔ چنانچہ مولینا کہتے ہیں:

بزیر کنگرۂ کبریاش مردانند
فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

تسخیرِ یزداں سے عارفِ رومی اور مریدِ ہندی دونوں کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان پر فرض ہے کہ اپنے اندر یزدانی صفات کا رنگ پیدا کرے۔ اسی طرف حدیثِ ذیل اشارہ کرتی ہے:

تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہ۔

یعنی اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی صفات پیدا کرو۔ یہ حدیث اس آیت کی تفسیر ہے :۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً۔

اے مسلمانو! تم دنیا والوں سے کہہ دو کہ ہم نے تو اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگین کر لیا ہے۔ اور اللہ کے رنگ سے بہتر کونسا رنگ ہو سکتا ہے۔ اس آیت میں رنگ سے صفات مراد ہیں۔ یعنی اپنے اندر ایزدی صفات کا رنگ پیدا کرو۔

کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات اس لئے پیدا کی ہے کہ انسان اُس کو مسخر کرے، تاکہ وہ اسے اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکے۔ لیکن تسخیر کرنے کے لئے اُسے سخت جدوجہد کرنی ہو گی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے کائنات (ماسوی) میں انسان کی تمام ضروریات پوشیدہ (گرہ اندر گرہ) کر دی ہیں۔ اب اس کا فرض یہ ہے کہ وہ ان کو تلاش کرے، تاکہ اس تلاش میں خود انسان کے اندر جو قوتیں مخفی ہیں، وہ ظاہر ہو سکیں۔

اس بات کو اقبالؒ نے "لطفِ گرہ کشودن" سے تعبیر کیا ہے۔

اے انسان! بظاہر تو ایک کمزور ہستی (غنچہ یا شبنم) ہے۔ لیکن تجھ میں یہ قوت موجود ہے کہ اگر تو اُس سے کام لے، تو بلاشبہ تو اس کائنات کو مسخر کر سکتا ہے۔

تُو بظاہر غنچہ ہے، لیکن اگر تُو غور سے دیکھے، تو معلوم ہو گا تیری ذات میں خود سارا چمن پوشیدہ ہے۔ تُو بظاہر شبنم ہے لیکن تجھ میں یہ قوت مخفی ہے

کہ تو آفتاب کو مسخر کر سکتا ہے۔

یوں کہنے کو غنچہ، باغ کا ایک ادنیٰ یا حقیر سا جز ہے۔ لیکن انسان ایسا غنچہ ہے کہ اگر اپنی قوتوں کا صحیح استعمال کرے تو اپنی ذات سے چمن تعمیر کر سکتا ہے۔ اسی طرح وہ کہنے کو قطرۂ شبنم ہے۔ لیکن ایسا قطرہ ہے کہ آفتاب میں جذب ہو جانے کے بجائے خود آفتاب کو اپنے اندر جذب کر سکتا ہے۔

ع آنکہ تیرش قدسیاں را سینہ ساخت

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص عالمِ روحانی کو مسخر کرنا چاہتا ہے تو اسے لازم ہے کہ پہلے عالمِ مادی کو مسخر کرے۔ اللہ تعالیٰ نے کوہ و صحرا، دشت و دریا، بحر و بر۔ ان تمام مظاہر کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ انسان ان کو مسخر کر کے نائبِ حق کا مرتبہ حاصل کرے۔

اس کے بعد اقبال مسلمانوں کو اس گمراہی سے نکالتے ہیں جس میں وہ ایک عرصہ سے گرفتار ہو گئے ہیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ ظہورِ اسلام سے پہلے دنیا میں جس قدر مشہور مذاہب موجود تھے۔ مثلاً ہندو دھرم، جین دھرم، بودھ دھرم اور نصرانیت سب کی تعلیم یہ تھی کہ یہ دنیا ناپاک ہے، اور انسان کی روحانی ترقی میں حارج ہے، اس لئے اس کو ترک (تیاگ) کر دینا چاہیئے، اور اس سے کوئی تعلق قائم نہیں کرنا چاہیئے، اس کو اصطلاح میں ویراگ کہتے ہیں۔ اسی تیاگ اور ویراگ کے فلسفہ سے رہبانیت پیدا ہوئی، جو تمام قدیم مذاہب میں کم و بیش موجود تھی۔ (اور اب بھی ہے۔)

اس فلسفہ کی بنیاد اس بات پر ہے کہ یہ دنیا بری ہے یا ناپاک ہے۔

یا اس کی تعمیر میں ایسی بدی مضمر ہے کہ اس کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اس خیال کو فلسفہ میں قنوطیت (Pessemiesm) کہتے ہیں۔

بودھ دھرم نے کہا کہ سنسار سراسر دکھ ہے۔

جین دھرم نے کہا کہ سنسار ایک قید خانہ ہے۔

یہی تعلیم ہندو دھرم نے دی کہ شریر (جسم) آتما (روح) کے لئے ایک بندھن ہے۔ نصرانیت نے بھی فاسٹیسزم کی تعلیم سے متاثر ہو کر دنیا کو ناپاک قرار دیا ہے۔ ان تمام مذاہب نے مادہ کو بدی کا سرچشمہ اور ناپاک قرار دیا ہے۔ اسی لئے انسان کا مقصدِ حیات "موکش" یا مخلصی ہے۔ یہ لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انسان، دنیا میں آکر گرفتارِ بلا ہو گیا ہے۔ اور اس کا نصب العین یہ ہے کہ وہ کسی طرح مادہ سے رہائی حاصل کر لے۔ اسی لئے ان مذاہب نے ترکِ دنیا (تیاگ) کی تعلیم دی۔ اور تیاگ کے لئے ویراگ کو شرطِ اول قرار دیا۔

اسلام مذاہبِ عالم میں پہلا نظامِ حیات ہے جس نے ان تمام غلط خیالات کا ابطال کیا۔ وجہ یہ ہے کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ دین ہے۔ یعنی زندگی کا قانون۔ اس نے یہ تعلیم دی کہ یہ دنیا نہ تو سراسر دکھ ہے، نہ ناپاک ہے، نہ بدی کا سرچشمہ ہے۔ بلکہ اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ انسان اس کو مسخر کر کے اپنا خادم بنائے۔ اور اس کو اپنے اور بنی آدم کے فائدوں کے لئے استعمال کرے۔ یعنی اقبال کے الفاظ میں یہ عالم "امتحانِ ممکناتِ مسلم" ہے۔ اسی لئے قرآن نے مکتی کے بجائے فلاح کو انسان کا نصب العین قرار دیا ہے۔

ترکِ دنیا (رہبانیت) کے غلط تصور کو اقبال نے "افیون" سے تعبیر کیا ہے۔

اے کہ از تاثیرِ افیوں خفتۂ
عالمِ اسباب را دوں گفتۂ

یعنی اے مسلمان! تو نے غیر اسلامی تصوّرات قبول کر لئے، اس لئے تو بھی ترکِ دُنیا کی طرف مائل ہو گیا۔ خوابِ غفلت سے بیدار ہو جا۔ اس عالمِ مجبور کو ناپاک مت سمجھ اور ناپاک سمجھنے کی وجہ سے ترکِ عالم کا مسلک اختیار مت کر۔ یہ عالم تیاگ دینے کے لائق نہیں ہے۔ بلکہ تسخیر کرنے کے لئے ہے۔

اس کی غایت (تخلیق کی علّت) یہ نہیں کہ تو اس سے قطع تعلّق کر لے۔ بلکہ یہ ہے کہ تُو اسے مسخر کرے اور اس طرح اپنی ذات میں وسعت پیدا کرے۔ یعنی یہ دُنیا اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ تو اپنی مخفی طاقتوں (ممکنات) کا امتحان کر سکے۔

اقبالؔ نے عالم کو مجبور قرار دیا ہے، اس میں نکتہ یہ ہے کہ

(۱) اللہ تعالیٰ مختارِ مطلق ہے۔

(۲) عالم مجبورِ مطلق ہے۔

(۳) مجبور بھی ہے اور مختار بھی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے مجبور ہے لیکن کائنات کے سامنے مختار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے یہ اختیار عطا کیا ہے کہ اگر وہ اس کے قانون (قرآنِ حکیم) کی اطاعت کرے تو اس کائنات کو مسخر کر سکتا ہے۔ اس کی تخلیق اس نہج پر ہوتی ہے کہ وہ جس قدر اللہ کی اطاعت کرے گا، اُسی قدر اُس میں کائنات کو مسخر کرنے کا اختیار پیدا ہو گا۔ یہ مطلب ہے اس مصرع کا۔

ع "می شود از جبر، پیدا اختیار"

اے مسلمان! اس نکتہ کو یاد رکھ کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو اپنے نیک بندوں (عباد الصالحین) کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس لئے مومن ہی اس دنیا کی خوبیوں سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ یہ دُنیا نقدِ مومن کے لئے عیار ہے۔ یعنی مومن اس کی بدولت اپنے ایمان کو پرکھ سکتا ہے۔ یعنی وہ جس قدر اسے مسخر کر سکتا ہے، اُسی قدر اس کا ایمان کھرا ہو گا۔ پس تو ہمت کر اور اس جہان کو مسخر کر۔ اگر تو ایسا نہیں کرے گا۔ تو یاد رکھ! یہ جہان تجھ کو مسخر کر لے گا۔ یعنی تو مرتبۂ نیابتِ الٰہیہ سے گر جائے گا۔ اور " کالانعام بل ھم اضل" کا مصداق بن جائے گا اسی خیال کو اقبال نے یوں ادا کیا ہے:۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے!
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

نوٹ:۔ چونکہ مسلمانوں نے اللہ کی اطاعت سے مونہہ موڑ لیا۔ اس لئے وہ تسخیرِ کائنات سے قاصر ہو گئے۔ اور چونکہ وہ اسے مسخر نہ کر سکے اس لئے قانونِ الٰہی کے مطابق وہ خود مسخر ہو گئے۔ چنانچہ آج تمام دنیا کے مسلمان دُنیا کے غلام ہیں یعنی دوسروں کے محکوم ہیں۔ شیخ سعدیؒ نے کیا خوب لکھا ہے:۔

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ
کہ گردن نہ پیچد ز حکمِ تو ہیچ

دوسرا بند:۔ اے مخاطب! اس حقیقت پر غور کر کہ تیرے اندیشہ کا

گھوڑا (تیری قوتِ غور و فکر) نہایت تیز رفتار ہے۔ اس میں اتنی طاقت ہے کہ اس کا ایک قدم زمین پر اور دوسرا قدم آسمان پر ہوتا ہے (خیال سے زیادہ تیز رفتار کوئی شئے اس کائنات میں نہیں ہے) اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت (جس سے تمام حیوانات محروم ہیں) تجھے اسی لئے عطا فرمائی ہے کہ تو اس کی بدولت نظامِ عالم کی قوتوں کو مسخر کر کے نیابتِ الٰہیہ کے مرتبہ پر فائز ہو سکے۔

جب آدم نائبِ حق بن جاتا ہے تو عناصرِ کائنات پر حکمراں ہو جاتا ہے۔ پس تو ہوا، آگ، پانی اور مٹی کو مسخر کر۔ کوہساروں میں جا کر تحقیقات کر کہ ان کے اندر کیا کیا چیزیں پوشیدہ ہیں؟ دریاؤں اور سمندروں میں سے موتی نکال۔ نئی نئی کانیں (معادن) دریافت کر۔ نئی نئی چیزیں ایجاد کر

اگر ہو سکے تو آفتاب کی شعاعوں کو مسخر کر اور ان کی حرارت کو اپنے فائدہ کے لئے استعمال کر۔ اے مخاطب! یہ تمام اجرامِ سماوی، جو اقوامِ کہن کے معبود رہ چکے ہیں، یہ سب تیرے خادم اور غلام ہیں۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار ند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

پس تو ہمت سے کام لے اور تدبیر سے اپنی جستجو میں کامیابی حاصل کر۔ یاد رکھ کہ مسلمان کی حیثیت سے تیرا فرضِ منصبی یہ ہے کہ تو انفس اور آفاق دونوں کو مسخر کر لے۔

انفس سے عالمِ صغیر یعنی ذاتِ انسانی مراد ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے چھوٹے پیمانے پر انسان کی ذات میں وہ تمام چیزیں پوشیدہ کر دی ہیں جو کائنات میں پائی

جاتی ہیں۔ اس لئے انسان کو عالم صغیر کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی اور قدرت کی نشانیاں جس طرح کائنات میں موجود ہیں اسی طرح خود انسان کی ذات میں بھی مخفی ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم پہلے اپنے نفس پر اور اس کی کیفیات میں غور کریں۔

وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ؟

ہم نے اپنی ہستی کی نشانیاں خود تمہارے اندر پوشیدہ کر دی ہیں۔ پس کیا تم غور نہیں کرتے۔؟

آفاق سے عالم کبیر (کائناتِ مادی) مراد ہے اور قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو مختلف الفاظ میں اس کے مطالعہ اور اس کی تسخیر کا حکم دیا ہے:۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ۔ (۳۱:۲۰)

کیا تم لوگوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام اشیاء کو جو آسمان اور زمین میں ہیں تمہارا خادم بنا دیا ہے۔

اے مخاطب! پس تو اپنی عقل خداداد سے کام لے کر اس کائنات کو مسخر کر۔ اگر تو ایسا کرے گا تو تجھے سروری حاصل ہو جائے گی۔ یاد رکھ! اگر ایک کمزور انسان اشیائے کائنات کی حکمت سے آگاہ ہو جائے تو وہ طاقتور انسانوں پر حکومت کر سکتا ہے۔ اور اگر کوئی کمزور قوم، اشیاء کے خواص سے واقف ہو جائے تو وہ طاقتور قوموں سے خراج وصول کر سکتی ہے۔

بات یہ ہے کہ صورتِ ہستی یعنی یہ کائنات، معنی اور مقصد سے معرّیٰ نہیں ہے۔ ہر شئے میں کوئی نہ کوئی خاصیت یا خوبی پائی جاتی ہے۔ مثلاً ساری دنیا

پھپھوند کو محض بیکار چیز سمجھتی تھی، لیکن جب یورپ کے سائنسدانوں نے اس میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس میں زخموں کے اندمال کی صلاحیت مخفی ہے چنانچہ وہی بیکار شئے آج پنسلین کی شکل میں ہر ڈاکٹر کی آمدنی اور ہر مریض کی صحت کا ذریعہ بنی ہوئی ہے۔

اے مسلمان! کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اللہ تعالٰی نے تجھ کو اونٹ کی تخلیق میں غور کرنے کا حکم دیا ہے؟ چنانچہ وہ آیت یہ ہے۔

اے مخاطب! اونٹ کی طرف دیکھ یعنی اس کی بناوٹ (تخلیق) پر غور کر کہ اللہ تعالٰی نے اسے کس نہج پر پیدا کیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اللہ تعالٰی نے تجھ کو یہ حکم کیوں دیا؟ اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اونٹ کے پردہ میں تجھ کو کائنات پر غور کرنے کا حکم اس لئے دیا ہے کہ تو مطالعۂ فطرت کرے اور پھر عناصرِ فطرت کو مسخر کرے۔ بات یہ ہے کہ مطالعۂ کائنات تسخیرِ کائنات کا دیباچہ ہے جب تک کوئی قوم کائنات کا مطالعہ نہ کرے وہ تسخیر کی طرف مائل ہی نہیں ہو سکتی۔

اس لئے تو پہلے النفس (خودی) کا مطالعہ کر پھر کائنات کا مطالعہ کر اور اس کے بعد اسے مسخر کر۔ دیکھ لے! جو قطرہ خود فروز ہوتا ہے وہ اگر انگور میں ہوتا ہے تو شراب، اور گل پر ہوتا ہے تو شبنم، اور سمندر میں ہوتا ہے تو موتی بن جاتا ہے۔ اور جو قطرہ اپنی خودی کو منور نہیں کرتا وہ کسی صورت سے عزت یا شہرت یا قیمت حاصل نہیں کر سکتا۔

اے مخاطب! اشیائے کائنات کی ظاہری شکل و صورت پر فریفتہ

مت ہو۔ ظاہر بینی اور ظاہر پسندی یہ تو بچوں یعنی نادانوں کا مسلک ہے۔ عقل مند آدمی ہمیشہ ظاہر سے قطع نظر کر کے باطن کو دیکھتا ہے۔ مثلاً بھینس کا ظاہر بہت سیاہ ہے لیکن اس کا باطن سفید دودھ سے لبریز ہے جو ہمارے لئے بہت مفید ہے۔ سانپ کا ظاہر کس قدر دلکش ہے لیکن اس کے باطن میں زہر بھرا ہوا ہے!

اے مخاطب! جن لوگوں (قوموں) نے اشیائے کائنات کے خواص سے آگاہی حاصل کر لی ہے وہ آج ہم پر حکمران ہیں۔ انہوں نے اسی علم کی بدولت بہت سی مفید اشیا، ایجاد کی ہیں۔

وہ لوگ برق اور حرارت کو بطور مرکب (سواری) استعمال کر رہے ہیں۔ اس کی مدد سے انہوں نے تار (تلغراف) اور لاسلکی، گراموفون، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلیفون اور ہوائی جہاز جیسی کارآمد اشیا، ایجاد کی ہیں۔

اے مسلمان! کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ تو تنازع للبقار سے بکلی دست بردار ہو چکا ہے۔ شکست خوردہ پہلوان کی طرح سرنگوں ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا ہے جبکہ تیرے ساتھی منزلِ مقصود تک پہنچ چکے ہیں۔ بلکہ محمل سے تیری لیلیٰ کو بھی نکال کر لے گئے، اور تو ٹس سے مس بھی نہ ہوا۔ کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ تو جو کسی زمانے میں ساری دنیا پر حکومت کرتا تھا (سولہویں اور سترھویں صدی میں یورپ کا کوئی حکمران، سلاطین عثمانی کی اجازت کے بغیر اپنے مراسلوں میں اپنے لئے "بادشاہ" کا لفظ استعمال نہیں کر سکتا تھا۔) آج ساری دنیا میں ذلیل ہے، یعنی آوارہ ہے، خستہ ہے، واماندہ ہے، اور بیچارہ ہے۔

اس لئے میں تجھ کو برادرانہ مشورہ دیتا ہوں کہ اگر تو پھر دُنیا میں عزت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اشیائے کائنات کا علم حاصل کر، کیونکہ

ع علم اسمار اعتبارِ آدم است

اس مصرع میں اس آیت کی طرف اشارہ ہے:۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (۳۱:۲)

اور اللہ تعالیٰ نے فرشتوں پر تفوّق عطا کرنے کی غرض سے، آدم کو تمام اشیائے کائنات کے خواص کا علم سکھا دیا۔ (یعنی علم معیارِ فضل ہے)

اور جب علمِ اسمار کی بدولت انسان حکمتِ اشیار سے واقف ہو جاتا ہے تو اس میں اس قدر طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ دشمن اُسے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

در معنیٔ این کہ کمالِ حیاتِ ملّیہ این است کہ ملّت مثلِ فرد احساسِ خودی پیدا کند و تولید و تکمیلِ این احساس از ضبطِ روایاتِ ملّیہ ممکن گردد

کودکے را دیدی از بالغ نظر — کو بود از معنیٔ خود بے خبر
ناشناسِ دور و نزدیک آنچنان — ماہ را خواہد کہ بر گیرد عناں
از ہمہ بیگانہ آں مامک پرست — گریہ مست و شیر مست و خواب مست
زیر و بم را گوشِ او در گیر نیست — نغمہ اش جز شورشِ زنجیر نیست
سادہ و دوشیزہ افکارش ہنوز — چوں گہر پاکیزہ گفتارش ہنوز
جستجو سرمایۂ پندارِ او — از چرا چوں کے کجا گفتارِ او
نقش گیرِ این و آں اندیشہ اش — غیر جوئی غیر بینی پیشہ اش
چشمش از دنبال اگر گیرد کسے — جانِ او آشفتہ می گردد بسے
فکرِ خامش در ہوائے روزگار — پر کشا مانندِ بازِ نو شکار
در پئے نخچیر ہا بگذاردش — باز سوئے خویشتن می آردش

تا ز آتش گیریِ افکارِ او
گل فشاند زرچکِ پندارِ او (۱)

چشم گیرایش فتد بر خویشتن
دستکے بر سینہ می گوید کہ "من"

یادِ او بر خود شناسایش کند
حفظِ ربطِ دوش و فردایش کند

سفتہ ایامش دریں تارِ زر اند
ہمچو گوہر از پئے یک دیگر اند

گرچہ ہر دم کاہد افزاید گلش
"من ہمانستم کہ بودم" در دلش

ایں "من" نوزادہ آغازِ حیات
نغمۂ بیداریِ سازِ حیات

ملتِ نوزادہ مثلِ طفلک است
طفلکے کو در کنارِ مامک است

طفلکے از خویشتن ناآگہے
گوہرِ آلودۂ خاکِ رہے

بستہ با امروزِ او فرداش نیست
حلقہ ہائے روز و شب در پاش نیست

چشمِ ہستی را مثالِ مردم است
غیر را بینندہ و از خود گم است

صد گرہ از رشتۂ خود وا کند
تا سرِ تارِ خودی پیدا کند

گرم چوں افتد بکارِ روزگار
ایں شعورِ تازہ گردد پایدار

نقشہا بر دارد اندازد ازو
سرگذشتِ خویش می سازد ازو

فرد چوں پیوندِ ایامش گسیخت
شانۂ ادراکِ او دندانہ ریخت

قوم روشن از سوادِ سرگذشت
خود شناس آمد ز یادِ سرگذشت

سرگذشتِ او گر از یادش رود
باز اندر نیستی گم می شود

---

(۱) زرچک: ایک قسم کی آتشبازی جسے ہندی میں پھلجھری کہتے ہیں ۱۲

نسخهٔ بود ترا اے ہوشمند ‌ ‌ ربط ایام آمدہ شیرازہ بند

ربطِ ایام است مارا پیرہن ‌ ‌ سوزنش حفظِ روایاتِ کہن

چیست تاریخ اے زخود بیگانهٔ ‌ ‌ داستانے قصہ ازا فسانهٔ ؟

این ترا از خویشتن آگہ کند ‌ ‌ آشنائے کار و مردِ رہ کند

رُوح را سرمایهٔ تاب است این ‌ ‌ جسمِ ملت را چو اعصاب است این

ہمچو خنجر بر فسانت می زند ‌ ‌ باز بر روئے جہانت می زند

وہ چہ سازِ جاں نگار دلپذیر ‌ ‌ نغمہ ہائے رفتہ در تارش اسیر

شعلهٔ افسردہ در سوزش نگر ‌ ‌ دوش در آغوشِ امروزش نگر

شمعِ او بختِ امم را کوکب است ‌ ‌ روشن از وے امشب و ہم دیشب است

چشمِ پرکارے کہ بیند رفتہ را ‌ ‌ پیشِ تو باز آفریند رفتہ را

بادهٔ صد سالہ در مینائے او ‌ ‌ مستئ پارینہ در صہبائے او

صید گیرے کو بدام اندر کشید ‌ ‌ طائرے کز بوستانِ ما پرید

ضبط کن تاریخ را پائندہ شو ‌ ‌ از نفسہائے رمیدہ زندہ شو

دوش را پیوند با امروز کن ‌ ‌ زندگی را مرغِ دست آموز کن

رشتهٔ ایام را آور بدست ‌ ‌ ورنہ گردی روز کور و شب پرست

سر زند از ماضئ تو حالِ تو ‌ ‌ خیزد از حالِ تو استقبالِ تو

مشکن ار خواہی حیاتِ لازوال ‌ ‌ رشتهٔ ماضی ز استقبال و حال

موجِ ادراکِ تسلسل زندگی است
مے کشاں را شورِ قلقل زندگی است

فصل نوزدہم

تمہید:۔ اس فصل میں اقبالؔ نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ قومی زندگی اس وقت مرتبۂ کمال کو پہنچتی ہے جب فرد کی طرح قوم کے اندر بھی خودی کا احساس (شعور) پیدا ہو جائے۔ مطلب اس کا آسان لفظوں میں یہ ہے کہ فرد کے دل میں یہ یقین پیدا ہو جائے کہ قوم کے نفع میں میرا نفع ہے۔ اور قوم کے نقصان میں میرا نقصان ہے۔ مثلاً ایک جاگیردار یا زمیندار کے پاس دس ہزار من گیہوں موجود ہے اور اسے یہ موقع حاصل ہے کہ وہ بلیک مارکیٹ کے ذریعہ سے اس ذخیرہ کی دوگنی یا تین گنی قیمت وصول کر سکتا ہے۔ لیکن ایسا کرنے سے قوم کو نقصان پہنچے گا۔ لہٰذا اس کا فرض یہ ہے کہ وہ اس کام سے باز رہے۔ بالفاظِ دگر ہر فرد کے دل میں یہ یقین پیدا ہو جائے کہ میں بذاتِ خود پوری قوم ہوں اس لئے اگر کسی کام سے میری ذات کو نفع پہنچے لیکن اس سے قوم کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو تو مجھے اس فعل سے اجتناب کرنا چاہیئے، یعنی ہر فرد اپنی ہستی اپنی جماعت کی ہستی میں گم کر دے۔ اور جب ہر فرد اس پر عامل ہو جائے گا، تو قوم کے اندر وحدت پیدا ہو جائے گی۔ اسی وحدت کو اقبالؔ نے احساسِ خودی سے تعبیر کیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ افراد کے دل میں یہ یقین کیسے پیدا ہو؟ اس کا جواب اقبالؔ نے یہ دیا ہے کہ اس کی صورت یہی ہے کہ ہر فرد اپنی قومی روایات کی حفاظت کو اپنا فریضہ تصور کرے۔ اور اس فریضہ کی انجام دہی صرف اسی وقت ممکن ہے

جب ہر فرد اپنی قومی تاریخ سے آگاہ ہو۔

اس فصل میں دو بند ہیں۔ پہلے بند میں اقبالؔ نے ایک بچّہ کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ابتداء میں وہ شعورِ ذات سے عاری ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس میں یہ صفت پیدا ہو جاتی ہے۔

دوسرے بند میں پہلے انہوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ قوم کے اندر بھی اس طرح تدریجاً اپنی ہستی کا شعور پیدا ہوتا ہے، اس کے بعد انہوں نے تاریخ کی اہمیت واضح کی ہے، اور قوم کو ملّی تاریخ کے مطالعہ کی تلقین کی ہے۔

پہلا بند۔ کہتے ہیں کہ اے مخاطب! ایک طفلِ شیر خوار کی زندگی پر غور کر۔ جب وہ دُنیا میں آتا ہے، تو اُسے شعور تو حاصل ہوتا ہے لیکن وہ اپنی ہستی سے بے خبر ہوتا ہے۔ یعنی شعورِ ذات سے محروم اور خودی کے مفہوم سے بیگانہ ہوتا ہے۔

اس کے ذہن میں قُرب اور بُعد کا تصور بھی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ چاند کو دیکھتا ہے تو اُسے اپنی آغوش میں لینا چاہتا ہے۔ آغوشِ مادر کے سوا وہ دُنیا کی کسی چیز کو نہیں پہچانتا۔ جب بھوک لگتی ہے، تو روتا ہے۔ اور جب دُودھ پی لیتا ہے، تو سو جاتا ہے۔

اس کے بعد شعور کی دوسری منزل شروع ہوتی ہے جس میں وہ اپنے ماحول سے آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے دماغ میں سوالات کا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ کیا ہے؟ ایسا کیوں ہے؟ یہ بات کیسے ہوئی؟

ہیں یہ کام کس طرح کروں؟ یہ راستہ کدھر کو جاتا ہے؟ یہ شخص کون ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس منزل میں اس کا اندیشہ (ذہن) اپنے ماحول (این وآں) سے آگاہی حاصل کرنے میں مصروف رہتا ہے اور وہ اپنے علاوہ دوسری اشیاء کا علم حاصل کرتا رہتا ہے۔ اگر کوئی شخص پیچھے سے آ کر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیتا ہے، تو وہ بہت پریشان ہو جاتا ہے۔ اور فوراً پوچھتا ہے کہ میری آنکھیں کس نے بند کر دیں؟

اس کے بعد شعور کی تیسری منزل شروع ہو جاتی ہے۔ اس منزل میں اس کی قوّتِ مفکرہ کی بدولت، اس کے پندار کی پھلجھڑی سے پھول برسنے لگتے ہیں۔ یعنی اس میں شعورِ ذات پیدا ہو جاتا ہے، اقبال نے اس بات کو زرچک کی تشبیہ سے واضح کیا ہے۔ قاعدہ ہے کہ آتشباز زرچک کے اندر گندھک، شورہ اور بارود کے مرکب کو بند کر دیتا ہے۔ جب ہم اس زرچک کو دیا سلائی دکھاتے ہیں تو اس کا باطن گلہائے آتشیں کی صورت میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اسی طرح جب بچہ بڑا ہو جاتا ہے تو اس کی فکر اس کے شعورِ ذات کو اس پر عیاں کر دیتی ہے۔ یعنی اُسے اپنی ذات کا شعور حاصل ہو جاتا ہے۔

اب وہ اپنی ہستی میں غور کرتا ہے اور اس غور و فکر کی بدولت اُسے اپنی "خودی" کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ میں کل بھی موجود تھا، آج بھی موجود ہوں۔ اس کے بعد جب دوسرا دن ہوتا ہے، تو وہ کہتا ہے کہ میں وہی تو ہوں جو کل تھا۔

یہ چوتھی اور آخری منزل ہے یعنی اس کے ذاتی شعور میں تسلسل پیدا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اس کے جسم میں تغیر اور تبدل ہوتا رہتا ہے۔ کبھی وہ دُبلا ہو جاتا ہے،

کبھی موٹا، اور ایک زمانہ ایسا بھی آجاتا ہے۔ جب ضعف کی وجہ سے اُس کی کمر جھک جاتی ہے۔ لیکن ان تمام تغیرات کے باوجود وہ اپنے آپ کو وہی یقین کرتا ہے جو وہ پچاس سال پہلے تھا۔

دوسرا بندہ۔ کہتے ہیں کہ جب کوئی قوم پیدا ہوتی ہے تو ابتدا میں اُس کی حالت بچہ کی سی ہوتی ہے۔ یعنی اس کے اندر شعورِ ذات موجود نہیں ہوتا۔ ہم اُسے پتلی سے تشبیہہ دے سکتے ہیں کہ وہ دوسروں کو تو دیکھ سکتی ہے، لیکن اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتی۔

اس کے بعد دوسری منزل آتی ہے جب وہ قوم زندہ رہنے کے لیے جدّوجہد کرتی ہے۔ یعنی اس قوم میں ایک علیؓ پیدا ہوتا ہے جو خیبر کا معرکہ سر کرتا ہے پھر ایک خالدؓ پیدا ہوتا ہے جو شام فتح کرتا ہے۔ پھر ایک طارق پیدا ہوتا ہے، جو اندلس فتح کرتا ہے۔ پھر ایک صلاح الدین پیدا ہوتا ہے، جو حروبِ صلیبی میں اپنے کارنامے دکھاتا ہے۔ پھر ایک محمود غزنوی پیدا ہوتا ہے، جو ہندوستان فتح کرتا ہے۔ پھر ایک سلیمان پیدا ہوتا ہے، جو یورپ کو لرزہ براندام کر دیتا ہے۔ پھر ایک عالمگیر پیدا ہوتا ہے، جو ہندوستان میں مسلمانوں کی بقا کا انتظام کرتا ہے۔ پھر ایک مصطفٰے کمال پیدا ہوتا ہے، جو ترکوں کو دوبارہ زندہ کر دیتا ہے۔ پھر ایک محمد علی جناح پیدا ہوتا ہے، جو دُنیا کے نقشہ میں تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔

مختصر یہ کہ اس جدّوجہد سے اس کا شعورِ ذات، پائیدار ہو جاتا ہے، اور اس طرح وہ قوم اپنی ملّی تاریخ مرتب کرتی ہے۔ اور اس قوم کا ہر فرد اپنے اسلاف

کی سرگذشت پر نظر کر کے اپنے قومی شعور کو زندہ رکھتا ہے۔

اگر فرد اپنے اسلاف کی تاریخ سے بیگانہ ہو جائے، تو اس کا قومی شعور فنا ہو جائے گا۔ قوم اپنی تاریخ کی بدولت شعورِ ذاتی حاصل کرتی ہے۔ اور اس تاریخ کو یاد رکھنے ہی سے یہ قومی شعور زندہ رہ سکتا ہے۔ قوم اپنے آپ کو اپنی تاریخ ہی کی روشنی سے پہچان سکتی ہے۔ جو قوم خود شناسی کی آرزومند ہو، اس کا فرض یہ ہے کہ اپنی سرگذشت (ملی تاریخ) سے آگاہی حاصل کرے، اور ہر وقت اس کو اپنے سامنے رکھے۔ قوم کے لئے تاریخ وہی مرتبہ رکھتی ہے۔ جو فرد کے لئے حافظہ کی قوت۔ اگر کوئی شخص قوتِ حافظہ سے محروم ہو جائے تو وہ اپنے آپ کو ہرگز نہیں پہچان سکتا۔ یعنی انفرادی شعورِ ذات، حافظہ پر موقوف ہے۔ اسی طرح قومی شعور قومی تاریخ سے آگاہی پر موقوف ہے۔

اقبال نے تاریخ (ربطِ ایام) کو شیرازہ اور لباس سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی اگر شیرازہ ٹوٹ جائے، تو کتاب کے اوراق منتشر ہو جائیں گے۔ اسی طرح اگر افرادِ قوم اپنی تاریخ سے بیگانہ ہو جائیں تو اُن کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اگر مثال درکار ہو، تو موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی حالت کا مشاہدہ کافی ہے۔

آج ہماری قوم کے نوجوان غیر اسلامی نظامِ تعلیم کی بدولت اپنی قومی روایات سے بالکل بیگانہ ہو چکے ہیں۔ اور اس کی ذمہ داری اُن پر ہے جو انہیں ان درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجتے ہیں یا اُن پر جنہوں نے یہ نصاب نافذ کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ ربطِ ایام، یعنی ملی تاریخ سے واقف ہونا ہمارے لئے

ایسا ہی ضروری ہے جیسے لباس پہننا ضروری ہے۔ دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تاریخ ہماری قومی زندگی کا جزوِ لاینفک ہے جس طرح لباس۔ اور یہ لباس قومی روایات کی حفاظت سے تیار ہوتا ہے یعنی حفظِ روایات اس لباس کے لئے بمنزلۂ سوزن (سوئی) ہے۔

اس کے بعد اقبال ہمیں تاریخ کی اہمیت سے آگاہ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اے مسلمان! تاریخ اور افسانہ میں بڑا فرق ہے۔ ہم افسانہ یا داستان محض تفریح کے لیے پڑھتے ہیں۔ لیکن تاریخ وہ شئے ہے جو ہم کو ہماری حقیقت سے آگاہ کرتی ہے ہمیں یہ بتاتی ہے کہ ہم کون ہیں اور کیا ہیں۔ ہمیں عمل اور جدوجہد پر آمادہ کرتی ہے۔ ہماری روح کو تقویت پہنچاتی ہے۔ ہماری قومی ہستی کو قائم رکھتی ہے۔ جس طرح انسان کا جسم اعصاب کی بدولت قائم رہتا ہے۔ اسی طرح قوم کے لئے تاریخ بمنزلۂ اعصاب ہے۔

تاریخ، قوم کے اندر جدوجہد کا ولولہ پیدا کرتی ہے۔ قوم کو آمادۂ پیکار کرتی ہے۔ تاریخ وہ سازِ دلربا ہے جس کے تاروں میں صدیوں کے پرانے نغمے بدستور محفوظ ہیں۔

؎ اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

تاریخ کیا ہے؟ قوموں کے مقدر کا ستارہ ہے، جس سے اُن کی اندھیری راتیں روشن ہو جاتی ہیں۔

تاریخ کیا ہے؟ وہ تیز بین آنکھ ہے جو ماضی کو دیکھ سکتی ہے، اور اسی وجہ سے ماضی کو تیرے سامنے موجود کر سکتی ہے۔

تاریخ کیا ہے؟ وہ بوتل ہے جس میں صدیوں کی پرانی شراب بند ہے جس میں تیرے اسلاف کے کارناموں کی تفصیل مندرج ہے، جن کو پڑھ کر تیرے اندر ترقی کی اُمنگ پیدا ہو سکتی ہے۔

تاریخ کیا ہے؟ وہ شکاری ہے جو اُس طائر کو بھی اپنے دام میں گرفتار کر سکتا ہے جو تیرے باغ سے اُڑ چکا ہے۔ یعنی وہ اُن واقعات کو تیرے سامنے پیش کر سکتی ہے جو تیرے حافظہ سے محو ہو چکے ہیں۔

پس اے مسلمان! تو اگر پائندگی (استحکام) چاہتا ہے، تو اپنی قومی تاریخ سے آگاہی حاصل کر۔ ماضی کو حال سے مربوط کر لے، تو یہ تیری زندگی تیری خادم اور مطیع (مرغِ دست آموز) بن جائے گی۔

اگر تو اپنی قومی تاریخ سے غافل ہو جائے گا تو اوہام باطلہ میں گرفتار ہو جائے گا۔ اور غلط راستہ اختیار کر لے گا۔ اس کو اقبالؔ نے شب پرستی سے تعبیر کیا ہے۔

یاد رکھ کہ تیرا حال، تیرے ماضی کا نتیجہ ہے۔ اور تیرا مستقبل تیرے حال کا ثمرہ ہے۔ پس اگر تو حیاتِ لازوال کا آرزومند ہے، تو اپنے حال اور استقبال سے اپنے ماضی کا رشتہ منقطع مت کر کیونکہ زندگی تو ایک سلسلہ کا نام ہے۔ اگر اس کا تسلسل باطل ہو گیا، تو زندگی بھی ختم ہو جائے گی۔

در معنی این که بقای نوع از امومت است و حفظ و احترام امومت اسلام است

نغمه خیز از زخمهٔ زن ساز مرد ... از نیاز او دو بالا ناز مرد

پوشش عریانی مردان زن است ... (۱) حسن دلجو عشق را پیراهن است

عشق حق پروردهٔ آغوش او ... این نوا از زخمهٔ خاموش او

آنکه نازد بر وجودش کائنات ... (۲) ذکر او فرمود با طیب و صلوٰة

مسلمی کو را پرستاری شمرد ... بهره از حکمت قرآن نبرد

نیک اگر بینی امومت رحمت است ... زانکه او را با نبوت نسبت است

شفقت او شفقت پیغمبر است ... سیرت اقوام را صورتگر است

از امومت پخته تر تعمیر ما ... در خط سیمای او تقدیر ما

هست اگر فرهنگ تو معنی رسے ... حرف امت نکته ها دارد بسے

گفت آن مقصود حرف کن فکان ... زیر پای امهات آمد جنان

ملت از تکریم ارحام است و بس ... ورنه کار زندگی خام است و بس

---

(۱) هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ (آیهٔ شریفه)

(۲) حدیث مشهور ۱۲

از اموُمت گرمِ رفتارِ حیات
از اموُمت کشفِ اسرارِ حیات

از اموُمت پیچ و تابِ جوئے ما
موج و گرداب و حبابِ جوئے ما

آں دُخ رستاق زادے جاہلے (۱-۲-۳) پست و بالائے سطبرے بدگلے

ناتراشے پرورش نادادۂ
کم نگاہے کم زبانے سادۂ

دل ز آلامِ اموُمت کردہ خوں
گردِ چشمش حلقہ ہائے نیلگوں

ملت ار گیرد ز آغوشش بدست
یک مسلمانِ غیور و حق پرست

ہستیٔ ما محکم از آلامِ اوست
صبحِ ما عالم فروز از شامِ اوست

واں تہی آغوشِ نازک پیکرے
خانہ پروردِ نگاہش محشرے

فکرِ او از تابِ مغرب روشن است
ظاہرش زن باطنِ او نازن است

بندہائے ملتِ بیضا گسیخت
تا ز چشمش عشوہ ہا حل کردہ ریخت

شوخ چشم و فتنہ زا آزادیش
از حیا نا آشنا آزادیش

علمِ او بارِ اموُمت بر نتافت
بر سرِ شامش یکے اختر نتافت

ایں گل از بستانِ ما نا رستہ بہ
داغش از دامانِ ملت شستہ بہ

لالۂ گویاں چو انجم بے شمار
بستہ چشم اندر ظلامِ روزگار

---

(۱) دُخ: مخففِ دُختر۔

(۲) رستاق زاد: گنوار۔

(۳) سطبر: فربہ۔

پا نبردہ از عدم بیروں ہنوز
مضمر اندر ظلمتِ موجودِ ما
شبنمے بر برگِ گل نہ نشستۂ
بر دمد ایں لالہ زارِ ممکنات
قوم را سرمایہ اے صاحب نظر
مالِ او فرزندہائے تندرست

از سوادِ کیف و کم بیروں ہنوز
آں تجلی ہائے نا مشہودِ ما
غنچہ ہائے از صبا نا خستۂ
از خیابانِ ریاضِ اُمہات
نیست از نقد و قماش و سیم و زر
تر دماغ و سخت کوش و چاق و چست

حافظِ رمزِ اخوت مادراں
قوتِ قرآن و ملت مادراں

(فصل بستم)

تمہید:۔ اس فصل میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ نوعِ انسانی کی بقا ''امومت'' پر موقوف ہے۔ اسی لئے اسلام نے امومت کی حفاظت اور عزت کو فرض قرار دیا ہے۔

اسلام کی رُو سے اس دُنیا کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور اپنی مشیئت کے مطابق پیدا کیا ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ یہ دنیا ایک وقتِ مقرر و معین تک قائم رہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ موت کے ساتھ ساتھ حیات کا سلسلہ بھی چلتا رہے۔ یعنی دنیا میں انسان پیدا ہوتے رہیں، یا بالفاظِ دگر عورت، ماں بنتی رہے، اور بچے جنتی رہے (یہی امومت ہے) چونکہ عورت ماں بنکر مشیئتِ

ایزدی کی تکمیل میں معاون ہوتی ہے، اس لئے اسلام نے ماں کی عزت کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

اَلْجَنَّۃُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّھَاتِ۔

اس فصل میں دو بند ہیں۔ پہلے بند میں امومت کی اہمیت اور فضیلت بیان کی ہے۔ دوسرے بند میں یہ بتایا ہے کہ اگر عورت فرائضِ امومت سے دستکش ہو جائے تو دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔

پہلا بند:۔ کہتے ہیں کہ اگر عورت نہ ہوتی، تو مرد کی خوبیاں دنیا میں عیاں نہیں ہو سکتی ہیں۔ اگر مرد کو ساز سے تشبیہہ دی جائے تو عورت اس کے حق میں بمنزلہ مضراب ہے مضراب نہ ہو تو ساز سے نغمہ نہیں نکل سکتا۔ عورت نہ ہو تو مرد کا جوہر آشکارا نہیں ہو سکتا۔ مرد کا ناز عورت ہی کے نیاز سے دوبالا ہوتا ہے۔ یعنی اگر عورت اپنی فطرت کے اقتضار کی بنا پر مرد کی طرف مائل نہ ہو تو اور کون ہستی ہے جو اس کی قدر کر سکتی ہے؟ مرد کی قدر و منزلت، عورت ہی کے گوشۂ چشم التفات کی مرہونِ منت ہے۔ عورت ہی اُسے اپنے نیاز کی بدولت مقامِ ناز پر فائز کر دیتی ہے۔ مرد کی زندگی کی زیب و زینت عورت ہی کے دم سے ہے بلکہ عورت ہی سے مرد کی زندگی میں دلکشی پیدا ہوتی ہے۔ عورت (حسن) مرد (عشق) کے حق میں بمنزلہ لباس ہے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم فرماتا ہے:۔

ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّھُنَّ (۲ : ۱۸۷)

عورتیں تمہارے حق میں پردہ (پوشش) ہیں اور تم عورتوں کے لئے پردہ (پوشش) ہو۔

ماں ہی وہ ہستی ہے جو مسلمان بچہ کے دل میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت پیدا کرتی ہے۔ تمام عاشقانِ حق نے اُسی کی آغوش میں پرورش پائی ہے۔

ع عشقِ حق پروردۂ آغوشِ اُو

یہ شاعری نہیں ہے بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے کیونکہ دنیائے اسلام میں جس قدر عاشقانِ حق پیدا ہوئے ہیں، ان میں سے اکثر ایسے ہیں جنہوں نے درحقیقت اپنی ماؤں سے رُوحانی فیض حاصل کیا۔

یہی وجہ ہے کہ سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کے وجود پر کائنات کو ناز ہے، خوشبو اور نماز کے ساتھ اس کا ذکر بھی فرمایا۔ پس جو مسلمان عورت کو خادمہ (پرستار) سمجھتا ہے، وہ قرآنِ حکیم کی تعلیمات سے بالکل بیگانہ ہے۔

اگر تو غور سے دیکھے تو امومت میں بھی شانِ رحمت پائی جاتی ہے، کیونکہ اس کو نبوّت سے ایک گونہ نسبت حاصل ہے۔ ماں کی شفقت میں پیغمبر کی شفقت کا عکس نظر آتا ہے۔ جس کی بدولت قوموں کی سیرت کی تشکیل ہوتی ہے۔

ماں کی آغوش دراصل ہماری اوّلین اور بہترین تربیت گاہ ہے۔ اُسی کی آغوش میں ہماری سیرت بنتی ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جیسی آغوشِ مادر ویسی ہی تربیت، اور جیسی تربیت ویسی ہی تقدیر۔ اگر ماں کے دل میں اسلام کی محبت ہے، تو اس کی اولاد میں یہ رنگ ضرور نمایاں ہوگا۔ اگر ماں خود اسلام سے بیگانہ ہو، تو بچوں کے اندر اسلام کا رنگ کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟

اے مخاطب! اگر تیری عقل (فرہنگ) بات کی تہہ کو پہنچ سکتی ہے تو تُو لفظِ اُمت پر غور کر۔ تجھے اس میں بہت سے نکات مل سکتے ہیں۔ مثلاً اُمت کا مادہ اُم ہے اور "اُم" ماں کو کہتے ہیں۔ یعنی قوم کو ماں سے نسبت حاصل ہے۔ نہ کہ باپ سے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان میں ضرب المثل ہے۔ "جیسی مائی ویسی جائی"، یعنی جیسی ماں ویسی ہی اولاد۔ اگر ماں دینی دار ہے، تو اولاد میں بھی یہ رنگ ضرور نمایاں ہوگا۔

ماں کی عظمت کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔ اَلْجَنَّۃُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّہَاتِ۔ یعنی جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔ اگر قوم کے افراد آپس میں صلہ رحمی (تکریم ارحام) کے طریقہ کو چھوڑ دیں، تو قوم کا وجود ختم ہو جائے گا۔ افراد زندہ تو رہیں گے، لیکن ان میں قومیت کا رنگ پیدا نہیں ہو سکے گا۔

امومت کی اہمیت اور عظمت واضح کرنے کے بعد اقبال یہ کہتے ہیں کہ وہ دیہاتی لڑکی جو بالکل گنوار، جاہل، پستہ قد، موٹی بھدی اور بدصورت ہو، نہ اُس نے کسی اسکول میں تعلیم پائی ہو، نہ جلسوں میں تقریریں کی ہوں، نہ رقص و سرود سے واقف ہو، نہ فیشن سے آگاہ ہو، بلکہ بچے پالنے کی مصیبت میں گرفتار ہو۔ تاہم اگر وہ ایک غیور اور حق پرست مسلمان[1] پال پوس کر قوم کو دے دے تو اس کی یہ مصیبت سپھل ہو جائے گی۔ کیونکہ قوم کی ہستی محکم ہو جائے گی۔

---

[1] مثلاً ایک محمد علی جنت آشیانی نے ہندی مسلمانوں کی ہستی کو محکم کر دیا۔

اس شریف دہقان زادی کے مقابلہ میں اُس نازک بدن تہی آغوش خاتون کو لائیے جس کی نگاہیں محشر برپا کرتی رہتی ہیں۔ جس نے اپنے دل و دماغ کو یورپ کی روشنی سے عارضی طور پر منور کر لیا ہے۔ جس کی صورت زنانہ ہے، لیکن سیرت مردانہ ہے (یعنی افزائش نسل کو مصیبت سمجھتی ہے)

اُس نے اپنے طرزِ عمل سے ملّتِ بیضا کو کمزور کر دیا۔ کیونکہ وہ نگاہیں نیچی رکھنے کے بجائے، جس طرف نظر کرتی ہے عشوؤں کے تیر برساتی ہے۔

وہ نہایت شوخ چشم، بیباک اور حدود سے متجاوز ہے، اور اس کی آزادی اس کے اور قوم کے لئے بہت سے فتنوں کا موجب ہے۔ مختصر یہ کہ وہ جوہرِ حیات سے عاری ہے۔ اُس نے کالج میں تعلیم پاکر امومت کا بار اُٹھانے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اُس کی آغوش اولاد سے خالی رہی۔

کاش ایسی لڑکیاں ہماری قوم میں پیدا ہی نہ ہوتیں! کتنا اچھا ہو اگر ملّت ان کے وجود سے پاک ہو جائے۔!

دُوسرا اشارہ:۔ یہ بند بہت مختصر ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام نسلیں جو ابھی پردۂ عدم میں پوشیدہ ہیں انجام کار ماؤں ہی کے بطون سے ظاہر ہونگی، اور ان ہی کی آغوش میں پرورش پاکر جوان ہوں گی۔

لہٰذا اے صاحبِ نظر! قوم کا سرمایہ سونا چاندی یا اسٹرلنگ یا لوہا نہیں ہے۔ بلکہ تندرست اور چاق و چست نوجوان ہیں۔ اور چونکہ ان کا وجود ماؤں کے وجود پر موقوف ہے، اس لئے قرآن اور ملّت دونوں کے لئے ماؤں کا وجود طاقت کا سرچشمہ ہے۔

در معنی ایں کہ سیدۃ النسا فاطمۃ الزہراؓ اسوۂ کاملہ

سیدۃ النسا حضرۃ فاطمۃ الزہراؓ عورتوں کے لئے کامل نمونہ ہیں

ایست برائے نساء اسلام

مریمؓ از یک نسبتِ عیسیٰؑ عزیز	از سہ نسبت حضرتِ زہراؓ عزیز
نورِ چشمِ رحمۃ للعالمینؐ	آں امامِ اوّلین و آخریں
آنکہ جاں در پیکرِ گیتی دمید	روزگارِ تازہ آئیں آفرید
بانوئے آں تاجدارِ ھَلْ اَتیٰ	مرتضیٰ مشکل کشا شیرِ خدا
پادشاہ و کلبۂ ایوانِ او	یک حسام و یک زرہ سامانِ او
مادرِ آں مرکزِ پرکارِ عشق	مادرِ آں کارواں سالارِ عشق
آں یکے شمعِ شبستانِ حرم	حافظِ جمعیتِ خیر الامم
تا نشیند آتشِ پیکار و کیں	پشتِ پا زد بر سرِ تاج و نگیں
واں دگر مولائے ابرارِ جہاں	قوّتِ بازوئے احرارِ جہاں
در نوائے زندگی سوز از حسینؓ	اہلِ حق حریت آموز از حسینؓ
سیرتِ فرزندہا از امہات	جوہرِ صدق و صفا از امہات
مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؓ	مادراں را اسوۂ کاملِ بتولؓ

بہرِ محتاجِ دلش آں گونہ سوخت | با یہودے چادرِ خود را فروخت
نوری و ہم آتشی فرمانبرش | گم رضایش در رضائے شوہرش
آں ادب پروردۂ صبر و رضا | آسیا گردان و لب قرآں سرا
گریہ ہائے او ز بالیں بے نیاز | گوہر افشاندے بدامانِ نماز
اشکِ او برچید جبریل از زمیں | ہمچو شبنم ریخت بر عرشِ بریں
رشتۂ آئینِ حق زنجیر پاست | پاسِ فرمانِ جنابِ مصطفےٰؐ است

در نہ گردِ تربتش بر دیدمے
سجدہ ہا بر خاکِ او پاشیدمے

(فصل بست و یکم)

کہتے ہیں کہ حضرت مریمؑ کی عزت ہمارے دلوں میں صرف اس لحاظ سے ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ ہیں، لیکن حضرۃ فاطمہ رضؓ کی عزت تین اعتبارات سے ہے۔ اوّلاً یہ کہ وہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بہت ہی پیاری بیٹی ہیں۔ ثانیاً یہ کہ وہ حضرت علیؓ کی زوجۂ محترمہ ہیں۔ ثالثاً یہ کہ وہ امام حسنؓ اور امام حسینؓ کی مادرِ مشفقہ ہیں۔

اوّل الذکر نے خیر الامم یعنی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو تفرقہ اور انتشار سے بچانے کے لیے خلافت سے دست برداری قبول کی اور آخر الذکر نے مسلمان کو حریت کا سبق پڑھایا، اور اپنی شہادت سے نوائے

زندگی میں سوز و گداز کا رنگ پیدا کر دیا یہ خوبیاں ان دونوں حضرات میں حضرۃ فاطمہ رضؓ ہی کی بدولت پیدا ہوئی تھیں۔

اگر حضرۃ فاطمہ رضؓ کی سیرت کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کی زندگی شیوۂ تسلیم و رضا کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اور چونکہ یہ شیوہ اسلام کی روح ہے۔ اس لئے وہ قیامت تک مسلمان عورتوں (ماؤں) کے لیے کامل نمونہ ہیں۔

ان کے دل میں ہمدردی کا مادہ اس درجہ تھا کہ ایک مرتبہ انہوں نے ایک محتاج کی امداد کے لئے اپنی چادر ایک یہودی کے ہاتھ فروخت کر دی تھی۔

اگرچہ ساری کائنات اُن کی فرمانبردار تھی لیکن وہ اپنے شوہر کی فرمانبردار تھیں۔ چونکہ اُن کے شوہر نے دُنیاوی آسائشوں سے اپنا تعلق منقطع کر لیا تھا[1] اس لئے اُنھوں نے بھی ساری عمر فقر و فاقہ ہی میں بسر کی چنانچہ تاریخ

---

[1] حضرت علی رضؓ بیشک تارک الدنیا تھے لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اُن کا یہ فعل رہبانیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ راہب دُنیا کو فتح کرنے سے پہلے ہی اُسے ترک کر دیتا ہے اور یہ ترک، اسلام میں بلاشبہ مذموم ہے۔ لیکن اگر کوئی اللہ تعالیٰ کا عاشق دنیا کو فتح کرنے کے بعد اُس پر لات مار دے تو یہ ترک، اسلام میں محمود ہی نہیں بلکہ عین اسلام ہے۔ اسلام آخر الذکر تارک الدنیا کی مذمت نہیں کرتا۔ ہاں اول الذکر تارک الدنیا سے ضرور بیزار ہے۔ یہی اسلام اور رہبانیت میں نازک سا فرق ہے۔ ۱۲

میں مذکور ہے کہ چکی پیستے پیستے اُن کی ہتھیلیوں میں گھٹے پڑ گئے تھے۔ عسرت کی زندگی کے باوجود وہ کسی وقت تلاوتِ قرآن اور یادِ الٰہی سے غافل نہیں ہوئیں۔

ع آسیا گردان و لب قرآن سرا

یعنی چکی پیستے وقت بھی کلام اللہ کی تلاوت کرتی رہتی تھیں۔ اور جب نماز پڑھنے کھڑی ہوتی تھیں، تو اُن کی جائے نماز آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھی۔ جبرئیلؑ ان کے اشکوں کو بحفاظتِ تمام زمین سے اٹھا کر لے جاتے اور بارگاہِ ایزدی میں پیش کر دیتے۔

اگر مجھے شریعتِ محمدیہ کا پاس نہ ہوتا (کہ قبر کو سجدہ ممنوع ہے) تو میں حضرۃ فاطمہؓ کی تربت کا طواف کرتا اور اپنی پلکوں سے جھاڑ دیتا۔ اور اُن کی بارگاہ میں اپنے سجدوں کا نذرانہ پیش کرتا۔

خطاب بہ مخدّراتِ اسلام

مسلمان عصمت مآب عورتوں سے خطاب

اے ردایت پردۂ ناموسِ ما (۱) تابِ تو سرمایۂ فانوسِ ما
طینتِ پاکِ تو ما را رحمت است قوّتِ دین و اساسِ ملّت است
کودکِ ما چوں لب از شیرِ تو شست لَا اِلٰہ آموختی او را نخست
می تراشد مہرِ تو اطوارِ ما فکرِ ما گفتارِ ما کردارِ ما
برقِ ما کو در سحابت آرمید بر جبل رخشید و در صحرا تپید
اے امینِ نعمتِ آئینِ حق در نفسہائے تو سوزِ دینِ حق
دورِ حاضر تر فروش و پُرفن است کاروانش نقدِ دیں را رہزن است
کور و یزداں ناشناس ادراکِ او ناکساں زنجیریِ پیچاکِ او
چشمِ او بیباک و ناپروا ستے پنجۂ مژگانِ او گیرا ستے
صیدِ او آزاد خواند خویش را کشتۂ او زندہ داند خویش را
آب بندِ نخلِ جمعیت توئی حافظِ سرمایۂ ملّت توئی
از سرِ سود و زیاں سودا مزن گام جز بر جادۂ آبا مزن

---

(۱) ردا: چادر ۱۲۔

ہوشیار از دستبردِ روزگار
گیر فرزندانِ خود را در کنار
این چمن زاداں کہ پر نگشادہ اند
ز آشیانِ خویش دور افتادہ اند
فطرتِ تو جذبہ ہا دارد بلند (۱)
چشمِ ہوش از اسوۂ زہرا رضی اللہ عنہا مبند
تا حسینے شاخِ تو بار آورد
موسمِ پیشیں بگلزار آورد

(فصل بست و دوم)

کہتے ہیں کہ اے مسلمان خاتون! تیری چادر قوم کی عزت کی محافظ ہے۔ تیری دینداری (تاب) ہماری قومی زندگی (فانوس) کا سرمایہ ہے، یعنی تیری دینداری کی بدولت قوم میں دینداری کا رنگ باقی ہے۔

تیری پاکیزہ طینت (سرشت) ہمارے حق میں باعثِ رحمت ہے، اسی کی بدولت دین کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اور اسی پر ہماری ملت کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

تو ہی مسلمان بچوں کو کلمۂ توحید سکھاتی ہے۔ تو ہی اُن کی سیرت کو اسلام کے سانچہ میں ڈھالتی ہے۔ ہمارے اطوار، افکار اور کردار سب تیری ہی آغوشِ شفقت میں تشکیل پذیر ہوتے ہیں۔

---

(۱) اسوہ: نمونہ ۱۲۔

تُو شریعتِ محمدیہ کی امین اور محافظ ہے، اور تیری زندگی اسلام کی محبت کی آئینہ دار ہے۔

اے مسلمان خاتون! موجودہ زمانہ (عصرِ حاضر) عیّاری، مکّاری اور فریب کاری کا زمانہ ہے، اور اس کی تمام تر کوشش یہ ہے کہ مسلمان قوم اپنے دین سے بیگانہ ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے دورِ حاضر نے بہت سے کارکن متعین کر دیئے ہیں۔ جو اسلام کا لیبل چپکا کر مسلمانوں کو اسلام سے متنفّر کر رہے ہیں۔

اِس دَور کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ لوگوں کو خدا سے بغاوت کا درس دے رہا ہے۔ چنانچہ جو لوگ عقل و خرد سے عاری ہیں وہ اس کے پَیروکار ہوتے جاتے ہیں۔

دُوسری خصوصیت اس دَور کی یہ ہے کہ وہ بے حیائی کو انسانوں کی نگاہوں میں محبوب بنا رہا ہے۔

ع   حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی

یعنی اس نے عریانی اور بے حجابی (بے حیائی) کو فیشن میں داخل کر دیا ہے۔ اس کی نگاہوں میں ایسا جادو ہے کہ جسے ایک نظر دیکھ لیتا ہے وہ اس کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے۔ اس کی پلکوں میں غضب کی کشش ہے۔!

تیسری خصوصیت اس دور کی یہ ہے کہ جو لوگ اس کے طلسم میں گرفتار ہو جاتے ہیں یعنی اس کی برائیوں کے غلام ہو جاتے ہیں وہ اپنے آپ کو آزاد تصوّر کرنے لگتے ہیں۔ اور جن لوگوں کو یہ دور (رُوحانی اعتبار سے) فنا کر دیتا ہے

وہ اس موت کو زندگی سمجھ لیتے ہیں۔

اندریں حالات اے مسلمان خاتون! تُو اپنا فرض پہچان! تُو قوم کی شیرازہ بند ہے بلکہ اس کی محافظ ہے۔ اس لئے تُو سلفِ صالحین کی پیروی کر یعنی مغربی عورتوں کے بجائے اُن مسلمان عورتوں کی تقلید کر جنہوں نے اسلام کی خدمت کی۔ اگر ہو سکے تو حضرۃ فاطمہ رضؓ کی تقلید کر تاکہ تیری آغوش سے ایسے نوجوان تربیت پاکر نکلیں جو امام حسینؓ کے نقشِ قدم پر چل سکیں۔

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

خلاصۂ مطالبِ مثنوی

در تفسیرِ سورۂ اخلاص

قُل ھُوَ اللّٰہُ اَحَد

من شبے صدیقؓ را دیدم بخواب — گل ز خاکِ راہِ او چیدم بخواب

آں امنّ الناس بر مولائے ما (۱) — آں کلیمِ اوّلِ سینائے ما

ہمتِ او کشتِ ملت را چو ابر — ثانیِ اسلام و غار و بدر و قبر

گفتمش اے خاصۂ خاصانِ عشق — عشقِ تو سرِ مطلعِ دیوانِ عشق

پختہ از دستت اساسِ کارِ ما — چارہ فرما پے آزارِ ما

گفت تا کے در ہوس گردی اسیر — آب و تاب از سورۂ اخلاص گیر

---

(۱) امنّ الناس علیّ فی صحبتہٖ ومالہٖ ابوبکرٍ (حدیث)

اینکہ در صد سینہ پیچد یک نفس — سرّے از اسرارِ توحید است و بس
رنگِ او بر کن مثالِ او شوی — در جہاں عکسِ مثالِ او شوی
آنکہ نامِ تو مسلماں کردہ است — از دوئی سوئے یکی آوردہ است
خویشتن را ترک و افغاں خواندۂ — وائے بر تو آنچہ بودی ماندۂ
وارہاں نامیدہ را از نامہا — ساز با خُم در گذر از جامہا
اے کہ تو رسوائے نام افتادۂ — از درختِ خویش خام افتادۂ
با یکی ساز از دوئی بردار رخت — وحدتِ خود را مگرداں لخت لخت
اے پرستارِ یکی گر تو توئی — تا کجا باشی سبق خوانِ دوئی
تو درِ خود را بخود پوشیدۂ (۱) — در دل آور آنچہ بر لب چیدۂ
صد ملل از ملتے انگیختی — بر حصارِ خود شبیخوں ریختی
یک شو و توحید را مشہود کن — غائبش را از عمل موجود کن

لذتِ ایماں فزاید در عمل
مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل

(فصل بست سوم)

تمہید۔ اس اہم باب میں اقبال نے اسرار اور رموز دونوں مثنویوں کا خلاصہ سورۂ اخلاص کی تفسیر کے ضمن میں پیش کیا ہے۔ یہ تفسیر بالکل انوکھی ہے۔ جس کی نظیر غالباً قدماء کی تفاسیر میں نہ مل سکے۔ چونکہ

---

(۱) پوشیدن: بمعنی بستن

اس میں جدّت پائی جاتی ہے، اس لیے مصلحتاً اقبالؔ نے اس کو حضرت صدیقِ اکبرؓ سے منسوب کر دیا ہے۔

جدّت کا پہلو یہ ہے کہ عام طور سے مفسّرین نے اس سورت کی تفسیر میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا بیان کیا ہے کہ وہ (۱) احد ہے (۲) صمد ہے (۳) لم یلد ولم یولد ہے (۴) لم یکن لہٗ کفواً احد کا مصداق ہے۔ لیکن اقبالؔ نے ان صفاتِ اربعہ سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے:۔

(۱) جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی ذات و صفات کے اعتبار سے یکتا ہے مسلمان کو بھی اپنے اندر بقدرِ بشری یکتائی کی شان پیدا کرنی چاہیئے۔

(۲) جس طرح اللہ تعالیٰ صمد ہے یعنی کسی طاقت کا محتاج نہیں ہے، اُسی طرح مسلمان کو بھی اپنے اندر شانِ بے نیازی پیدا کرنی چاہیئے۔

(۳) جس طرح خدا مادی علائق سے پاک ہے، اسی طرح ملّتِ اسلامیہ کو بھی وطن، نسب، رنگ اور نسل کے امتیازات سے بالاتر ہونا چاہیئے۔

(۴) جس طرح اللہ تعالیٰ کا کوئی ہمسر نہیں ہے، اُسی طرح ملّتِ اسلامیہ کو ایسی سربلندی حاصل کرنی چاہیئے کہ کوئی قوم اس کی ہمسری کا دعویٰ نہ کر سکے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ اقبالؔ نے پہلی اور دوسری صفت کو فرد سے، اور تیسری اور چوتھی صفت کو ملّت سے متعلق کیا ہے، گویا اُن صفاتِ اربعہ کے ضمن میں اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی دونوں کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔

(صفتِ اوّل)

تمہید:۔ اس آیت کا لفظی ترجمہ تو یہی ہے کہ تو کہہ کہ اللہ ایک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کمالِ ذات و صفات کے لحاظ سے یکتا ہے۔ کمالِ ذات تو یہ ہے کہ بس وہی واجب الوجود ہے، اور اس کے علاوہ تمام کائنات ممکن الوجود ہے، اور کمالِ صفات یہ ہے کہ اس کی تمام صفات بھی اس کی ذات کی طرح قدیم اور محیطِ کُل ہیں۔

اگرچہ قرآنِ حکیم نے توحیدِ الٰہی کو لفظِ واحد سے بھی بیان کیا ہے مثلاً وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۔ لیکن یہاں اس کی شانِ یکتائی کا اظہار مقصود ہے۔ یعنی وہ ایسا واحد ہے کہ اس میں کثرت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ نہ جنسی نہ نوعی، نہ عددی، نہ مقداری، نہ اعتباری، اس لئے یہاں واحد کے بجائے احد کا لفظ استعمال کیا۔ انسان کے دماغ میں واحد سے پہلے نصف کا، اور واحد کے بعد اثنین کا تصوّر آسکتا ہے۔ لیکن احد کا لفظ ان دونوں تصوّرات کی نفی کر دیتا ہے، یعنی اللہ ایسا ایک ہے کہ اس کی نظیر یا مثال کائنات میں کہیں موجود نہیں ہے۔ یعنی لفظِ احد میں وحدتِ ذاتی اور شانِ یکتائی دونوں تصوّرات مخفی ہیں۔

اَللّٰهُ اَحَدٌ نے شرک کی حسبِ ذیل صورتوں کی نفی کر دی:۔

(۱) شرک فی الوجود۔ یعنی اللہ تعالیٰ وجود کے لحاظ سے یکتا ہے۔ بایں معنی کہ اس کا وجود حقیقی، ذاتی، اصلی اور خانہ زاد ہے۔ باقی تمام موجودات کا

وجود مجازی، عارضی، ظلّی اور مستعار ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حقیقت، وجود ہے۔
اس کے علاوہ ساری کائنات کی حقیقت، عدم ہے۔ اس لئے وہ وجود کے
اعتبار سے یکتا ہے۔

(۲) شرک فی الوجوب۔ یعنی اللہ تعالیٰ وجوب کے لحاظ سے یکتا ہے۔
بایں معنیٰ کہ صرف وہی واجب الوجود ہے۔ اس کا وجود ایسا ہے کہ اس کے عدم کا
تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ساری کائنات ممکن الوجود ہے۔ ممکن اُسے کہتے ہیں
جس کے وجود اور عدم دونوں کا امکان ہو۔ اِسی لئے ممکن کی ماہیت عدم ہوتی
ہے۔ جب واجب اُسے موجود کرنا چاہتا ہے تو موجود ہو جاتا ہے۔

(۳) شرک فی الصفات۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی صفات کے لحاظ سے یکتا
ہے۔ بایں معنیٰ کہ اس کے علاوہ کائنات میں کوئی ہستی نہ قادرِ مطلق ہے، نہ
خالق ہے، نہ رازق ہے، نہ علیم ہے، نہ مؤثر فی الوجود ہے، نہ مُحیی ہے، نہ مُمیت
ہے، نہ علیٰ کُلِّ شیئٍ شہید ہے، نہ ہمہ داں ہے، نہ ہمہ بیں ہے، نہ ہمہ جا حاضر ہے۔

(۴) شرک فی العبادت، یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی ہستی معبود نہیں ہے۔

(۵) شرک فی الحکم۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی ہستی حکمران نہیں ہے۔

نوٹ:۔ قرآنِ حکیم کے علاوہ دُنیا کی کسی کتاب نے شرک کی مذکورہ بالا اقسام
کا ابطال نہیں کیا۔ بخوفِ طوالت تفصیل سے اجتناب کرتا ہوں۔ اگر توفیقِ
ایزدی شاملِ حال ہوئی تو اپنی مجوزہ تالیف "خصوصیاتِ قرآن" میں اس کی
وضاحت پیش کر دوں گا۔ ۱۲

کہتے ہیں کہ میں نے ایک رات حضرت صدیقِ اکبرؓ کو خواب میں دیکھا۔

اور اُن کے ارشادات سے علمی رنگ میں استفادہ کیا۔ یہ صدیق اکبرؓ وہی ہیں جن کی شان میں سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم نے یہ فرمایا:۔

اَمَنَّ النَّاسِ عَلَیَّ فِی صُحْبَتِہٖ وَمَالِہٖ اَبُوْبَکْرٍؓ۔

یعنی دُنیا کے تمام انسانوں میں صحبت ورفاقت اور مال ودولت کے اعتبار سے ابوبکرؓ نے مجھ پر سب سے زیادہ احسانات کیے ہیں۔

آنجنابؓ، مردوں میں سے سب سے پہلے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے۔ اور آپ کے ایمان کی خصوصیت (جس میں دوسرا شریک نہیں ہے) یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ دُنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس پر میں نے اسلام پیش کیا، اور اُس نے کچھ تردّد کا اظہار نہ کیا ہو۔ لیکن ابوبکرؓ نے کسی قسم کے تردّد کا اظہار نہیں کیا"

آنجنابؓ نے فتنۂ ارتداد کے موقع پر جس ہمت کا مظاہرہ کیا۔ اس کی بدولت اسلام کو دوبارہ استحکام نصیب ہوا۔ آپؓ کی ہمّت (عزمِ صدیقی) سے مِلّت کی کھیتی ہری ہوگئی۔ اس شعر کا دوسرا مصرعِ بلاغت کے اعتبار سے بے نظیر ہے۔ اقبالؔ نے اس ایک مصرع میں صدیقِ اکبر کی پوری زندگی قلمبند کردی ہے۔ اس کا بنیادی تصور اس آیت سے ماخوذ ہے۔

ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ ھُمَا فِی الْغَارِ۔

یعنی اُن دو میں سے دُوسرا جو غار میں پوشیدہ ہوئے تھے۔

لفظِ ثانی میں بھی معنویت پائی جاتی ہے۔ کیونکہ یہاں اس لفظ سے "دوسرا" بھی مُراد ہے اور رفیقِ کار یا ساتھی (صاحب) بھی مُراد ہوسکتا ہے۔

اور اس میں کیا شک ہے کہ صدیقِ اکبرؓ اسلام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دوسرے مومن ہیں۔ اور غار میں دو میں سے دوسرے تھے۔ یعنی ثانی بھی اور صاحب (رفیق) بھی۔ اسی طرح تمام جنگوں (بدر سے یہاں تمام غزوات مراد ہیں۔ یہ مجازِ عقلی ہے کہ جزبول کر کُل مراد لی ہے) میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت اور سنگت کا شرف ہوا اور وفات کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلوئے مبارک و مطہر میں جگہ ملی۔

اس مختصر مگر جامع منقبت کے بعد کہتے ہیں کہ میں نے حضرتؓ سے عرض کی کہ ہمارے مصائب کا کوئی حل تجویز فرمائیے۔ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ تُو کب تک مبتلائے ہوا و ہوس رہے گا؟ سورۂ اخلاص کے معانی پر غور کر! اس میں تیری قوم کی تمام مصیبتوں کا حل موجود ہے۔

(۱) اللہ ایک ہے۔ زندگی بھی ایک ہی ہے۔ وہی نفس جو تیرے سینہ میں ہے۔ اس شعر کا مضمون اس آیت سے ماخوذ ہے:۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ۔

ہم نے تم کو نفسِ واحدہ سے پیدا کیا ہے۔

(یہاں آیت میں نفس بمعنی ذات ہے۔ مصرع میں نفس بمعنی سانس ہے)

(۲) پس اے مسلمان! تو اس کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگ لے تاکہ تُو بھی اس کی طرح یکتا اور یگانہ ہو جائے۔ اسی حقیقت کو اقبالؔ نے یوں بیان کیا ہے:۔

رہے گا تُو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا
اتر گیا جو ترے دل میں لاشریک لہٗ

اے مسلمان! اللہ تعالیٰ نے تیرا نام "مسلم" رکھا ہے۔ اس میں راز یہ ہے کہ اس طرح تیرے اندر وحدت پیدا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اسلام اُن امتیازات کو جو وطن، نسل، رنگ، زبان، نسب یا قبیلہ کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں، مٹا دیتا ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ تو نے اپنے آپ کو ترک، افغانی، مصری اور ہندی کہنا اور سمجھنا شروع کر دیا۔ اس لیے تُو اپنی اصلیت کو کھو بیٹھا۔

تو سبو (قوم) کو اسماء (ترکی، ایرانی، مصری، شامی وغیرہ) سے پاک کر دے۔ اسلام (خُم) موافقت کر، وطن یعنی وطنیت (جام) سے تعلق منقطع کر لے۔

تُو اپنے اندر وحدت (یکی) کا رنگ پیدا کر اور کوئی ایسی بات مت کر جس سے یہ وحدت زائل ہو جائے۔

اے پرستارِ توحیدِ الٰہی! اگر تو واقعی مسلمان ہے تو کب تک دوئی کے طلسم میں گرفتار رہے گا؟

اللہ نے تجھے ملّتِ اسلامیہ بنایا تھا۔ لیکن تو نے اس ملّتِ واحدہ کو سینکڑوں ملّتوں (قوموں) میں منقسم کر دیا۔ بالفاظِ دگر، تو نے اپنی بنیاد کو اپنے ہاتھوں برباد کر دیا۔

میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ اپنے اندر وحدتِ ملّی کا رنگ پیدا کر۔ تاکہ تُو توحید کے عقیدہ کو اپنے عمل سے دُنیا پر واضح کر سکے۔ اگر تیری قوم واقعی اللہ کو ایک تسلیم کرتی ہے تو پھر اسے اپنے اندر بھی وحدت پیدا کرنی چاہیے۔

تاکہ عقیدہ اور عمل میں مطابقت پیدا ہو سکے۔

یاد رکھو! عمل ہی سے ایمان کی لذت میں اضافہ ہو سکتا ہے اگر تمہارا ایمان (عقیدہ) تمہیں عمل پر مائل نہیں کر سکتا تو بلاشبہ وہ ایمان بالکل مردہ ہے۔ پس اگر تم وحدت کے پرستار ہو تو اپنے اندر بھی وحدت پیدا کرو۔ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ ایک ہے تم سب مسلمان بھی ایک بن جاؤ۔ اور وطن، نسل، رنگ اور نسب کے تمام امتیازات کو فنا کر دو۔

اَللّٰہُ الصَّمَدُ

گر به الله الصمد دل بسته‌ای — از حدِ اسباب بیرون جسته‌ای
بندهٔ حق بندهٔ اسباب نیست — زندگانی گردشِ دولاب نیست
مسلم استی بی نیاز از غیر شو — اهلِ عالم را سراپا خیر شو
پیشِ منعم شکوهٔ گردوں مکن — دستِ خویش از آستیں بیروں مکن
چوں علیؓ در ساز با نانِ شعیر — گردنِ مرحب شکن خیبر بگیر
منّت از اهلِ کرم بُردن چرا — نشترِ لا و نعم خوردن چرا
رزقِ خود را از کفِ دوناں مگیر — یوسفؑ استی خویش را ارزاں مگیر
گرچه باشی مور و هم بے بال و پر — حاجتے پیشِ سلیمانے مبر
راه دشوار است ساماں کم بگیر — در جهاں آزاد زی آزاد میر
سبحهٔ اَقلل مِنَ الدُّنیا شمار (۱) — از تَعِش حُرّاً شوی سرمایه دار
تا توانی کیمیا شو گِل مشو — در جهاں منعم شو و سائل مشو
اے شناسائے مقامِ بوعلیؒ — جرعهٔ آرم ز جامِ بوعلیؒ
"پشتِ پا زن تختِ کیکاوس را — سر بده از کف مده ناموس را"

خود بخود گردد درِ میخانه باز
بر تهی پیمانگانِ بے نیاز

---

(۱) اَقلِل مِنَ الدُّنیا تَعِش حُرّاً (قولِ فاروقؓ)

قایدِ اسلامیان ہارون رشید (۱) آنکہ نقفور آبِ تیغِ او چشید
گفت مالکؓ را کہ اے مولائے قوم روشن از خاکِ درت سیمائے قوم
اے نوا پردازِ گلزارِ حدیث از تو خواہم درسِ اسرارِ حدیث
لعل تا کے پردہ بند اندر یمن خیز و در دار الخلافت خیمہ زن
اے خوشا تابانیِ روزِ عراق اے خوشا حُسنِ نظر سوزِ عراق
می چکد آبِ خضرؑ از تاکِ او مرہم زخمِ مسیحاؑ خاکِ او
گفت مالکؓ مصطفےؐ را چاکرم نیست جز سودائے او اندر سرم
من کہ باشم بستۂ فتراکِ او بر نخیزم از حریمِ پاکِ او
زندہ از تقبیلِ خاکِ یثربم خوشتر از روزِ عراق آید شبم
عشق می گوید کہ فرمانم پذیر پادشاہاں را بخدمت ہم مگیر
تو ہمی خواہی مرا آقا شوی بندۂ آزاد را مولا شوی
بہرِ تعلیمِ تو آیم بر درت خادمِ ملت نگردد چاکرت
بہرہ خواہی اگر از علمِ دیں در میانِ حلقۂ درسم نشیں

بے نیازی نازہا دارد بسے
نازِ او اندازہا دارد بسے

بے نیازی رنگِ حق پوشیدن است رنگِ غیر از پیرہن شوئیدن است
علمِ غیر آموختی اندوختی روئے خویش از غازہ اش افروختی

---

(۱) نقفور: رُومی بادشاہ جس کو ہارون نے متعدد بار شکست دی۔

ارجمندی از شعارش می بری — من ندانم تو توئی یا دیگری
از نسیمش خاکِ تو خاموش گشت — وز گل و ریحاں تہی آغوش گشت
کشتِ خود از دستِ خود ویراں مکن — از سحابش گدیۂ باراں مکن
عقلِ تو زنجیریٔ افکارِ غیر — در گلوئے تو نفس از تارِ غیر
بر زبانت در گلوہا مستعار — در دلِ تو آرزوہا مستعار
قمریانت را نواہا خواستہ — سروہایت را قباہا خواستہ
بادہ می گیری بجام از دیگراں — جام ہم گیری بوام از دیگراں
آں نگاہش سرِّ مَازَاغَ الْبَصَر (۱) — سوئے قوم خویش باز آید اگر
می شناسد شمعِ او پروانہ را — نیک داند خویش و ہم بیگانہ را

"لَسْتَ مِنِّی" گویدت مولائے ما (۲)
وائے ما اے وائے ما اے وائے ما

زندگانی مثلِ انجم تا کجا — ہستیٔ خود در سحر گم تا کجا
ریوے از صبحِ دروغے خوردۂ (۳) — رخت از پہنائے گردوں بردۂ
آفتاب استی یکے در خود نگر — از نجومِ دیگراں تابے مخر
بر دلِ خود نقشِ غیر انداختی — خاک بُردی کیمیا در باختی

---

(۱) مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (آیۂ شریفہ)
(۲) لَسْتَ مِنِّی: یعنی تو میری قوم سے نہیں ہے ۱۲۔
(۳) ریو: فریب ۱۲۔

تا کجا رخشی ز تاب دیگراں
سر سبک سازاز شراب دیگراں

تا کجا طوفِ چراغِ محفلے
ز آتشِ خود سوز اگر داری دلے

چوں نظر در پردہ ہائے خویش باش
می پرد اتا بجائے خویش باش

در جہاں مثلِ حباب اے ہوشمند
راہِ خلوت خانہ بر اغیار بند

فردِ فرد آمد کہ خود را وا شناخت
قوم قوم آمد کہ جز با خود نساخت

از پیام مصطفےٰ آگاہ شو
فارغ از اربابِ دون اللہ شو

(صفتِ ثانی)

تمہید:۔ صمد کے لغوی معنی ہیں وہ ٹیلہ جس پر چڑھ کر کوئی شخص سیلاب کے وقت اپنی جان بچالے یا وہ سردار جس کے پاس مصیبت کے وقت قبیلہ کے افراد اکٹھے ہو جائیں۔ یعنی وہ شخص جسے دوسروں کی احتیاج نہ ہو لیکن دوسروں کو اس کی احتیاج ہو۔ اللہ الصمد کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کسی کا محتاج نہیں ہے لیکن ساری مخلوقات اس کی محتاج ہے۔ صمد کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قیوم ہے یعنی بذاتِ خود قائم ہے۔ اسے دوسروں کی حاجت نہیں ہے یعنی کافی اور مکتفی بالذات ہے۔ اقبال یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ صمد ہے تو ان کو بھی اپنے اندر صمدیت کی شان پیدا کرنی چاہئیے۔

اس صفت میں چار بند ہیں۔

پہلے بند میں اقبالؔ نے قوم کو بے نیازی کا درس دیا ہے۔ دوسرے بند میں انہوں نے امام مالکؒ کی زندگی سے شانِ بے نیازی کی مثال پیش کی ہے، تاکہ اس دور کے غلام اس سے عبرت حاصل کریں۔ تیسرے بند میں بے نیازی کا مفہوم واضح کرنے کے بعد مسلمانوں کی حالتِ زار پر تبصرہ کیا ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں غیروں کے غلام ہیں۔ چوتھے بند میں مسلمانوں کو اصلاحِ حال کی تلقین کی ہے یعنی اگر وہ مسلمان بننا چاہتے ہیں تو ان کو غیر اللہ سے یکسر قطع تعلق کر لینا چاہیئے۔

پہلا بند:- کہتے ہیں کہ اے مسلمان! اگر تو حقیقی معنی میں اللہ تعالیٰ کو اپنا کارساز اور دستگیر (صمد) تسلیم کر لے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ تو انسانوں کی غلامی سے آزاد ہو جائے گا۔ یعنی تیرے اندر بھی بے نیازی کی شان پیدا ہو جائے گی۔

اقبالؔ اس سے پہلے یہ بنیادی نکتہ بیان کر چکے ہیں کہ:-

ع رنگِ او بر کن مثالِ او شوی

یعنی مسلمان کا نصب العین یہ ہے کہ وہ اپنے اندر صفاتِ ایزدی کا رنگ پیدا کر لے اور یہ نکتہ دراصل اس آیۂ شریفہ سے ماخوذ اور مستنبط ہے:-

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ؕ

ہم تو دین کی اس حالت پر ہیں جس میں ہم کو اللہ تعالیٰ نے رنگ دیا ہے۔ اور کون ہے بہتر خدا سے رنگ عطا کرنے میں۔

اب اللہ تعالیٰ کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ صمد ہے یعنی سب اس کے محتاج ہیں۔ لیکن وہ کسی کا محتاج نہیں ہے یعنی وہ بے نیاز ہے۔ اس لئے مسلمان کا فرض ہے کہ وہ بھی اپنے اندر بقدر طاقتِ بشری، محدود دائرہ میں، اس صفت کا رنگ پیدا کرے۔ اس کی صورت یہ ہے۔ کہ وہ ماسوی اللہ سے قطع نظر کر لے اور اللہ تعالیٰ کو اپنا وکیل، کارساز، دستگیر اور مشکل کشا یقین کرے۔

جب وہ ایسا کرے گا تو لامحالہ اس کے اندر بے نیازی کی شان پیدا ہو جائے گی۔ تصوّفِ اسلام کی بنیادی تعلیم یہی ہے کہ ماسوی اللہ سے قطع نظر کرلو کیونکہ اللہ کے سوا کسی میں کسی قسم کی طاقت یا قوت نہیں ہے۔ چنانچہ آیہ شریفہ مَاشَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ اس پر شاہد ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب مرشدی و سیّدی شیخ العالم حضرت فرید الحق والدین المعروف بہ گنج شکر اجودھنیؒ نے بلبن کو سفارشی خط لکھا تھا تو اس کا اندازہ یہ تھا، "اے بادشاہ اگر تو اس شخص کی حاجت پوری کر دے گا تو در اصل حاجت روا اور معطی تو اللہ ہی ہے لیکن تو مشکور ہوگا۔ اور اگر ایسا نہ کرے تو در اصل مانع اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس لئے تو تو معذور ہوگا۔"

ناظرین ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ اگر حضرت موصوفؒ اپنے اندر شانِ بے نیازی پیدا نہ کر لیتے تو کیا وہ ایک بادشاہ کو اس قسم کا خط لکھ سکتے تھے؟ یہ شان ان میں کیسے پیدا ہوئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے دل میں اس بات کا کامل یقین پیدا کر لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا

اس کائنات میں نہ کوئی کسی کو کچھ دے سکتا ہے نہ کسی سے کچھ چھین سکتا ہے۔ کیونکہ کسی میں کسی قسم کی قدرت ہی نہیں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ خالقِ کائنات بھی ہے اور خالقِ اسباب بھی ہے۔ سارے اسباب اُسی کے مطیع ہیں۔ جب وہ کسی کو کچھ دینا چاہتا ہے تو ایسے اسباب پیدا کر دیتا ہے کہ وہ شے اس شخص کو مِل جاتی ہے۔

مُفت کیوں اپنی جان کھوتا ہے　　سارے اسباب ہیں اُسی کے مطیع
جو خدا چاہتا ہے ہوتا ہے　　ہر گھڑی رکھ اسی پہ اپنی نگاہ

دل میں تو ضعفِ عقیدت کو کبھی راہ نہ دے
کوئی کچھ دے نہیں سکتا اگر اللہ نہ دے　　(اکبر)

اسی لئے سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فتوح الغیب میں فرماتے ہیں:۔
لَا فَاعِلَ فِی الْحَقِیْقَةِ اِلَّا اللّٰہِ۔

جب تک ایک مسلمان تصوف کے اس بنیادی نکتہ پر ایمان نہ لائے کہ فاعلِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، اس کے اندر قیامت تک، بے نیازی کی شان پیدا نہیں ہو سکتی۔ جب تک انسان غیر اللہ کو فاعلِ حقیقی سمجھتا رہے گا، اس میں سب سے قطع تعلق کر کے اللہ کی طرف رجوع کا داعیہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اور جب تک یہ کیفیت پیدا نہ ہو، اس میں بے نیازی کی شان کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ پس تصوف کا خلاصہ یہی ہے اور چونکہ اسلام بھی یہی سکھاتا ہے، اس لئے تصوف عین اسلام ہے اور اسلام عین تصوف ہے۔ اور یہی راقم الحروف کا مسلک ہے۔

اِن تصریحات کے بعد اب پہلے دو شعروں کا مطلب بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر تو اللہ کو صمد یعنی حاجت روا یقین کرلے تو اسباب کی حدود سے باہر نکل جائے گا۔ یعنی تو اسباب کی غلامی سے آزاد ہو جائے گا۔ یاد رکھ! جو انسان "بندۂ حق" بن جاتا ہے یعنی اللہ کا ہو جاتا ہے تو اللہ اس کا ہو جاتا ہے اور جب اللہ اس کا (کارساز) ہو گیا تو وہ اسباب کی بندگی (غلامی) یا احتیاج سے آزاد ہو جائے گا۔ قرآنِ حکیم خود اس پر شاہد ہے۔

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ ؕ (۳۹، ۳۶)

کیا اللہ اپنے بندے کی حفاظت کے لئے کافی نہیں ہے۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ اے مسلمان! قرآنِ حکیم کی رُو سے انسانی زندگی چکر یا دائرہ (گردشِ دولاب) نہیں ہے۔ یعنی

(۱) فلسفہ کی تعلیم یہ ہے کہ زندگی، خوراک پر موقوف ہے، خوراک اناج سے حاصل ہوتی ہے۔ اناج، بارش پر موقوف ہے، بارش بادلوں پر، اور بادل آفتاب پر، گویا دنیا میں ہر طرف، ہر جگہ علت اور معلول کا چکر چل رہا ہے اور ہر انسان اس چکر میں مبتلا ہے۔ لیکن قرآنِ حکیم یہ کہتا ہے کہ ساری کائنات اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہے، وہی آفتاب کو روشنی عطا کرتا ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ وہی رزاقِ حقیقی ہے۔

(۲) دیگر مذاہب مثلاً ہندو دھرم، جین دھرم اور بودھ دھرم کی تعلیم یہ ہے کہ

(۱) کرم (عمل) سے جنم ہوتا ہے یعنی جسم ملتا ہے۔

(۲) جسم سے انسان کرم کرتا ہے۔

(۳) کرم سے (اگر وہ اچھے ہوں) مکتی (نجات) ملتی ہے۔

(۴) مکتی ایک مقررہ مدت کے لیئے ہے۔

(۵) اس کے بعد پھر جنم ہوگا اور جنم سے کرم یعنی پھر وہی پہلا چکر شروع ہو جائے گا۔ اس چکر کو اقبال نے گردشِ دولاب سے تشبیہ دی ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ یہ تشبیہ نہایت برمحل ہے۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ زندگی چکر نہیں ہے بلکہ ارتقائی حرکت کا نام ہے۔ اور چونکہ ارتقاء حرکت یا تغیر پر مبنی ہے اس لیئے عرفِ عام میں اقبال نے اسے مسلسل حرکت سے ہی تعبیر کیا ہے۔ حرکت نہ ہو تو تغیر نہیں ہو سکتا۔ اور تغیر نہ ہو تو ارتقاء نہیں ہو سکتا۔ اسی بات کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے:

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

یعنی زندگی غیر محدود ترقی (پرواز) کا نام ہے۔ یہ نکتہ قرآنِ حکیم کی اس آیت سے ماخوذ ہے۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۔

مگر جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیئے تو ان کے لیئے اس قدر ثواب ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوگا۔

یہ آیت نصِ صریح ہے اس بات پر کہ اجر کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اس سے ثابت ہوا کہ ماجور (یعنی وہ شخص جسے اجر دیا جائے گا) بھی ختم نہیں ہوگا۔ یعنی

وہ رُوحانیت میں برابر ترقی کرتا رہے گا۔

غرض کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے زندگی مسلسل ترقی کا نام ہے نہ کہ دائرہ کی صورت میں گردش کرنے کا۔

اقبال نے جو کچھ کہنا تھا وہ ان دونوں شعروں میں کہہ دیا اب اس کے بعد جو کچھ لکھا ہے وہ اسی بنیادی نکتہ کی توضیح ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ

اے مسلمان! اگر تو حقیقی معنی میں مسلم ہے تو غیر اللہ سے بے نیاز ہو جا، سب تیری طرح اس ذاتِ واحد کے محتاج ہیں، کسی میں کوئی قوت نہیں ہے، جس قدر قوت ہے وہ سب اسی کی طرف سے آتی ہے۔ چنانچہ اس پر یہ آیت شاہد ہے:۔

وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

یعنی اللہ نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور تمہارے اعمال کو بھی۔ یعنی یہ مت سمجھو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں پیدا کر کے تم سے یا کائنات سے بے تعلق ہو گیا ہے (فلسفہ کی یہی تعلیم ہے) بلکہ وہ خود ساری کائنات کا منتظم ہے در اصل فاعلِ حقیقی وہی ہے کیونکہ انسان میں افعال کی جو قدرت ہے وہ اس کی ذاتی نہیں ہے بلکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی عطا کردہ ہے یعنی یہ قدرت، غیر مستقلہ ہے۔

انسان کی قوت اور قدرت غیر مستقلہ اس لئے ہے کہ خود حضرتِ انسان کا وجود اس کا ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ پس جو ہستی اپنے وجود میں غیر کی محتاج ہے، اس کی قدرت یا اس میں جو قوت ہے وہ مستقلہ کیسے ہو سکتی ہے؟ بالفاظ دگر انسان میں قوت اور قدرت ضرور ہے کیونکہ اگر اس کو

قدرت سے عاری مانا جائے تو پھر اس میں اور شجر یا حجر میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ اور سب جانتے ہیں کہ انسان میں قوتِ ارادی ہے۔ جو اس کو شجر یا حجر سے ممتاز کرتی ہے۔

لیکن یہ قوتِ ارادی اس کی ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے یعنی غیر مستقلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت اس کی ذاتی ہے اور قدرتِ مستقلہ، کبھی تو بلاواسطہ اس قدرتِ غیر مستقلہ کے (جو انسان میں ہے) اندر تصرف کرتی ہے جیسا کہ حرکاتِ غیر مستقلہ ارادی میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ مثلاً رحم مادر میں جنین کی حرکات یا مرتعش کے اعضاء کی حرکات۔ اور کبھی اللہ تعالیٰ کی یہی قدرتِ مستقلہ، بواسطہ قدرتِ غیر مستقلہ تصرف کرتی ہے۔ جیسا کہ حرکاتِ ارادی میں اس کا ظہور ہوتا ہے اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ آخر الذکر افعال کو (جو اس کے ارادے سے سرزد ہوں) اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ اسی کا نام قرآن کی اصطلاح میں کسب ہے۔ خالق دونوں قسم کی حرکات (افعال) کا حق تعالیٰ ہی ہے۔ بندوں کے اعتبار سے پہلی صورت کو جبر اور دوسری صورت کو کسب کہتے ہیں۔ (مزید تفصیلات کے لئے علم عقائد پر کوئی کتاب دیکھ لی جائے)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جب ایک مسلمان اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ ساری کائنات اللہ تعالیٰ کی مشیّت کے تابع ہے تو غیر اللہ سے بے نیاز ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کائنات میں کوئی ہستی نہ مجھے نفع پہنچا سکتی ہے نہ نقصان۔

پس جب دل میں یہ یقین راسخ ہو جاتا ہے تو مسلمان اللہ تعالیٰ کا مطیع

اور فرمانبردار بن جاتا ہے اور جب وہ اللہ کے قانون کی اطاعت کرنے لگتا ہے تو کوئی کام اس سے ایسا سرزد نہیں ہو سکتا جو دوسروں کے حق میں مضرت رساں ہو۔ بالفاظِ دگر اس کا وجود، اہلِ علم کے حق میں سراپا خیر ہو جاتا ہے۔ یہ مطلب ہے اس مصرع کا

ع اہلِ عالم را سراپا خیر شو!

اگر مثال درکار ہو تو فاروقِ اعظمؓ کی زندگی کا مطالعہ کافی ہو گا۔

کہتے ہیں کہ اے مسلمان! حضرت علیؓ کی زندگی کو اپنے لئے نمونہ بنا کہ اگرچہ وہ جو کی روٹی کھاتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی روٹی سے اُن کے جسم میں اس قدر طاقت پیدا کر دی تھی کہ انہوں نے اپنی تلوار کی ایک ضرب سے مرحب جیسے دیو ہیکل انسان کو دو نیم کر دیا تھا۔

جہاں تک ہو سکے دُنیا میں کسی کا احسان مت اٹھاؤ۔ اقبالؔ نے لا اور نعم دونوں کو نشتر سے تشبیہ دی ہے کیونکہ اگر کوئی شخص، سائل کے سوال کو رَد کر دے یعنی جواب میں "نہیں" کہہ دے یا "ہاں" کہہ دے، دونوں صورتوں میں سائل اس کے سامنے ذلیل ہو جائے گا۔ لفظ نہیں سُن کر ایسی تکلیف ہو گی جیسے جسم میں نشتر چبھ جائے اور اگر ہاں کہہ دیا تو احسان مندی بھی نشتر سے کم تکلیف دہ نہیں ہے۔

اے مسلمان! دُنیا کے ذلیل اور کمینہ خصلت انسانوں کے سامنے دستِ سوال دراز مت کر، رزق حاصل کرنے کے لئے اِن کے دروازوں پر مت جا۔ تو "یوسف" ہے۔ اللہ نے تجھے بہت معزز پیدا کیا ہے۔ تو اپنے آپ کو

ارزاں قیمت پر فروخت مت کر، یوسف کنایہ ہے مقامِ عزت سے۔

یاد رکھ! وہی مسافر آرام سے رہتا ہے جو سفر میں بہت کم سامان اپنے ساتھ رکھے۔ اس لئے تو علائقِ دنیاوی سے حتی المقدور کنارہ کش رہ تاکہ تیری حریتِ نفس برقرار رہ سکے۔ اس مصرع میں لفظ "آزاد" سے وہ شخص مراد ہے جس کی ضروریات کم ہوں۔ کیونکہ تصوّف کی تعلیم یہ ہے کہ انسان جس قدر اپنی ضروریاتِ زندگی میں اضافہ کرتا جائے گا۔ اسی قدر دُنیا اور دنیا والوں (اربابِ حکومت) کا غلام بنتا چلا جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؓ اربابِ تصوّف کے پیشوا ہیں۔ کیونکہ جب نکاح کے وقت سرکارِ ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم نے آں جنابؓ سے دریافت فرمایا کہ تمہارے پاس کیا ہے؟ تو اقلیم فقر کے اس بادشاہ نے جواب دیا کہ ایک تلوار اور ایک زرہ۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تلوار تو مومن کی زندگی کا جزو لاینفک ہے ہاں زرہ بیکار ہے، اسے فروخت کر دو۔ تم تو ابوتراب ہو۔ تمہیں زرہ کی کیا ضرورت؟

کہتے ہیں کہ فاروقِ اعظمؓ کے اس قول کو ہر گھڑی پیشِ نظر رکھو۔

"تَقَلَّلْ مِنَ الدُّنْیَا تَعِشْ حُرًّا"

یعنی تو دنیاوی ضروریات کو جس قدر کم کر دے گا اسی قدر تجھے آزادی کی نعمت نصیب ہوگی۔

اگر ہو سکے تو دوسروں پر احسان کر، منعم بن، خود کسی کا احسان مت اُٹھا۔ اس موقع پر میں تجھ کو حضرت بوعلی شاہ قلندر پانی پتیؒ کا ایک شعر سُناتا ہوں۔

پشتِ پا زن تختِ کیکاؤس را

سر بدہ، از کف مدہ ناموس را

یعنی اے مسلمان! دنیاوی بادشاہت کو مقصودِ حیات مت بنا۔ یہ تو مومن کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے۔ لیکن مومن اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ اے مسلمان! اصلی چیز عزتِ نفس ہے۔ پس تو کسی صورت میں بھی اپنی ذلت گوارا مت کر، خواہ تیری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ لیکن ذلت کی زندگی ہرگز مت اختیار کر یعنی ذلت کی زندگی سے عزت کی حالت میں موت آجائے تو یہ بدرجہا بہتر ہے۔ چنانچہ سلطان ٹیپو شہیدؒ نے حضرت قلندرؒ کے ارشاد پر عمل کر کے دنیا کو دکھا دیا کہ مومن کسی حالت میں بھی غلامی قبول نہیں کر سکتا۔ اسی لیے اقبالؒ نے کہا ہے:۔

رفت سلطاں زیں سرائے ہفت روز

نوبتِ او در دکن باقی ہنوز!

بلاشبہ سلطان شہید آج بجسدِ عنصری زندہ نہیں ہے لیکن اس کا نام قیامت تک زندہ رہے گا۔

حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ کا اسم گرامی شیخ شرف الدین تھا۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی اولاد میں سے تھے۔ جملہ علوم وفنون ظاہری میں کمال حاصل کرنے کے بعد، دہلی مرحوم کی مشہور مسجد قوۃ الاسلام میں (جسے اب قطب صاحب کی لاٹ کہتے ہیں) ۱۲ سال تک تفسیر اور حدیث کا درس دیا۔ ایک دن وعظ فرما رہے تھے کہ ایک درویش کا ادھر سے گذر ہوا، اس نے ایک نگاہ غلط انداز سے دیکھا

اور کہا، اے شرف الدین کب تک مقصودِ حیات سے غافل رہے گا؟

صد کتاب و صد ورق در نار کن
سینہ را از عشق او گلزار کن

یہ سن کر وعظ بند کر کے گھر آئے، کتابیں دریا میں ڈال دیں اور خلوت اختیار کر لی مدتوں صحرا میں ریاضت کی انجام کار فائز المرام ہوئے اور پانی پت کو اپنا مرکز بنایا۔ یہ سچ ہے کہ اکثر اوقات حالتِ جذب طاری رہتی تھی لیکن جب ہوش میں آتے تھے تو تبلیغ و اشاعت و اسلام کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے چنانچہ پانی پت، کرنال، حصار اور انبالہ کے اضلاع میں بہت سے راجپوت خاندان حضرت ہی کی تبلیغی مساعی کی بدولت دائرہٴ اسلام میں داخل ہوئے۔

شانِ بے نیازی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ جب امیر خسروؒ جن کو بادشاہِ دہلی نے کسی کام سے حضرت کی خدمت میں بھیجا تھا، واپس جانے لگے تو حضرت نے بادشاہ کو اس مضمون کا خط لکھا۔ "دہلی کے فوطہ دار کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ رعایا کے ساتھ انصاف کرے۔"

جب یہ خط دربار میں پڑھا گیا تو بعض خوشامدی مصاحبوں نے کہا کہ بادشاہِ ہندوستان کو "فوطہ دار" لکھنا تو اس کی بڑی توہین ہے یہ سن کر بادشاہ نے کہا، غنیمت ہے اس دفعہ میرا مرتبہ بڑھا دیا پہلے خط میں تو محض "شحنہٴ دہلی" ہی لکھا تھا۔ یعنی کوتوال شہر دہلی۔

اس بند کا آخری شعر اقبالؔ نے اس رنگ میں لکھا ہے کہ وہ اس زمانہ کے لوگوں کی سمجھ میں بڑی مشکل سے آئے گا۔ کہتے ہیں کہ

جو مے نوش اپنے اندر شانِ بے نیازی پیدا کر لیتے ہیں، اُن کے لئے میخانہ کا دروازہ خود بخود کھل جاتا ہے۔ اقبالؔ نے یہ نہیں بتایا کہ خود بخود کیسے کھل جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس شعر کو پڑھتے وقت، اس شعر کو مدِ نظر رکھے تو اس سوال کا جواب مل سکتا ہے۔

بندۂ حق بندۂ اسباب نیست
زندگانی گردشِ دولاب نیست

یعنی جو لوگ اللہ کے ہو جاتے ہیں، اللہ بھی ان کا ہو جاتا ہے، اس لئے درِ میخانہ خود بخود کھل جاتا ہے۔ ۱۲

دوسرا بند:- اس بند میں اقبالؔ نے ہارونؔ الرشید فرمانروائے دولتِ عباسیہ کی زندگی کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۷۲ھ میں ہارونؔ جب حج کو گیا تو امین اور مامون دونوں بیٹوں کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد اس نے امام مالکؒ کو اپنی قیام گاہ پر بلایا اور کہا کہ مجھے مؤطا سنائیے۔ بالفاظِ دگر، حدیث کا درس دیجئے۔

ع از تو خواہم درسِ اسرارِ حدیث

یہ سُن کر امام صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ علم تیرے ہی خاندان سے نکلا ہے۔ اب تجھے اختیار ہے خواہ اسے ذلیل کر خواہ عزت دے۔" یہ سُن کر ہارونؔ نے معذرت کی اور کہا کہ میں خود آپ کے درس میں آکر شریک ہوں گا۔

دوسرے دن جب مدرسہ میں پہنچا تو عاشقانِ حدیث کے ہجوم کو دیکھ کر گھبرا گیا۔

ع جب ہجومِ عاشقاں دیکھا تو گھبرا سا گیا

اور امام صاحبؒ سے کہا کہ ان لوگوں کو یہاں سے نکلوا دیجیے تاکہ میں اطمینان سے آپ کی تقریر سُن سکوں۔ امام صاحبؒ نے فرمایا کہ جب الطافِ ایزدی سب کے لئے یکساں ہیں۔

ع عام ہیں اُس کے تو الطافِ شہیدی سب پہ

تو میں الطافِ رسالتؐ سے لوگوں کو کیسے محروم کر سکتا ہوں؟

یہ جواب سُن کر ہارونؔ خاموش ہو گیا اور ہجوم میں سے بمشکل تمام گذر کر مسندِ درس پر جا کر بیٹھ گیا (تاکہ کچھ تو امتیازی شان پیدا ہو جائے) لیکن اس معاملہ میں بھی مُنہ کی کھائی۔ امام صاحبؒ نے فرمایا ہارونؔ! یہ تختِ شاہی نہیں ہے، مسندِ درس ہے۔ اس پر بیٹھنا تجھے زیبا نہیں ہے۔ ہارونؔ خاموشی کے ساتھ نیچے اتر گیا اور دُنیا نے اپنی آنکھوں سے فقر و شاہی میں فرق دیکھ لیا۔

مقامِ فقر ہے کتنا بلند شاہی سے
روش کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہیئے

جب ہارونؔ بغداد واپس جانے لگا تو امام صاحبؒ سے درخواست کی کہ اے مولائے قوم! تیرے دروازہ کی خاک سے قوم کی پیشانی منور ہو سکتی ہے۔ لعل قیمت کو پہنچاتا ہے بدخشاں چھوڑ کر۔ اس لئے آپ یہاں سے بغداد تشریف لے چلیں تاکہ میں ہر روز آپ سے استفادہ کر سکوں۔

یہ سُن کر امام صاحبؒ نے فرمایا کہ میں تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام (چاکر) ہوں۔ دوسرے کی غلامی کیسے کر سکتا ہوں؟ کیا تو نے حضرت

عیسیٰؑ کا یہ قول نہیں سُنا کہ ایک غلام دو آقاؤں کو خوش نہیں رکھ سکتا؟ اگر میں تجھے راضی کرنے کی کوشش کرونگا تو ممکن ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اس طرزِ عمل سے ناراض کر لوں۔ لیکن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں دیوانہ ہوں۔

ع نیست جُز سودائے او اندر سرم

میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شکار بند (فتراک) سے بندھا ہوا ہوں اس لیے۔

ع بر نخیزم از حریم پاکِ اوؐ

میں یثرب کی مٹی کو بوسہ دیتا رہتا ہوں کیونکہ میری زندگی اسی تقبیل پر موقوف ہے۔ پس میں دیارِ حبیبؐ کو چھوڑ کر عراق کیسے جا سکتا ہوں؟

عشقِ رسولؐ کا فرمان یہ ہے کہ بادشاہوں کو اپنی غلامی میں بھی قبول نہ کیا جائے (مبادا ان کی قربت سے عاشق کی شخصیت آلودۂ معصیت ہو جائے) چہ جائیکہ خود ان کی غلامی اختیار کی جائے!

ع ایں خیال است و محال است و جنوں

اندریں حالات یہ کیسے ممکن ہے کہ میں تجھے تعلیم دینے کے لئے تیرے گھر آؤں؟ قوم کا خادم، تیرا خادم کیسے ہو سکتا ہے؟

اگر تو علمِ دین حاصل کرنا چاہتا ہے تو میرے حلقۂ درس میں آکر شریک ہو۔

اقبالؒ نے یہ واقعہ بیان کر کے ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ جب کوئی شخص شانِ بے نیازی پیدا کر لیتا ہے تو قدرتی طور پر اس میں نازکا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور اس ناز کے اظہار کی مختلف (متعدد) صورتیں ہیں۔

واضح ہو کہ یہاں "ناز" سے وہی نازِ معشوقانہ مراد ہے جس کی تہہ میں برتری یا تفوق کا شدید احساس کارفرما ہوتا ہے۔ جب انسان دُنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے تو اپنے آپ کو ساری کائنات سے برتر سمجھنے لگتا ہے اسی لئے وہ بادشاہوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔

یہی وجہ ہے کہ جب سلطان علاؤالدین خلجی نے حضرت امیر خسروؒ سے یہ پوچھا کہ آپ نے میرے فیصلہ سے اپنے مرشد کو کیوں مطلع کر دیا تو انہوں نے جواب دیا کہ "ایک طرف جان جانے کا خوف تھا دوسری طرف ایمان جانے کا خوف تھا، میں نے ادنیٰ کو اعلیٰ پر قربان کر دیا" خسروؒ یہ جواب محض اس لئے دے سکے کہ "اَللّٰہُ الصَّمَدُ" سے دل لگا چکے تھے اس لئے ان میں بے نیازی کی شان پیدا ہو گئی تھی۔

نوٹ:۔ امام مالکؒ اور ہارونؒ کے مختصر سوانح حیات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

(۱) مالکؒ ابن انس ابنِ مالک الحمیری نام۔ ابو عبد اللہ کنیت۔ امام دار الہجرۃ لقب تھا۔ ان کے والد جلیل القدر تابعی تھے۔ امام صاحب کی ولادت ۹۲ھ میں بمقام مدینہ منورہ ہوئی۔ ساری عمر حدیث کی خدمت اور اشاعت میں بسر کر دی۔ ان کے ساتھ اساتذہ حدیث کی تعداد نو سو سے بھی زائد ہے۔ اکثر اربابِ فن کی رائے میں ان کی کتاب موطا اصح الکتب ہے۔ سلطان منصور عباسی کا قول ہے کہ دُنیا میں صرف دو آدمی لائق احترام ہیں۔ امام مالکؒ اور امام سفیان ثوریؒ۔

جب امام ابو حنیفہؒ ان سے ملنے کے لئے آئے تو از راہِ احترام واعزاز اپنی چادر ان کے لئے بچھا دی اور طلبہ سے مخاطب ہو کر کہا "یہ ابو حنیفہ ہیں۔ اِن کی فہم وفراست اور ذہانت وفطانت کا یہ عالم ہے کہ اگر چاہیں تو اس مسجد کے سنگین ستونوں کو سونے یا چاندی کا ثابت کر دیں"

واضح ہو کہ اس ناپاک اور ذلیل دنیا میں حق گوئی ایسا شدید جرم ہے کہ دنیا کے غلام اسے کسی حال میں معاف نہیں کر سکتے۔ چونکہ امام مالکؒ نے یہ سچی بات برملا کہہ دی کہ نہ جبری طلاق کا کوئی اعتبار ہے نہ جبری بیعت کا، اس لئے بادشاہِ بغداد کے گورنر نے حکم دیا کہ امام صاحبؒ کو نیم برہنہ کر کے کوڑوں سے پیٹا جائے اور اس "خلافِ اسلام"[1] تعلیم سے توبہ کرائی جائے۔ امام صاحبؒ پٹتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ "لوگو! میں مالک ابنِ انس ہوں اور بآوازِ بلند کہتا ہوں کہ اسلام میں نہ جبری طلاق کا اعتبار ہے نہ جبری بیعت کا۔ اگرچہ اس برگزیدہ ہستی نے ۱۷۹ھ میں وفات پائی۔ لیکن جب تک اسلام دنیا میں باقی ہے، مؤطا بھی باقی رہے گی۔

(۲) ہارون الرشید نے اپنے بھائی ہادی کی وفات کے بعد ۱۷۰ھ میں تختنشین ہوا۔ شان وشوکت، فتوحات، علم ودولت اور شہرت کے اعتبار سے

---

[1] سلاطین بنو امیہ اور بنو عباس نے جو اسلام ایجاد کیا تھا اس کی رُو سے امام مالکؒ کا فتویٰ چونکہ بالکل غلط تھا، اس لئے میں نے اِن کے زاویۂ نگاہ سے لفظ "خلافِ اسلام" لکھ دیا ہے۔

اپنے تمام ہمعصروں پر فائق تھا۔

؎ آں کہ نقفورِ آب تیغ او چشید

میں حضرت اقبالؔ نے حسبِ ذیل واقع کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

جب ملکہ آیرینؔ کا ظلم و ستم حد سے متجاوز ہو گیا تو رعایا نے اس کو معزول کر کے وزیرِ خزانہ نقفورؔ (NICEPHORUS) کو اپنا قیصر تسلیم کر لیا۔ اس احمق نے ہارونؔ کو اس مضمون کا خط لکھا کہ " وہ مرغی جو سونے کا انڈا دیتی تھی مر گئی۔ لہٰذا جس قدر خراج تم وصول کر چکے ہو، واپس کر دو، ورنہ تلوار اس کا فیصلہ کر دے گی۔

جب یہ خط ہارونؔ نے پڑھا تو غصہ کے مارے چہرہ سرخ ہو گیا! اسی حالتِ غیض و غضب میں اس خط کی پشت پر یہ جواب لکھا:۔

" امیر المومنین ہارونؔ کی طرف سے رومی کتے (کلب الروم) کے نام اما بعد میں نے تیرا خط پڑھا اس کا جواب تو عنقریب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیگا۔

اسی دن ہارون میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہو گیا اور نقفورؔ کو شکستِ فاش دے کر ہمیشہ کے لئے اس کا دماغ درست کر دیا۔ ۱۹۳ھ میں وفات پائی۔

تکبیر اینـد:۔ کہتے ہیں کہ بے نیازی کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان غیر اللہ کا خیال اپنے دل سے بالکل نکال دے اور خدا کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگین کر لے۔ لیکن افسوس کہ تو اپنی زندگی اس نہج پر بسر کر رہا ہے، کہ مدت العمر تیرے اندر " رنگِ حق " پیدا نہیں ہو سکتا۔ اب اقبالؔ اس غیر اسلامی طرز کی وضاحت کرتے ہیں:۔

(۲) اے مسلمان! تو اپنے اسلامی علوم کے بجائے غیروں (کافروں) کے علوم پڑھ رہا ہے۔

(ب) تو کافروں کا شعارِ زندگی اختیار کر رہا ہے۔ وہی لباس، وہی وضع قطع، وہی تمدن وہی تہذیب، وہی رسوم، وہی آداب واطوار۔

(ج) تو اپنے دین اور عقاید اور قومی روایات سے اس قدر بیگانہ ہو چکا ہے کہ جب میں تجھے دیکھتا ہوں تو مجھے یہ یقین ہی نہیں آتا۔ تو مسلمان ہے یا مسلمان زادہ ہے یا ملتِ اسلامیہ کا ایک فرد ہے۔

(د) اے مسلمان! تو اپنی کھیتی اپنے ہاتھوں برباد مت کر۔ کافروں کے علوم اور ان کی تہذیب تیرے حق میں سم قاتل ہیں۔

(ہ) تیری عقل وخرد، اغیار (کفار فرنگ) کی عقل وخرد کی غلام ہے۔ تو وہی سوچتا ہے جو وہ چاہتے ہیں کہ تو سوچے اور یہ ذہنی غلامی، دنیا میں غلامی کی بدترین شکل ہوتی ہے۔

(و) حد یہ ہے کہ تو اپنی مادری زبان کے بجائے کافروں کی (اغیار) زبان میں گفتگو کرتا ہے اور اس پر فخر بھی کرتا ہے کہ میں نے کئی سال انگلستان میں رہ کر انگریزوں کے لب ولہجہ کی پوری پوری نقل اتار لی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ یورپ کی ڈگریوں کی بدولت تجھے اس کافرانہ نظامِ تعلیم میں معقول مشاہرہ مل جاتا ہے لیکن روح کو فنا کر کے جسم کو باقی رکھنا عین ضلالت وسفاہت ہے۔ ۱۲

(ز) تو اپنے پیالہ میں غیروں کی عطا کردہ شراب پی رہا ہے یعنی تیری زندگی بالکل

غیر اسلامی ہے۔ پس اے مسلمان! تو اس بات پر غور کر کہ اگر کل کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں رونق افروز ہو جائیں اور تیری غیر اسلامی زندگی کو اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرمائیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً یہی ارشاد فرمائیں گے کہ تو ہرگز مجھ سے نہیں ہے۔ اے مسلمان! کیا یہ فیصلہ سن لینے کے بعد، جینے میں کوئی لطف باقی رہے گا؟

نوٹ:۔ "مَا زَاغَ الْبَصَرُ" یہ سورۂ نجم کی مشہور آیت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں کسی قسم کی کجی پیدا نہیں ہوئی۔

چوتھا بند:۔ اس بند میں اقبالؔ مسلمان کے پردہ میں قوم سے خطاب کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اے مسلمان! تو کب تک ستاروں کی طرح غیر مستقل زندگی بسر کریگا۔ ستاروں میں جو چمک ہوتی ہے وہ ذاتی نہیں ہے بلکہ مستعار ہے اس لئے جب آفتاب طلوع ہوتا ہے تو وہ غائب ہو جاتے ہیں۔ یہی حال اس قوم کا ہے جو دوسروں کے سہارے زندگی بسر کرتی ہے اگر وہ سہارا ٹوٹ جائے تو وہ قوم بھی فنا ہو جاتی ہے۔

اے مسلمان! تو اپنی حقیقت سے غافل ہو گیا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ تُو تو خود آفتاب ہے۔ کیا تجھے شرم نہیں آتی کہ تو دوسروں سے روشنی (زندگی) حاصل کر رہا ہے؟ اے نادان! طوافِ شمع سے آزاد ہو جا! اور اپنی حقیقت سے آگاہی حاصل کر۔

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ!
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

تو نے اپنے دل پر غیر اللہ کو مسلط کر کے اپنی ہستی فنا کر لی۔ تو کیمیا تھا لیکن غلامی کی بدولت مٹی ہو گیا! تو اس لئے پیدا ہوا تھا کہ ساری دنیا کو اپنے نور سے منور کر دے لیکن تیری حالت یہ ہے کہ تو اپنی تابندگی غیروں سے حاصل کر رہا ہے!

تو کب تک اغیار کے چراغ کا طواف کرتا رہے گا؟ کب تک غلامی کی زندگی بسر کرتا رہے گا؟ اپنی نگاہ سے سبق لے کہ وہ اپنے مقام (پردہ) میں رہتی ہے۔ اور وہیں سے ساری دنیا کو دیکھتی ہے اس کی پرواز دور دور تک ہے لیکن اپنے مرکز سے جدا نہیں ہوتی۔ اسی طرح تو ساری دنیا کی سیر کر لیکن اپنے مرکز (اسلام) سے قطع تعلق مت کر۔

فرد کی ہستی (انفرادیت) اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اپنی معرفت حاصل کر لے (اپنی خودی کو مستحکم کر لے) اور قوم کی ہستی اس بات پر موقوف ہے کہ وہ اپنی بقا کے لئے دوسروں کی دستِ نگر نہ ہو۔ یعنی اس میں خود زندہ رہنے کی صلاحیت ہو۔

پس میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ اسلام کی تعلیمات پر عمل کر اور اسلامی تعلیمات کی روح یہ ہے کہ غیر اللہ سے قطع تعلق کر لے۔ اور صرف اللہ تعالیٰ کو اپنی زندگی کا مقصود بنا لے۔

لَم یَلِدْ وَلَم یُولَدْ

قومِ تو از رنگ و خوں بالاتر است
قیمتِ یک اسودش صد احمر است

قطرۂ آبِ وضوئے قنبرے
در بہا برتر ز خونِ قیصرے

فارغ از باب و ام و اعمام باش (۱)
ہمچو سلماں زادۂ اسلام باش

نکتۂ اے ہمدمِ فرزانہ بیں (۲)
شہد را در خانہ ہائے لانہ بیں

قطرۂ از لالۂ حمراستے
قطرۂ از نرگسِ شہلاستے

ایں نمی گوید کہ من از عبہرم (۳)
آں نمی گوید من از نیلوفرم

ملّتِ ما شانِ ابراہیمیؑ است (۴)
شہدِ ما ایمانِ ابراہیمیؑ است

گر نسب را جزوِ ملّت کردۂ
رخنہ در کارِ اخوّت کردۂ

در زمینِ ما نگیرد ریشہ ات
ہست نا مسلم ہنوز اندیشہ ات

ابنِ مسعودؓ آں چراغ افروزِ عشق
جسم و جانِ او سراپا سوزِ عشق

سوخت از مرگِ برادر سینہ اش
آب گردید از گداز آئینہ اش

---

(۱) سلمان فارسیؓ سے لوگوں نے ان کا شجرۂ نسب دریافت کیا۔ انہوں نے جواب دیا۔ "سلمان ابنِ اسلام"

(۲) لانہ: شہد کا چھتہ ۱۲۔

(۳) عبہر: نرگس ۱۲۔

(۴) شان: شہد کا چھتہ ۱۲۔

گریہ‌ہائے خویش را پایاں ندید　　در غمش چوں مادراں شیون کشید

«وائے دریغا آں سبق‌خوانِ نیاز　　یارِ من اندر دبستانِ نیاز»

«آہ آں سروِ سہی بالائے من　　در رہِ عشقِ نبیؐ ہمپائے من»

«حیف او محرومِ دربارِ نبیؐ
چشمِ من روشن ز دیدارِ نبیؐ»

نیست از روم و عرب پیوندِ ما　　نیست پابندِ نسب پیوندِ ما

دل بہ محبوبِ حجازی بستہ‌ایم　　زیں جہت با یک‌دگر پیوستہ‌ایم

رشتۂ ما یک تولایش بس است　　چشمِ ما را کیفِ صہبایش بس است

مستئ او تا بخونِ ما دوید　　کہنہ را آتش زد و نو آفرید

عشقِ او سرمایۂ جمعیت است　　ہمچو خوں اندر عروقِ ملت است

عشق در جان و نسب در پیکر است　　رشتۂ عشق از نسب محکم‌تر است

عشق ورزی از نسب باید گذشت　　ہم ز ایران و عرب باید گذشت

اُمتِ او مثلِ او نورِ حق است　　ہستئ ما از وجودش مشتق است

«نورِ حق را کس نجوید زاد و بود　　خلعتِ حق را چہ حاجت تار و پود»

ہر کہ پا در بندِ اقلیم و جد است
بے خبر از لَمْ یَلِدْ لَمْ یُولَدْ است

(صفتِ ثالث)

اِس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ نہ تو اللہ تعالیٰ نے کسی کو جنا اور نہ وہ کسی سے جنا گیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ سلسلہ توالد وتناسل سے پاک ہے۔ نہ وہ والد ہے نہ مولود ہے۔ واضح ہو کہ تولید کے لئے جسم ہونا شرط ہے اور اللہ تعالیٰ جسم سے بالکل منزہ ہے، پس اس کی جانب تولید کی نسبت محال عقلی ہے۔

اگر اسے والد تسلیم کیا جائے تو وہ بقول قرآن ایک "صاحبہ" کا محتاج ہوگا؛ اور اگر اسے مولود قرار دیا جائے تو وہ کسی والد یا والدہ دونوں کا محتاج ہوگا اور ان دونوں صورتوں میں اس کی الوہیت باطل ہو گی۔ کیونکہ احتیاج منافی الوہیت ہے۔

قرآن حکیم نے والدیت اور مولودیت کی تردید اس لئے کی کہ نزولِ قرآن سے پہلے جس طرح اور بہت سے غلط اور گمراہ کن عقائد دُنیا کی قوموں میں مقبول اور مروج تھے، اسی طرح یہ مہمل اور لغو عقیدہ بھی مختلف اقوام میں موجود تھا۔ مثلاً یونان میں اپالو، شام میں بیکس (Bacchus) مصر میں آہورس اور عراق میں متھرا کو خدا کا اکلوتا بیٹا، تسلیم کیا جاتا تھا۔ انہی اقوام کی تقلید میں یہود نے عزیز کو اور نصاریٰ نے عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا قرار دیدیا تھا۔ ہندو قوم نے رام اور کرشن کو خدا کا اوتار سمجھ رکھا تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی جین دھرم کے پیروؤں نے مہابیر کو اور بودھ دھرم کے متبعین نے گوتم بدھ کو خدا کا مرتبہ عطا کر دیا تھا۔ (حالانکہ مہابیر اور گوتم دونوں نے خدا کا کوئی تذکرہ اپنی تعلیمات میں نہیں کیا ہے) خلاصہ کلام

اینکہ نزولِ قرآن سے پہلے ساری مہذب دنیا میں، یا تو خدا کے بیٹوں کی حکومت تھی یا خدا خود بشکل انسان جلوہ گر تھا۔ اس لئے قرآنِ حکیم نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اللہ تعالیٰ توالد و تناسل کے سلسلہ سے بالکل پاک ہے۔

اگر خدا کا کوئی بیٹا ہو تو سوال یہ ہے کہ اس کی حیثیت کیا ہے؟

اگر وہ بھی خدا ہے تو دو خدا ہو گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ دونوں مل کر کائنات کا انتظام کرتے ہیں یا ان میں سے ایک معطل ہے یا خدائی ان میں منقسم ہے؟ اگر پہلی صورت تسلیم کی جائے تو سوال یہ ہے کہ بیٹے کی ولادت سے پہلے اکیلا خدا، اس کائنات کا انتظام کیسے کرتا تھا؟ اگر کر سکتا تھا تو پھر بیٹے کا وجود بیکار ہوا۔ اگر دوسری صورت صحیح ہے تو سوال یہ ہے کہ خدائے معطل کو خدا تسلیم کرنے سے ہمیں کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟

اگر تیسری صورت تسلیم کی جائے تو سوال یہ ہے کہ اس کائنات کا کونسا حصہ باپ کے زیرِ اقتدار ہے اور کونسا بیٹے کی؟

میں نے اس عقیدہ کی لغویت واضح کرنے کے لئے مثالاً چند اعتراضات وارد کئے ہیں۔ اگر اس بحث کو مستقل طور سے لکھا جائے تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔

اقبالؔ نے اس عقیدہ سے یہ نکتہ مستنبط کیا ہے کہ اے مسلمان! جس طرح اللہ نسل اور نسب سے پاک ہے اسی طرح تیری قومیت کی بنیاد بھی نسب یا رنگ یا خون پر نہیں ہے بلکہ توحید پر ہے۔

اسلام میں اسود اور احمر (کالا اور سرخ) دونوں یکساں ہیں بلکہ ایک کالا

آدمی اگر مسلمان ہو جائے تو اس پر "صد احمر" نثار کئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ قنبر اگرچہ حضرت علیؓ کے غلام تھے لیکن ان کے وضو کا پانی، قیصرِ روم کے خون سے بھی زیادہ قیمتی تھا۔

پس اے مسلمان! تو باپ، ماں، یا چچا پر فخر مت کر بلکہ حضرت سلمان فارسیؓ کی طرح اسلام کو اپنا نسب قرار دے۔ چنانچہ لوگوں نے ان سے شجرۂ نسب جب دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا "سلمان ابنِ اسلام" یعنی میں مسلمان ہوں لہٰذا میرے لئے ایرانی ہونا باعثِ فخر نہیں ہے بلکہ مسلمان ہونا موجبِ عزت ہے۔ اسلام نے نسل اور وطن اور نسب اور خون کے سارے رشتے منقطع کر دیئے۔ سب مسلمانوں کو سلکِ توحید میں منسلک کر کے بھائی بھائی بنا دیا۔ اب اسلام ہی میرا نسب ہے اور اسلام ہی میرا وطن ہے۔

اسی نکتہ کو شہد کی مثال سے سمجھاتے ہیں کہ مکھیاں اگرچہ مختلف قسم کے پھولوں سے رس حاصل کر کے شہد بناتی ہیں۔ لیکن اس کا ایک قطرہ، دوسرے قطرے سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تو گلِ لالہ کا رس ہے اور میں نرگسِ شہلا کا رس ہوں۔ بلکہ سب مل کر ایک نئی صورت حاصل کر لیتے ہیں اور سب کا ایک ہی نام ہو جاتا ہے۔ اسی طرح چینی، ہندی، افغانی، عراقی، مصری اور ترکی مسلمانوں کو ایک قوم بن جانا چاہیے کیونکہ حضرت ابراہیمؑ سے ہماری ملت کی بنیاد، رنگ و نسل و وطن کے بجائے عقیدۂ توحید پر رکھی ہے۔ انہوں نے تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک قوم بنا دیا اور نسب کے امتیاز کو بکلی فنا کر دیا۔ اے مسلمان! جس طرح اللہ تعالیٰ نسب اور خون کے رشتوں سے پاک ہے، "لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ" ہے اسی

طرح تو بھی نسب اور خون کے رشتوں سے پاک ہو جا، بالاتر ہو جا، اگر تو نسب کو اپنی ملت (قوم یا قومیت) کا جز قرار دے گا تو اسلام کے اصول اخوت کی نفی ہو جائے گی۔

اقبال کہتے ہیں کہ ایک مسلمان کے ذہن سے نسب، نسل، خون، رنگ، ذات پات، قبیلہ، زبان اور وطن کے امتیازات اسی وقت مٹ سکتے ہیں جب وہ ان تمام رشتوں سے قطع تعلق کر کے صرف اسلام کا رشتہ مدنظر رکھے۔ مثلاً ہر مسلمان، جب اس سے دریافت کیا جائے، کہ تمہارا نسب کیا ہے تو وہ اس کے جواب میں یہ کہے کہ مسلمان ہوں۔ یعنی اپنے آپ کو اجداد سے منسوب کرنے کے بجائے اسلام سے منسوب کرے۔ تب اس کے اندر "لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ" کا رنگ پیدا ہوگا اگر یہ ذہنیت پیدا نہ ہو سکے تو اقبال کی رائے میں مسلمان ابھی مسلمان نہیں ہوا، اس نے نام تو مسلمانوں کا سا رکھ لیا ہے لیکن اس کی فکر (ذہنیت) ہنوز غیر مسلم ہے، اور اس کی ہستی کی جڑیں، سرزمین اسلام سے وابستہ نہیں ہوئی ہیں۔

دوسرا بند:۔ اس بند میں اقبال نے ہم کو اخوت کے ثمرہ سے آگاہ کیا ہے یعنی اگر مسلمان کے اندر حقیقی معنی میں اسلامی اخوت کا رنگ پیدا ہو جائے تو ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا ہمدرد اور بہی خواہ بن جائے گا۔ اور اگر کوئی مسلمان کسی نعمت سے محروم رہے گا تو اسے اتنا ہی رنج ہو گا جتنا خود اپنے آپ سے محروم رہنے سے ہوتا ہے۔

(۲) قومیت کی بنیاد، کلمہ توحید ہے۔

(ب) اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نسب کا امتیاز مٹ گیا۔

ع ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

(ج) حسب و نسب کے امتیازات کے فنا ہو جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اخوت کا اصول مستحکم ہو گیا۔

(د) اخوت کا نتیجہ (ثمرہ) یہ ہے کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان سے محبت کریگا۔ اور ہر وقت دوسروں کی خیر خواہی میں مشغول رہے گا۔

چنانچہ اس بات کو اللہ تعالیٰ نے نعمت (فضل) سے تعبیر فرمایا ہے۔

کما قال فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا۔

یعنی اے مسلمانوں! اسلام لانے سے پہلے کی زندگی پر غور کرو! تمہاری زبان ایک تھی، تہذیب ایک تھی، نسب ایک تھا، وطن ایک تھا، اس کے باوجود تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہارے قلوب میں الفت کا بیج بو دیا (اسلام نے انقلابِ عظیم پیدا کر دیا) اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تم اس کے فضل و کرم سے بھائی بھائی ہو گئے۔ یعنی اخوت، شجرِ اسلام کا ثمر نورس ہے۔

کہتے ہیں کہ میں تمہیں حضرت عبداللہ ابنِ مسعودؓ کی زندگی کے ایک واقعہ سے آگاہ کرتا ہوں۔ کون عبداللہ؟ وہی جو سراپا عشق ہو گئے تھے، شمعِ رسالتؐ کے پروانے، اسلام کے عاشق، قرآن کے حافظ، حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام اس لئے ہمارے سردار۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

جب ان کے بھائی کا انتقال ہوا تو بہت روئے، اور یہ کلمات زبان پر لائے کہ وہ بھی میری طرح سرکارِ دو عالمؐ کے عاشقوں میں سے تھے۔ اب مجھے رنج اس بات کا ہے کہ میں تو حسبِ دستورِ سابق حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدارِ فرحت آثار سے اپنی آنکھوں کو روشن کر سکوں گا، لیکن وہ اس نعمت سے محروم

ہو گئے۔ مجھے اِن کے مرنے کا رنج نہیں ہے۔ رنج اس بات کا ہے کہ اب وہ دربارِ نبویؐ میں حاضر نہ ہو سکیں گے۔

نوٹ :۔ ذیل میں حضرت ابنِ مسعودؓ کے سوانح حیات درج کرتا ہوں :۔

عبداللہ نام، ابو عبدالرحمٰن کنیت، سابقون الاوّلون میں سے ہیں۔ ان کو یہ شرف حاصل ہے کہ قرآنِ مجید کی ستّر سورتوں کی تعلیم براہِ راست سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلّم سے حاصل کی۔ اِس فضیلت میں کوئی صحابی ان کا شریک نہیں ہے۔ تمام غزوات میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی ہمرکابی کی سعادت حاصل کی۔ سنہ ۱۵ھ جنگِ یرموک میں اپنی خداداد شجاعت کے جوہر دکھائے۔ سنہ ۲۰ھ میں اپنے علم و فضل کی بنا پر کوفہ کے قاضی مقرر ہوئے۔

چونکہ اقلیمِ زہد ورع کے بادشاہ تھے اس لئے فاروقِ اعظمؓ اِن کا بہت احترام فرماتے تھے۔

سنہ ۳۲ھ میں حضرت عثمانؓ نے ان کو معزول کر دیا۔ اس لئے کوفہ سے واپس آگئے۔ اور واپسی میں ان کو شیخ الاسلام حضرت ابو ذر غفاریؓ کی نمازِ جنازہ پڑھانے کی عزت حاصل ہوئی۔ سنہ ۳۳ھ میں وفات پائی۔ سن شریف ساٹھ سال سے متجاوز تھا۔

حضرت ابنِ مسعودؓ بلا شبہ ان صحابہ میں سے ہیں جو اپنے زہد ورع اور علم و فضل کے لحاظ سے دُنیائے اسلام کے امام تسلیم کئے گئے ہیں۔ وہ اپنے زمانہ میں قرآنِ حکیم کے سب سے بڑے عالم تھے۔ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ قرآن چار آدمیوں سے سیکھو۔ (۱) عبداللہ ابنِ مسعودؓ (۲) سالمؓ (۳) معاذؓ

(۴) ابی ابنِ کعبؓ۔ فقۂ حنفی کی بنیاد انہی کے فیصلوں پر رکھی گئی ہے ۱۲۔

تیسرا بند:- اب اس بند میں ساری بحث کا خلاصہ درج کرتے ہیں کہ ہماری پیوستگی کا باعث کوئی خارجی یا مادی تنیئے نہیں ہے، مثلاً ہم مسلمان نہ وطنی اشتراک کی بنار پر ایک قوم ہیں اور نہ نسبی اشتراک کی بنار پر۔ بلکہ ہماری قومیت کی بنیاد یہ ہے کہ ہم سب ایک ہی شمع کے پروانے اور ایک ہی محبوب کے دیوانے ہیں۔ بس حضورِ انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جو ہمیں محبت ہے، وہ محبت ہمیں ایک مسلک میں منسلک کر دیتی ہے اور ہمیں اختلافِ رنگ و وطن و نسل و نسب و زبان کے باوجود ایک قوم بنا دیتی ہے۔

رومی، شامی، مصری، ترکی، عراقی، ایرانی، افغانی، ہندی اور حبشی نے جب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا جام پیا تو اس شراب سے لامحالہ ہمارے اندر مستی پیدا ہوئی۔ اس مستی کا نتیجہ (اور نتیجہ عدیم النظیر ہے) یہ نکلا کہ تمام کہنہ تصورات (امتیازاتِ وطن و نسب و رنگ و نسل و خون وغیرہ) کا خاتمہ ہو گیا۔ اور ہمیں ایک نئی زندگی حاصل ہو گئی ـــ ایسی زندگی جسے سابقہ کافرانہ زندگی سے کوئی علاقہ یا رشتہ نہیں ہے ـــ اسلام نے انسانوں کی کایا ہی پلٹ دی۔ بالکل نیا نظامِ تصورات، نئی ہیئتِ اجتماعیہ، نیا معیارِ حق و باطل، نیا ضابطۂ اخلاق، نیا قانونِ حکومت ـــ بالفاظِ دگر اسلام نے نئی دنیا پیدا کر دی۔ جس میں نہ کوئی قیصر ہے نہ کسریٰ، نہ کوئی صاحبِ تاج و تخت ہے نہ والیٔ ملک، نہ کوئی جاگیردار ہے نہ نواب نہ سرمایہ دار ہے نہ زمیندار۔ کیونکہ زمین تو ساری اللہ کی ہے۔

اِس سے بڑھ کر ہوگا کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

نوٹ :۔ راقم الحروف کی رائے میں اسلام نے اتنا عظیم الشان انقلاب پیدا کیا کہ خود دنیائے اسلام ابھی تک اس کی عظمت کا اندازہ نہیں کر سکی ہے۔ تا بہ دیگراں چہ رسد؟ غیر مسلم تو کیا سمجھتے، خود مسلمان ہی اب تک اس حقیقت سے آگاہ نہ ہو سکے کہ جب روشنی، پانی اور ہوا کسی کی ملکیت نہیں ہیں تو زمین کسی کی ملک کیسے ہو سکتی ہے؟ اسی لئے اقبال نے زمیندار کو اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے :۔

دہ خدایا نکتۂ از من پذیر
رزق و گور از وے بگیر او را مگیر

کہتے ہیں کہ عشقِ رسولؐ ہماری جمعیت (قومیت) کا مبنیٰ اور منشار ہے ۔ ملت (قوم) کو اگر جسم قرار دیا جائے تو عشقِ رسولؐ بمنزلہ خون ہے جو اس کے جسم میں رواں اور دواں ہے۔ یعنی ملتِ اسلامیہ، عشقِ رسولؐ کی بدولت قائم ہے اسی کی بدولت زندہ ہے۔ ہماری قومیت کی بنیاد وطن نہیں ہے بلکہ عشقِ رسولؐ ہے۔

اے مسلمان! اگر تو عاشقِ رسولؐ بننا چاہتا ہے تو تجھے وطن، نسب اور حسب، رنگ، نسل اور زبان کے تمام امتیازات سے قطع تعلق کرنا پڑیگا۔

ع عشقِ ورزی از نسب باید گذشت

اسی طرح ایران، عراق، مصر اور حجاز سب سے اپنا رشتہ منقطع کرنا ہوگا۔

بات یہ ہے کہ جس طرح خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نورِ حق ہیں۔ اُسی طرح آپؐ کی اُمت بھی نورِ حق ہے۔ ہماری ہستی آپؐ ہی کی ہستی سے مشتق اور ماخوذ ہے۔ آپؐ نورِ حق ہیں، اس لیئے ہم بھی نورِ حق ہیں۔ اور چونکہ نورِ حق کسی وطن یا ملک یا نسل یا قوم یا قبیلہ یا زبان سے مختص نہیں ہوتا، کسی جہت میں کسی سمت میں محدود نہیں ہوتا۔ کسی خاص ملک سے وابستہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہم مسلمان بھی زمانی و مکانی و نسلی و لونی و لسانی قیود سے آزاد ہیں۔

مُرشدِ رُومیؒ نے کیا خوب فرمایا ہے:۔

نورِ حق را کس نہ جوید زاد و بود
خلعتِ حق را چہ حاجت تار و پود

یعنی دنیا میں کوئی شخص نور کی نسل یا اس کے نسب اور خاندان یا جائے ولادت کی تحقیق نہیں کیا کرتا۔ کیونکہ نورِ حق ان تمام اضافات اور تعلقات سے بالاتر ہے۔ دوسرے مصرع میں اس کی لِم بیان کرتے ہیں کہ نورِ حق مثلِ خلعت ہے اور خدا کی عطا کردہ خلعت تانے بانے (مادہ) کی محتاج نہیں ہوتی۔ اس لئے نورِ حق بھی کسی مادی شئے یا مادی علائق کا محتاج نہیں ہے۔

اس سے اقبالؔ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جس طرح نورِ حق، مادی نسبتوں سے بالاتر ہے، اسی طرح مسلمان بھی مادی نسبتوں (نسل، نسب، رنگ، وطن، زبان) اور دنیاوی امتیازات سے بالاتر ہے۔ نور ایک عالمگیر یا آفاقی حقیقت ہے۔ دُنیا میں کوئی شخص یہ دریافت نہیں کرتا کہ یہ نور چینی ہے یا ایرانی؟ بس اسی طرح مسلمان بھی نسبتِ مقامی سے بالاتر ہے۔ وہ بلحاظِ اصل

نہ ہندی ہے نہ عراقی بلکہ آفاقی ہے۔

آخر میں اقبال اس ساری بحث کا خلاصہ بیان کرتے ہیں کہ جو مسلمان اپنے آپ کو وطن (اقلیم) یا نسب (جدّ) سے وابستہ کرتا ہے، وہ بلاشبہ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ کے مفہوم سے ناآشنا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کسی نسل یا وطن سے تعلق نہیں رکھتا، اُسی اللہ کے پرستاروں (مسلمانوں) کو بھی نسلی اور وطنی اضافتوں سے بالاتر ہونا چاہیئے۔

وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ

مسلمِ چشم از جہاں بربستہ چیست؟
فطرتِ ایں دل بحق پیوستہ چیست؟

لالۂ کو بر سرِ کوہے دمید
گوشۂ دامانِ گلچینے ندید

آتشِ او شعلہ گیرد بہ بر
از نفس ہائے نخستینِ سحر

آسماں ز آغوشِ خود نگذاردش
کوکبِ واماندہ پنداردش

بوسدش اوّل شعاعِ آفتاب
شبنم از چشمش بشوید گردِ خواب

رشتۂ با لَمْ یَکُنْ باید قوی
تا تو در اقوامِ بے ہمتا شوی

آنکہ ذاتش واحد است و لاشریک
بندہ اش ہم در نسازد با شریک

مومنِ بالائے ہر بالاترے
غیرتِ او بر نتابد ہمسرے

خرقۂ لَا تَحْزَنُوْا اندر برش (۱)
اَنْتُمُ الْاَعْلَوْن تاجے بر سرش

می کشد بارِ دو عالم دوشِ او
بحر و بر پروردۂ آغوشِ او

بر غوِ تندر مدام افگندہ گوش (۲)
برق اگر ریزد ہمی گیرد بدوش

پیشِ باطل تیغ و پیشِ حق سپر
امر و نہی او عیارِ خیر و شر

---

(۱) وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ الخ (آیہ شریفہ)

(۲) غوِ تندر: بجلی کی کڑک ۱۲۔

در گرہ صد شعلہ دارد اخگرش
زندگی گیرد کمال از جوہرش

در فضائے ایں جہانِ ہائے و ہو
نغمہ پیدا نیست جز تکبیرِ او

عفو و عدل و بذل و احسانش عظیم
ہم بقہر اندر مزاجِ او کریم

سازِ او در بزم ہا خاطر نواز
سوزِ او در رزم ہا آہن گداز

در گلستاں با عنادل ہم صفیر
در بیاباں جرّہ بازِ صید گیر

زیرِ گردوں می نیاساید دلش
بر فلک گیرد قرار آب و گلش

طائرش منقار بر اختر زند
آں سوئے ایں کہنہ چنبر پر زند

تو بہ پروازے پرے نکشودۂ
کرمکِ استی زیرِ خاک آسودۂ

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ

تا کجا در خاک می گیری وطن
رخت بردار و سرِ گردوں فگن

(صفتِ رابع)

اِس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ کائنات میں کوئی ہستی ایسی نہیں ہے جو اِس کے ساتھ برابری کا دعویٰ کر سکے۔ اِس کی اصلی وجہ یہ ہے جو میں سب سے پہلے بیان کر چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے اور ساری کائنات ممکن الوجود ہے۔ اندریں حالات، برابری کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ جب ساری کائنات میں کوئی اس کے جوڑ کا نہیں ہے تو کوئی برابری کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہے؟

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ اللہ تعالیٰ قدیم ہے اور ساری کائنات حادث ہے، تو حادث ہستی (کائنات) قدیم (اللہ) کی مدِ مقابل کیسے ہو سکتی ہے؟ کہاں حادث، کہاں قدیم؟ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک؟

واضح ہو کہ حدوثِ عالم کا عقیدہ اسلام کا سنگِ بنیاد ہے، چنانچہ علم العقاید کی مشہور کتاب "عقایدِ عضدیہ" جس کی شرح ملا جمال الدین المعروف بہ محققِ دوانی نے کی ہے، اس فقرہ سے شروع ہوتی ہے:-

"اجمع السلف الصالحون من المحدثین وایمۃ المسلمین واھل السنۃ والجماعۃ علی ان العالم حادث۔"

یعنی تمام سلفِ صالحین، بزرگانِ دین، فقہاء اور محدثین اور علمائے اہلِ سنت والجماعت اس بات پر متفق ہیں کہ بلا شبہ عالم حادث ہے۔

نوٹ:- فلاسفہ اللہ تعالیٰ کو واجب اور کائنات کو ممکن کہتے ہیں، متکلمین اللہ تعالیٰ کو قدیم اور کائنات کو حادث کہتے ہیں۔

جو لوگ مثلاً پیروانِ ہندو دھرم یا حکمائے یونان، اللہ تعالیٰ کے ساتھ، رُوح اور مادّہ کو بھی قدیم تسلیم کرتے ہیں۔ وہ یہ بات نہیں کہہ سکتے۔ یعنی اُن کے مذہب کی رُو سے رُوح اور مادّہ خدا کے ساتھ برابری کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

نیز جو لوگ تجسم یا حلول کے قائل ہیں، وہ بھی شرک میں گرفتار ہیں کیونکہ اُن کے عقیدہ کی رُو سے کرشن اور عیسیٰؑ دونوں خدا تعالیٰ کے ہمسر ہیں بلکہ ایک اعتبار سے خود خدا ہیں۔ جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

اَب رہے مجوسی، تو وہ بھی دو خداؤں کو مانتے ہیں۔ یزداں اور اہرمن۔

اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دُنیا میں صرف قرآنِ حکیم ہی ایسی کتاب ہے جس نے توحیدِ الٰہی کو ازسرِ نَو دُنیا میں قائم کیا اور شرک کی تمام ممکن صورتوں کا ابطال کر دیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے

(۱) مُنکرِ وجودِ باری تعالیٰ کا ابطال لفظِ "ھُو" سے کیا ہے۔ یہ لفظ ذات پر دلالت کرتا ہے یعنی وہ ہستی جسے قرآن اللہ سے تعبیر کرتا ہے، فی الحقیقت موجود ہے۔ اس کا وجود مستقل ہے اور خارجی ہے، وہمی یا خیالی نہیں ہے۔

(۲) مُنکرِ وجوبِ ذاتِ باری کا ابطال لفظِ "اللہ" سے کیا ہے۔ کیونکہ اللہ کا لفظ قرآن میں صرف اُسی ہستی پر بولا گیا ہے جو "رب العالمین" یعنی ساری کائنات کا خالق، رازق، منتظم، مالک اور ہر شئے کو مرتبۂ کمال تک پہنچانے والا ہے اس سے ثابت ہوا کہ ساری کائنات مخلوق ہے۔ یعنی ممکن الوجود ہے۔ اللہ تعالیٰ قدیم ہے، ازلی ہے یعنی واجب الوجود ہے۔ اللہ کا لفظ قرآن میں کسی غیر اللہ پر نہیں بولا گیا۔ یہی مطلب ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا، یعنی اللہ کے سوا ساری کائنات میں اور کوئی اِلٰہ (معبود، مقصود، مؤثر فی الوجود اور حقیقی معنیٰ میں موجود) نہیں ہے۔

(۳) مُنکرِ توحید کا ابطال لفظِ "احد" سے کیا ہے یعنی اللہ ایسا ایک ہے کہ اُس جیسا دُوسرا نہیں ہے۔ یعنی یکتا اور عدیم المثال ہے اُس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

(۴) مُشرک فی الصفات، مُشرک فی العبادۃ، مُشرک فی الاستعانۃ اور مُشرک فی الحکم۔ ان چاروں گروہوں کا ابطال لفظ "صمد" سے کیا ہے۔

(۵) معتقدِ ابنیت (اللہ کے بیٹا یا بیٹی ہے) کا ابطال "لَمْ یَلِدْ" سے کیا ہے۔

(۶) معتقدِ الوہیت در بشر (فلاں شخص اوتار ہے) کا ابطال لَمْ یُوْلَدْ سے کیا ہے۔

(۷) معتقدِ مماثلت (فلاں شخص یا ہستی بھی خدا ہے یا اس کی ہمسر ہے) کا ابطال وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ سے کیا ہے۔

اب ناظرین خوب غور کر کے دیکھ لیں، انکار یا شرک کی یہی وہ صورتیں ہیں، جو نزولِ قرآن کے وقت دُنیا میں پائی جاتی تھیں۔ کتاب اللہ کا یہ اعجاز غور طلب ہے کہ دو سطروں میں سارے جہان کے عقائدِ باطلہ کا رد کر دیا ہے۔

نوٹ:۔ بخوفِ طوالت میں نے بہت اجمال سے کام لیا ہے۔ تفصیل کے شائقین، حضرت علامۂ دوراں امام ابنِ تیمیہؒ کی تفسیر سورۂ اخلاص کا مطالعہ کریں ۱۲۔

اس مختصر تمہید کے بعد مطلب بیان کرتا ہوں۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے اس بات پر غور کرو کہ مسلمان کی تعریف کیا ہے؟ جواب دیتے ہیں کہ مسلمان وہ ہے جس نے دنیا سے اپنی آنکھیں بند کر لی ہوں۔ یعنی اس کا مقصودِ حیات اللہ ہو نہ کہ دُنیا۔ بیشک وہ دُنیا میں رہتا ہے لیکن دُنیا سے دل نہیں لگاتا۔ اس کے بعد یہ سوال کرتے ہیں کہ اس کی

فطرت کیا ہے؟ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کو اپنے دل میں بسالے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے مسلمان کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لئے یعنی اس کے نام کو سربلند کرنے کے لئے دُنیا میں جیئے۔ نہ کہ اپنے لئے یا جورو بچوں کے لئے یا دولت اور عہدے کے لئے۔

اب اِن دونوں باتوں کی تفصیل بیان کرتے ہیں کہ مُسلمان تو اُس گُلِ لالہ کی مانند ہے۔ جو پہاڑ کی چوٹی پر اُگ رہا ہو، جس تک گلچیں کا ہاتھ نہ پہنچ سکے، (جسے کوئی اپنا غلام نہ بنا سکے) اس کا تعلق، انسانوں سے نہیں ہوتا۔ یعنی لالۂ کوہستانی کسی مالی کا محتاج نہیں ہوتا۔ اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

ع کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنابندی

(۱) نسیمِ سحر کے فیض سے اس کا رنگ نکھر جاتا ہے۔
(۲) شعاعِ آفتاب اسے تر و تازہ کئے رہتی ہے۔
(۳) شبنم اُس کی دلکشی میں اضافہ کرتی ہے۔

پس اے مسلمان! اگر تُو ان صفات سے متّصف ہونا چاہتا ہے تو "لَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ" سے اپنا رشتہ استوار کرلے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کائنات میں بے مثال ہے اسی طرح تو بھی اقوامِ عالم میں "بے ہمتا" (عدیم المثال) ہوجائے گا۔

مُسلمان جس اللہ کی پرستش کرتا ہے وہ واحد لاشریک ہے اس لئے اس کو چاہیئے کہ وہ بھی اپنے اندر ایسی شانِ یکتائی پیدا کرے کہ کوئی قوم اس کی

برابری کا دعویٰ نہ کر سکے۔ مومن کی غیرت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کا بھی کوئی ہمسر نہ ہو۔ (یہاں مومن سے پوری قوم مراد ہے) یعنی ملتِ اسلامیہ کا فرض یہ ہے کہ وہ تمام ملل (قوموں) پر غالب آجائے۔ چنانچہ حسبِ ذیل آیت شریفہ اس پر دلالت کرتی ہے:۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

(۳ : ۱۹۳)

اور اے مسلمانو! نہ تو ہمت ہارو اور نہ (گذشتہ واقعات پر) رنج کرو۔ (اور یقین رکھو کہ تم ہی سب پر غالب رہو گے۔ اگر تم، حقیقی معنی میں) مومن ہو۔

اس کے بعد اقبال حقیقی مومن کی شان بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مومن کی زندگی کا مقصد یہ ہے، یا مومن اس لئے پیدا ہوا ہے کہ

(۱) وہ ساری دنیا پر حکومت کرے تاکہ ساری دنیا حکومتِ الٰہیہ کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہو سکے۔

(۲) ہمیشہ جہاد فی سبیل اللہ میں مشغول رہے۔

(۳) ہمیشہ باطل کا مقابلہ کرے اور حق کی حمایت کرے۔

(۴) دنیا کو خیر و شر کا معیار عطا کرے، بایں طور کہ اچھائی یا نیکی وہ ہے جس کے کرنے کا مومن حکم دے، اور برائی یا بدی وہ ہے جس سے وہ باز رہنے کا حکم دے۔

(۵) اس کی ذات سے زندگی مرتبہ کمال تک پہنچ سکے۔ یعنی مومن کی زندگی مظہر کمالاتِ انسانی ہوتی ہے۔

(۶) وہ فضائے عالم کو نعرۂ تکبیر سے معمور کر دے۔ یعنی دنیا کے ہر گوشہ میں توحیدِ الٰہی کی اشاعت کرے۔

(۷) وہ دنیا والوں کو عفو، عدل، جود و سخا، اور احسان کی نعمتوں سے روشناس کرے اور ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کرے کہ اس کے قہر میں بھی کرم کی شان نمایاں ہو۔ یعنی وہ اپنی ذات کے لئے کسی سے انتقام نہ لے۔ مثلاً جب رچرڈ شاہِ انگلستان میدانِ جنگ میں علیل ہو گیا تو سلطان صلاح الدین ایوبی نے اس کی دشمنی سے قطع نظر کر کے، اپنے اطباء کو اس کے معالجہ کے لئے بھیجا تھا۔

(۸) دوستوں کی محفل میں دوستوں کو اپنی مہربانی (ساز) سے مسرور کر دے اور میدانِ جنگ میں اس کا جوشِ جہاد (سوز) لوہے کو پگھلا دے۔ یعنی دشمنوں کا پتّہ پانی کر دے۔

(۹) اگر باغ میں جائے تو بلبلیں اس کی ہم صفیر (دوست) بن جائیں، اور صحرا میں جائے تو شاہین کی طرح اپنے شکار پر ٹوٹ پڑے۔ یعنی دوستوں کی مجلس میں دلنوازی اور دشمنوں کے مقابلہ میں شجاعت کا مظاہرہ کرے۔

(۱۰) دنیا اور لذّاتِ دنیوی کو اپنا مطمحِ نظر نہ بنائے، بلکہ روحانیت میں ترقی کرتا رہے۔ اور ہر حال میں اللہ کی خوشنودی کو مدِّ نظر رکھے۔

مومن کی صفت بیان کرنے کے بعد اقبال موجودہ دور کے مسلمان سے یہ کہتے ہیں کہ اگر تو ان صفات سے محروم ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ:۔

(۱) تو نے فتوحات (پرواز) کے لئے اپنے آپ کو آمادہ ہی نہیں کیا۔ برعکس

ایں تونے اپنی غفلت سے اپنی ہستی کو فنا کر دیا۔ اسی لئے تُو حشرات الارض (کرمک) کی طرح زیرِ خاک آسودہ ہو گیا۔ یعنی ذلیل و خوار ہو گیا۔

(۲) تیری اس ذلت اور خواری کا سبب یہ ہے کہ تُو نے قرآنِ حکیم سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا۔ یعنی ذکرِ الٰہی سے غافل ہو گیا۔ اور قانونِ الٰہی یہ ہے کہ:۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۲۰ : ۱۲۴)

اور جو شخص میری یاد سے غافل ہو جائے گا یعنی احکامِ قرآنی سے رُوگردانی اختیار کر لے گا تو اس کی زندگی اس کے لئے وبال (تنگ) ہو جائے گی۔ یعنی وہ اطمینانِ قلب سے محروم ہو جائے گا۔ اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا کر کے اُٹھائیں گے۔ یعنی وہ مرنے کے بعد جب دوبارہ زندہ ہو گا تو کسی قسم کی رُوحانی ترقی نہیں کر سکے گا۔

اے مسلمان چونکہ تُو نے قرآن کو ترک کر دیا اس لئے تُو آفات و مصائب میں مبتلا ہے اور اسی لئے گردشِ دوراں (تقدیر) کی شکایت کر رہا ہے۔

لیکن مایوس مت ہو۔ تیرے پاس قرآن حکیم (زندہ کتاب) موجود ہے۔ اگر تو اس کتاب کو اپنا رہنما بنا لے تو تُو دوبارہ اس دُنیا میں سربلند ہو سکتا ہے۔

عرضِ حالِ مصنّف بحضور رحمۃ للعالمین

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی
جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی

اے زمیں از بارگاہت ارجمند
آسماں از بوسۂ بامت بلند

شش جہت روشن ز تابِ روئے تو
ترک و تاجیک و عرب ہندوئے تو

از تو بالا پایۂ ایں کائنات
فقرِ تو سرمایۂ ایں کائنات

در جہاں شمعِ حیات افروختی
بندگاں را خواجگی آموختی

بے تو از نابود مندیہا خجل
پیکرانِ ایں سرائے آب و گل

تا دمِ تو آتشے از گل گشود
تودہ ہائے خاک را آدم نمود

ذرہ دامن گیرِ مہر و ماہ شد
یعنی از نیروئے خویش آگاہ شد

تا مرا افتاد بر رویت نظر
از اب و ام گشتۂ محبوب تر

عشق در من آتشے افروخت است
فرصتش بادا کہ جانم سوخت است

نالۂ مانندِ نے سامانِ من
آں چراغِ خانۂ ویرانِ من

از غمِ پنہاں نگفتن مشکل است
بادہ در مینا نہفتن مشکل است

مسلم از سرِّ نبی بیگانہ شد
باز ایں بیت الحرم بتخانہ شد

از منات و لات و عزّیٰ و ہبل
ہر یکے دارد بتے اندر بغل

شیخِ ما از برہمن کافر تر است
زانکہ او را سومنات اندر سر است

رختِ ہستی از عرب برچیدۂ
در خمستانِ عجم خوابیدۂ

شل ز برق‌ابِ عجم اعضائے او — سرد تر از اشکِ او صہبائے او
ہمچو کافر از اجل ترسندۂ — سینہ اش فارغ ز قلبِ زندۂ
نعشش از پیشِ طبیبان بردہ ام — در حضورِ مصطفیٰؐ آوردہ ام
مردہ بود از آبِ حیواں گفتمش — سِرّے از اسرارِ قرآں گفتمش
داستانے گفتم از یارانِ نجد — نکہتے آوردم از بستانِ نجد
محفل از شمعِ نوا افروختم — قوم را رمزِ حیات آموختم
گفت بر ما بندد افسونِ فرنگ (۱) — ہست غوغائش ز قانونِ فرنگ
اے بصیری را ردا بخشندۂ (۲) — بربطِ سلمیٰ مرا بخشندۂ
ذوقِ حق دہ ایں خطا اندیش را — اینکہ نشناسد متاعِ خویش را
گر دلم آئینۂ بے جوہر است — ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
اے فروغت صبحِ اعصار و دہور — چشمِ تو بینندۂ ما فی الصدور
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن — ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
تنگ کن رختِ حیات اندر برم — اہلِ ملت را نگہدار از شرم
سبز کشتِ نابسامانم مکن — بہرہ گیر از ابرِ نیسانم مکن

---

(۱) قانون: ایک قسم کا ساز ۱۲۔

(۲) بصیری: مصنّف قصیدۂ بردہ جس نے عالمِ رویا میں نبی کریمؐ کو اپنا مشہور قصیدہ (امن تذکر جیرانِ بذی سلم الخ) سنایا۔ حضورؐ نے اس کے صلے میں خوش نصیب بصیری کو اپنی چادرِ مطہر عطا فرمائی ۱۲۔

خشک گرداں بادہ در انگورِ من / زہر ریز اندر مے کافورِ من
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا / بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا
گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام / با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
اے کہ از احسانِ تو ناکس کس است / یک دعایت مزدِ گفتارم بس است
عرض کن پیشِ خدائے عزّ و جل / عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل
دولتِ جانِ حزیں بخشندۂ / بہرۂ از علمِ دیں بخشندۂ

در عمل پائندہ تر گرداں مرا
آبِ نیسانم گہر گرداں مرا

رختِ جاں تا در جہاں آوردہ ام / آرزوئے دیگرے پروردہ ام
ہمچو دل در سینہ ام آسودہ است / محرم از صبحِ حیاتم بودہ است
از پدر تا نامِ تو آموختم / آتشِ ایں آرزو افروختم
تا فلکِ دیرینہ تر سازد مرا / در قمارِ زندگی بازد مرا
آرزوئے من جواں تر می شود / ایں کہن صہبا گراں تر می شود
ایں تمنا زیرِ خاکم گوہر است / در شبم تابِ ہمیں یک اختر است
مدّتے با لالہ رویاں ساختم / عشق با مرغولہ مویاں باختم
بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم / بر چراغِ عافیت داماں زدم
برقہا رقصید گردِ حاصلم / رہزناں بُردند کالائے دلم
ایں شراب از شیشۂ جانم نہ ریخت / ایں زرِ سارا ز دامانم نہ ریخت (۱)

---

(۱) سارا: خالص ۱۲۔

عقلِ آذر پیشہ ام زنّار بست — نقشِ او در کشورِ جانم نشست
سالہا بودم گرفتارِ شکے — از دماغِ خشکِ من لاینفکے
حرفے از علم الیقیں ناخواندهٔ — در گمان آبادِ حکمت ماندهٔ
ظلمتم از تابِ حق بیگانہ بود — شامم از نورِ شفق بیگانہ بود
ایں تمنا در دلم خوابیدہ ماند — در صدف مثلِ گہر پوشیدہ ماند
آخر از پیمانهٔ چشمم چکید — در ضمیرِ من نواہا آفرید
اے زیادِ غیرِ تو جانم تہی — بر لبش آرم اگر فرماں دہی
زندگی را از عمل ساماں نبود — پس مرا ایں آرزو شایاں نبود
شرم از اظہارِ او آید مرا — شفقتِ تو جرأت افزاید مرا
ہست شانِ رحمتِ گیتی نواز — آرزو دارم کہ میرم در حجاز
مسلمے از ماسوا بیگانهٔ — تا کجا زنّاریِ بتخانهٔ
حیف چوں او را سرآید روزگار — پیکرش را دیر گیرد در کنار
از درت خیزد اگر اجزائے من — وائے امروزم خوشا فردائے من
فرخا شہرے کہ تو بودی دراں — اے خنک خاکے کہ آسودی دراں
"مسکنِ یار است و شہرِ شاہِ من — پیشِ عاشق ایں بود حبّ الوطن"
کوکبم را دیدهٔ بیدار بخش — مرقدے در سایهٔ دیوار بخش
تا بیاساید دلِ بیتابِ من — بستگی پیدا کند سیمابِ من
با فلک گویم کہ آرامم نگر
دیدهٔ آغازم انجامم نگر

(فصل بست وچہارم)

خاتمۃ الکتاب

تمہید:۔ اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کے پردہ میں قوم کو بلکہ بنی آدم کو قرآنِ حکیم کے پیغام سے روشناس کرنے کے بعد، اقبال نے اپنے آقا اور مولیٰ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ عالیہ میں اپنا حالِ دل بیان کیا ہے۔ اس عرضِ حال کا ہر لفظ سوز وگداز میں ڈوبا ہوا ہے اور ہر فقرہ سے خلوص کی بو آتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ اقبال کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کس درجہ محبت تھی۔

اس فصل میں دو بند ہیں۔ پہلے بند کا خلاصہ یہ ہے کہ

(۱) شروع میں نعتِ رسولؐ لکھی ہے۔

(۲) اس کے بعد مسلمانوں کی حالتِ زار بیان کی ہے۔

(۳) اپنی خدمات کا تذکرہ کیا ہے کہ میں نے ان کو قرآنِ حکیم کا پیغام سنایا ہے، لیکن وہ یہ سمجھتے ہیں کہ "برما افسونِ فرنگ ای بندد"

(۴) یہاں سے عرضِ حال شروع ہوتا ہے کہ اگر میں نے ان کو غیر اسلامی تعلیم دی ہے تو آپ قیامت کے دن

"بے نصیب از بوسۂ پاکن مرا"

(۵) لیکن اگر میں نے مسلمانوں کو آپؐ ہی کا پیغام سنایا ہے تو میرے حق میں دعا فرمائیے کہ میں سچے مسلمان کی سی زندگی بسر کروں۔

دوسرے بند میں اس آرزو کا اظہار کیا ہے جو بچپن سے ان کے دل میں پرورش پا رہی تھی۔ اور آخر وقت تک برقرار رہی۔ چونکہ مشیتِ ایزدی نہ تھی اس لئے پوری تو نہ ہو سکی لیکن اس آرزو سے ہر شخص کو یہ ضرور اندازہ ہو سکتا ہے کہ اقبالؔ بھی سرکارِ ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشقوں میں سے تھے۔

انہوں نے اس آرزو کا اظہار ۱۹۱۸ء میں کیا تھا اور جن لوگوں کو اُن کے پاس بیٹھنے کی عزت حاصل ہوئی وہ گواہی دے سکتے ہیں کہ تادمِ زیست یہ آرزو اُن کے دل میں چٹکیاں لیتی رہی۔

یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو بارہ بجے دن کے قریب میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ کوٹھی کے صحن میں چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے اور ایک شخص ان کے جسم پر مالش کر رہا تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا کہ ان کا ورزشی جسم بالکل گھل چکا تھا۔ اسی اثناء میں ایک صاحب ملنے آئے اور انہوں نے کہا کہ میں حج کو جا رہا ہوں آپ میرے لئے دعا کریں کہ میرا حج قبول ہو جائے۔ یہ سُن کر ان کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ جب اشکوں کے چھینٹوں سے آتشِ دل قدرے فرو ہو گئی تو کہنے لگے "آپ بھی میرے لئے دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے حبیبِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ کی زیارت نصیب کرے۔ پھر کچھ وقفہ کے بعد کہنے لگے کہ اگرچہ اب مجھے زندگی کی اُمید باقی نہیں رہی ہے لیکن اللہ تعالیٰ میں

بڑی قدرت ہے، اگر اس نے مجھے صحت عطا فرما دی تو پہلا کام یہی کروں گا کہ حج کو جاؤں گا۔

ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

پہلا بند:۔ کہتے ہیں کہ آپؐ کے اس دُنیا میں تشریف لانے (ظہور) سے زندگی، طفولیت کی منزل سے نکل کر، بلوغت کے دَور میں داخل ہوگئی۔ مطلب یہ ہے کہ

ع زادانِ او مرگِ دنیائے کہن

یعنی آپؐ کے ظہور سے پہلے انسانوں کی ذہنی حالت ایسی تھی جیسی ایک ناسمجھ بچہ کی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باایں ہمہ ادعائے فلسفہ وحکمت ساری دُنیا شرک، ستارہ پرستی، اوہام پرستی اور تعصبِ نسلی وقومی ولسانی میں گرفتار تھی۔ مثلاً سقراط جیسے یگانۂ روزگار حکیم نے بھی مرتے وقت اپنے شاگرد افلاطون کو یہ وصیت کی تھی کہ میں نے اپالو دیوتا کی خدمت میں ایک مُرغ کی منّت مانی تھی اس لئے تم مندر میں جاکر ایک مُرغ ضرور چڑھا دینا۔

لیکن آپؐ نے بنی آدم کو کفر و شرک، عناصر پرستی، کواکب پرستی، اوہام پرستی، وطن پرستی، نسل پرستی، حیوان پرستی، غرض کہ تمام نجاستوں سے پاک کر دیا۔ اور ان کو ایسا دستور العمل عطا کیا جس نے انہیں زندگی کے ہر شعبہ میں عقل وخرد سے کام لینا سکھا دیا۔ جس نے ساری دنیا کو صلائے عام دی کہ ھَاتُوْا بُرْھَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ یعنی اگر تم سچے ہو تو دلیل لاؤ۔ نزولِ قرآن سے پہلے سچائی کا معیار یہ تھا کہ ہم نے اپنے بزرگوں سے اسی طرح سُنا ہے یا اُنہیں

اسی طرح کرتے دیکھا ہے۔ لیکن قرآن مجید نے انسانوں کو یہ تعلیم دی کہ جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کی پیروی مت کرو۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ط (۱۷: ۳۶)

اور جس بات کی تجھ کو تحقیق نہ ہو اس پر عمل درآمد مت کیا کر۔

قرآنِ حکیم دُنیا میں پہلی اور آخری آسمانی کتاب ہے جس نے انسانوں کو تحقیقِ حق کی دعوت دی اور یہ تلقین کی کہ دلیل کے بغیر کسی کی بات مت مانو۔ بالفاظِ دگر اس زندہ کتاب نے دُنیا میں ایک نئے (یعنی عقلی) دور کا آغاز کر دیا۔ ظہورِ اسلام یعنی ظہورِ ربانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دُنیا میں مذہب کو عقل سے بالکل جداگانہ شئے تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح فقر اور شاہی (دین اور سیاست) کو جمع کر دیا، اسی طرح مذہب اور عقل کو بھی ایک دوسرے کا معاون بنا دیا۔ قرآنِ پاک کا اسلوبِ بیان ہی یہ ہے کہ وہ ہر شخص کو ہر معاملہ میں غور و فکر کی تلقین کرتا ہے۔ اور ہر مسئلہ میں عقل سے کام لینے کی ہدایت کرتا ہے۔

جی تو یہ چاہتا ہے کہ اس موضوع پر شرح و بسط سے گفتگو کی جائے تاکہ اقبالؔ کا یہ مصرع قرآنی حقائق کی روشنی میں مبرہن ہو سکے:۔

ع اے ظہورِ تو شبابِ زندگی

لیکن بخوفِ طوالت صرف ایک نکتہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں:۔

انسان کی قوتِ مدرکہ کا اظہار عموماً حسبِ ذیل صورتوں میں ہوتا ہے۔ تعقّل، تفکّر، تدبّر، تفقہ، تذکّر۔ قرآنِ حکیم کا اعجاز دیکھئے کہ اس نے

اِن تمام صورتوں پر عمل کرنے کی ہدایت کی ہے۔ بنظرِ اختصار صرف ایک ایک آیت بطورِ مثال درج کرتا ہوں:۔

(۱) اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ○ (۳۰: ۲۴)

بیشک اِن باتوں میں اللہ کی قدرت کی نشانیاں ہیں اِن لوگوں کے لیئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

(۲) وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳: ۱۹۱)

اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق کی حکمتوں میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔

(۳) اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؟ (۴: ۸۱)

پس کیا یہ منکرین، قرآن کی آیات میں تدبّر (سوچ بچار) نہیں کرتے ؟

(۴) اُنْظُرْ کَیْفَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّھُمْ یَفْقَھُوْنَ ○

آپ دیکھیں تو سہی کہ ہم کس طرح مختلف پہلوؤں سے دلائل پیش کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھ سکیں۔ (اپنی عقل سے کام لے سکیں) (۶: ۶۵)

(۵) مَا لَکُمْ کَیْفَ تَحْکُمُوْنَ ○ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ ؟ (۳۷: ۱۵۵)

تمہیں کیا ہو گیا ہے کیسے (بیہودہ) فیصلے کرتے ہو ؟ عقل سے کام کیوں نہیں لیتے ؟

میں ناظرین سے دریافت کرتا ہوں، کیا قرآن حکیم کے علاوہ دُنیا کی کسی مذہبی کتاب نے اس تفصیل کے ساتھ انسانی عقل سے اپیل کی ہے ؟ اسی لیئے اقبال نے یہ کہا کہ:۔

؎ اے ظہورِ تو شبابِ زندگی

یعنی آپؐ نے انسانوں کو توہم پرستی، کورانہ تقلید، ذہنی جمود اور جہالت کی تاریکی سے نکال کر علم اور عقل کی دُنیا میں داخل کر دیا۔ اسی لیے اقبالؒ نے ایک جگہ یہ لکھا ہے کہ آپؐ نے نئی دنیا پیدا کر دی۔

اس شعر کا دوسرا مصرع اسی پہلے مصرع کی تشریح ہے کہ آپؐ کی جلوہ فرمائی (بعثت) دوسرے لفظوں میں زندگی کے خواب کی تعبیر ہے یعنی آپؐ کی وساطت سے زندگی اپنی مراد کو پہنچ گئی۔ آسان لفظوں میں یوں سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں زندگی پیدا ہی اس لیے کی تھی کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں اور بنی آدم (حاملانِ زندگی) کو غایتِ تخلیق (مقصدِ حیات) سے ہم آغوش فرما دیں۔

پہلے مصرع میں "ظہورِ تو" سے ذاتِ نبویؐ مراد ہے، اور دوسرے مصرع میں "جلوہ ات" سے بعثتِ نبویؐ مراد ہے۔

پہلے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ نے بنی آدم کو عقل سے کام لینا سکھایا یعنی وہ دین پیش کیا جو سراپا معقول ہے۔

۲ الاسلام ھو الفطرۃ و الفطرۃ ھو الاسلام۔

دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ جب بنی آدم نے آپؐ کی رہنمائی میں اس دینِ حق پر عمل کیا تو وہ انسانیت (زندگی) کے مرتبۂ اعلیٰ پر فائز ہو گئے۔

اگر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نہ ہوتی تو انسانیت (زندگی) آج بھی اسی طرح ظنیات اور قیاسات اور اوہامِ باطلہ بلکہ حماقت میں گرفتار ہوتی۔

جس طرح اتھروید کے زمانہ میں تھی لے۔

(۲) آپؐ کی بارگاہ کی بدولت اس زمین کو عزت حاصل ہوگئی اور آپؐ
(۳) کے وجود سے یہ کائنات منور ہوگئی۔ ترک، تاجیک (یہ بھی ترکوں کا ایک قبیلہ ہے) عرب اور ہندی سب آپؐ کے غلام ہیں۔
(۴) آپؐ کی بعثت سے اس دنیا کا مرتبہ بلند ہوگیا اور حق یہ ہے کہ آپؐ کی شانِ فقر اس کائنات کی سب سے بڑی دولت ہے۔ ایسی دولت جس پر وہ ناز کرسکتی ہے۔

یہ فقر کیا چیز ہے؟ اس کی خصوصیات کیا ہیں؟ کیسے پیدا ہوتا ہے؟ اور صاحبِ فقر کا مقام کیا ہے؟ دینِ اسلام میں، اس کی منزلت کیا ہے؟ ان سوالات کے جواب میں ایک مستقل کتاب درکار ہے۔ اس شرح میں اس کی تفصیل ناممکن ہے۔ اقبال نے اس لفظ کو اگرچہ پیام مشرق اور زبورِ عجم میں بھی استعمال کیا ہے لیکن اس کی تشریح سب سے پہلی دفعہ جاوید نامہ میں کی ہے۔ جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔

فقرِ قرآن ، اختلافِ ذکر و فکر
فکر را کامل ندیدم جز بہ ذکر

لے مثلاً پوری سے لے کر دوارکا تک سارا ہندوستان، لنگ پرستی کی لعنت میں گرفتار تھا۔ یہ مسلمانوں ہی کے دم قدم کی برکت تھی کہ اس ملک کے باشندوں نے اعضائے تناسل کی پرستش سے بڑی حد تک نجات حاصل کرلی ۱۲۔

اس کے بعد انہوں نے مسافر (سنہ ۱۹۳۳ء) بال جبریل (سنہ ۱۹۳۵ء) ضربِ کلیم (سنہ ۱۹۳۶ء) پس چہ باید کرد (سنہ ۱۹۳۷ء) اور ارمغانِ حجاز (سنہ ۱۹۳۸ء) یعنی اپنی ہر تصنیف میں فقر کی وضاحت کی ہے۔ اس کے معنی یہ نکلے کہ اقبال نے اپنی زندگی کے آخری آٹھ سال جو قیمت کے لحاظ سے ان کی ساری زندگی کا ماحصل تھے، اسی ایک لفظ کی تشریح کی نظر کر دیئے تو راقم الحروف چند صفحات میں فقر کا مفہوم کیسے واضح کر سکتا ہے؟ اس لئے صرف ایک شعر لکھنے پر اکتفا کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

فقر، مومن چیست؟ تسخیرِ جہات
بندہ از تاثیرِ او مولیٰ صفات

اقبال کو بخوبی احساس تھا کہ مسلمان علی العموم اس اصطلاح کے مفہوم سے بیگانہ ہیں۔ اس لئے انہوں نے جاوید نامہ سے لے کر ارمغانِ حجاز تک ہر کتاب میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ اس شعر میں وہ کہتے ہیں کہ فقر اس طاقت کا نام ہے جس کی بدولت ایک مومن اس کائنات کو مسخر کر سکتا ہے۔ یعنی زمان و مکان پر حکمران ہو سکتا ہے۔ اور چونکہ یہ صفت اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے اس لئے ہم دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس فقر کی بدولت انسان میں خدائی صفات کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اس کائنات میں صفاتِ ایزدی کے سب سے بڑے مظہر ہیں۔ یعنی شانِ فقر آپؐ کی ذات میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ آپ کے واسطہ اور وسیلہ کے بغیر کوئی مومن در مولی

صفات، نہیں بن سکتا، یعنی خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔ اسی لئے اقبال نے یہ کہا کہ

؎ فقرِ تو سرمایۂ ایں کائنات

بشر کا تو مقدور ہی کیا ہے، بڑے سے بڑا نبی یا رسول بھی آپؐ کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ وَلِلّٰہِ دَرُّ ہُ مَنْ قَالَ:-

بمقامیکہ رسیدی نہ رسد ہیچ نبی

(۵) آپؐ نے بنی آدم کو حقیقی زندگی عطا فرمائی۔ دوسرا مصرع اس کی تشریح ہے۔ یعنی آپؐ نے بنی آدم کو انسانوں کی غلامی سے آزاد فرما دیا۔ بلکہ جو غلام (بت پرست) تھے انہیں حکمرانی (خواجگی) سکھا دی (حریت کی تشریح سابقہ اوراق میں ہو چکی ہے۔)

(۶) اگر آپؐ نہ ہوتے تو بلاشبہ بنی آدم اپنی کمزوریوں کی بنا پر شرم کے مارے اپنا سر اونچا نہیں کر سکتے تھے۔

(۷) آپؐ نے مُردوں کو زندہ کر دیا۔ اور حیوانوں کو انسان بنا دیا۔ یعنی مُشرکوں کو موحد بنا دیا۔ اور بدکاروں کو نکوکاری کے مقام پر پہنچا دیا۔

(۸) ادنیٰ درجہ کے لوگ (بلالؓ، سلمانؓ) آپؐ کے فیض کی بدولت انتہائی معزز (مہر و ماہ) اور محترم بن گئے۔

(۹) اے میرے آقا! جب سے میں نے آپؐ کو دیکھا ہے (جب سے آپؐ کی سیرت سے آگاہ ہوا ہوں) آپؐ میری نظروں میں والدین سے بھی زیادہ محبوب بن گئے ہیں۔ میرے آقا میں آپؐ سے اپنا دردِ دل کیسے چھپا سکتا

ہوں۔ اور یہ بھی ہے کہ آپؐ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں؟

حضورؐ! مسلمان قوم آپؐ کی تعلیم سے بالکل بیگانہ ہو چکی ہے۔ چنانچہ ان کے دل (بیت الحرام) میں آپؐ کی محبت کے بجائے اقتدار کی ہوس جاگزین ہو گئی ہے۔ ہر شخص یعنی ہر مسلمان کسی نہ کسی بت کی پرستش کر رہا ہے۔ کوئی عہدوں کا دیوانہ ہے کوئی جاگیر کا پروانہ ہے۔ کسی کی نظر میں دولت معبود ہے اور کوئی عورت کے سامنے سر بسجود ہے۔

ہمارے مذہبی پیشوا برہمنوں سے بڑھ کر بُت پرست ہیں کیونکہ برہمن تو اس بُت کی پوجا کرتے ہیں جو مندر میں براجمان ہوتا ہے لیکن ان حضرات کا دماغ مجسّم بت خانہ بنا ہوا ہے۔

مسلمانوں نے عرب یعنی اسلام سے اپنا تعلق منقطع کر لیا ہے اور غیر اسلامی زندگی اختیار کر لی ہے۔ چنانچہ عجمی تصوّرات نے اِن کے قوائے عملی کو بالکل مفلوج کر دیا ہے۔

حضورؐ! سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کا مسلمان، کافروں کی طرح موت سے ڈرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب اس کے سینہ میں دل نہیں ہے بلکہ محض گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔

جب دل مر گیا تو مسلمان بھی مر گیا۔ بعض تیمار دار اس کی نعش اطباء کے پاس لے گئے تھے لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ لوگ اسے زندہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے میں اسے آپؐ کی خدمت میں لایا ہوں۔

حضورؐ! میری قوم بالکل مُردہ ہو چکی تھی میں نے اسے آبِ حیات کا پتہ

بتایا، یعنی قرآنِ حکیم کے حقائق و معارف سے آگاہ کیا تاکہ وہ دوبارہ زندہ ہو سکے۔ یعنی میری قوم نے مجھے موردِ الزام بنایا اور کہا کہ "اقبال ہمیں انگریزوں کی تقلید کا مشورہ دے رہا ہے، اس کے خیالات اسلامی نہیں ہیں بلکہ فرنگی ہیں۔"

اس لئے میں آپؐ سے عرض کرتا ہوں کہ اگر میرے خیالات (افکار) غیر اسلامی ہیں یا اِن کتابوں میں جو میں نے قوم کی اصلاح کے لئے لکھی ہیں (بجز فہم) قرآنِ حکیم کی تعلیمات کے بجائے میں نے اپنی طرف سے کچھ لکھا ہو یا دوسروں کے خیالات درج کئے ہوں تو اے میرے آقا! آپؐ تو دلوں کا بھید جانتے ہیں۔ آپؐ میرے دل کے رازوں سے واقف ہیں۔ آپؐ میرے افکار کی لغویت آشکار کر دیجئے، آپؐ مجھے تباہ و برباد کر دیجئے۔ آپؐ ملّتِ اسلامیہ کو میرے پیدا کردہ فتنہ سے محفوظ رکھئے۔ آپؐ میرے کلام (کشت) کو دُنیا سے نیست و نابود کر دیجئے۔ آپؐ مجھے اپنے رُوحانی فیض سے محروم کر دیجئے۔ آپؐ میرے دل و دماغ کی قوتوں کو فنا کر دیجئے۔ آپ مجھ سے ملکۂ شاعری کو سلب کر لیجئے بلکہ قیامت کے دن مجھے ذلیل خوار کر دیجئے اور مجھے "بوسۂ پائے مبارک" سے بے نصیب رکھئے۔

لیکن اگر میں نے ان کتابوں میں قرآنِ حکیم کے حقائق و معارف بیان کئے ہوں۔ اور اگر مسلمانوں کو اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کیا ہو تو اس خدمت کا صلہ یہ چاہتا ہوں کہ حضور میرے حق میں دُعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے عمل صالح کی توفیق عطا فرمائے۔ آپؐ نے مجھے اپنی محبت عطا فرمائی ہے۔

دینی علوم سے بہرہ ور فرمایا ہے، اُمیدوار ہوں کہ مجھے عمل کی توفیق بھی ارزانی فرمائی جائے گی۔

دوسرا بندہ:۔ میرے آقا! جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ اس وقت سے میرے دل میں ایک آرزو مخفی طور سے پرورش پا رہی ہے۔ یہ آرزو میرے ساتھ ساتھ جوان ہو رہی ہے اور عمر کے ساتھ ساتھ اس کی شدت بھی بڑھتی جاتی ہے۔

میرے مولیٰ! اس میں شک نہیں کہ میں سیہ کار اور گنہ گار ہوں۔ میں نے مدتوں عشقِ مجازی کے صحرا کی خاک بھی چھانی ہے۔ اور گناہوں کی زندگی بھی بسر کی ہے۔ لیکن یہ آرزو میرے دل میں برابر موجود رہی ہے۔

میرے آقا! میں نے مدتوں تشکیک اور لاادریت کی ظلمت میں بھی اپنی عمر ضائع کی ہے اور میرے دل کا دامن فلسفہ کے کانٹوں میں بھی الجھا ہے، لیکن یہ تمنا میرے دل سے کبھی محو نہیں ہوئی۔

گو میں رہا گناہ کی دُنیا میں مدتوں
لیکن وہ آرزو میرے دل سے نہ مٹ سکی

میرے محبوبؐ! اگر آپؐ اجازت دیں تو میں اس آرزو کا آپ کی خدمت میں اظہار کروں۔ یہ سچ ہے کہ میرے اعمال تو اس لائق نہیں ہیں کہ وہ آرزو میرے دل میں جگہ پاتی۔ اور اسی لئے مجھے اس کے اظہار میں شرم محسوس ہوتی ہے۔ لیکن آپؐ کی محبت نے مجھے اس کے اظہار پر آمادہ کر دیا ہے۔

حضورؐ! آپؐ رحمتہ اللعالمین ہیں، آپؐ کی شانِ رحمت بلاشبہ گیتی نواز ہے۔ اس لیئے میں بصد ادب عرض کرتا ہوں کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے مدینہ میں موت آئے۔

ع میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں

بات یہ ہے کہ مسلمان تو ماسوی سے بیگانہ ہوتا ہے اس لیئے وہ اپنی ساری عمر کفرستان میں کیوں بسر کرے؟ کیا یہ بات افسوس ناک نہیں کہ مرنے کے بعد اس کا جسم بتخانہ (کفرستان) میں مدفون ہو؟

اس لیئے میں یہ چاہتا ہوں کہ میری مٹی مدینہ کی مٹی میں مل جائے تاکہ قیامت کے دن میں آپؐ کے دروازہ سے اٹھایا جاؤں۔

کیا ٹھکانہ ہے اس شہر کی برکت کا جہاں آپؐ آرام فرما رہے ہیں! عاشق کی نظر میں اس کا حقیقی وصل وہ شہر ہے جہاں اس کا محبوبؐ محوِ استراحت ہو، اس لیئے میں آپؐ سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے ایسا خوش نصیب بنا دیجئے کہ میری قبر آپؐ کی دیوار کے سایہ میں بنے تاکہ میری رُوح کو تسکین اور میرے دلِ بیتاب کو قرار حاصل ہو سکے اور میں دُنیا والوں سے یہ کہہ سکوں کہ تم نے میرا آغاز تو دیکھا تھا، اب میرا انجام بھی دیکھ لو!

نوٹ:۔ یہ سچ ہے کہ اقبالؔ کی یہ آرزو پوری نہیں ہوئی۔ لیکن حضورؐ کی نگاہِ کرم کے صدقے میں مرحوم کو مسجدِ عالمگیری کی دیوار کے سایہ میں جگہ ضرور مل گئی۔ اور یہ مسجد اُس مردِ مومن کی تعمیر کردہ ہے، جس نے اپنی ساری عمر

ہندوستان میں شریعتِ اسلامیہ کو دوبارہ قائم کرنے
میں بسر کر دی، اور حضورؒ ہی کی نگاہِ کرم کے صدقے میں اقبالؔ
کی یہ پیشں گوئی بھی پوری ہو گئی:۔

زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمّت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی

تمام شد